پاکستانی
ادب کے
معمار

سوبھو گیان چندانی: شخصیت اور فن

سید مظہر جمیل

پاکستانی ادب کے معمار

سوبھو گیان چندانی
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

سوبھو گیان چند انی
شخصیت اور فن

سیّد مظہر جمیل

اکادمی ادبیات پاکستان

نگران اعلیٰ : افتخار عارف
منتظم : محمد انور خان
تدوین وطباعت : سعیدہ درانی
اسکیچ : احمد حبیب
اشاعت : 2006ء
تعداد : 500
ناشر : اکادمی ادبیات پاکستان،
H-8/1، اسلام آباد
مطبع : پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس، اسلام آباد
قیمت : مجلد:-/200 روپے
پیپر بیک:-/190 روپے

ISBN:969-472-194-6

فہرست

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے 1990ء میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز تخلیق کاروں کے بارے میں ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معماران ادب کے احوال و آثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لئے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اکادمی پاکستان کی تمام زبانوں کے نامور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کر رہی ہے۔

بلاشبہ سوبھو گیان چندانی کا شمار جدید سندھی ادب کے معماران میں سرفہرست ہوتا ہے۔ ان کا قدیم و جدید ادب کے علاوہ مذہب و اخلاقیات، تاریخ و تمدن، فلسفہ و منطق، معاشیات و سیاسیات اور معلوماتِ عامہ میں غیر معمولی مطالعہ رہا ہے۔ سندھی، بنگالی، ہندی، فارسی اور اردو زبان کے کلاسیکل اور جدید ادب پر انھیں خاصی دسترس حاصل ہے۔ وہ افسانہ نگار، خاکہ نگار بھی ہیں۔

پیش نظر کتاب ''سوبھو گیان چندانی: شخصیت اور فن'' ملک کے معروف ادیب، محقق، نقاد جناب سید مظہر جمیل نے بڑی توجہ اور محنت سے تحریر کی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ ''پاکستانی ادب کے معمار'' ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

افتخار عارف

پیش لفظ

سوبھو گیان چندانی جدید سندھی ادب کے ان بنیاد گزاروں میں شامل ہیں جنھوں نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے لے کر اب تک سندھی معاشرے اور ادب میں ترقی پسند تصورات، خیالات اور رجحانات کو مقبول اور مستحکم بنانے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

عالمی شہرت یافتہ درس گاہ شانتی نکیتن میں تکمیلِ تعلیم کے دوران انھیں نوبیل انعام یافتہ بنگالی زبان کے معروف شاعر، ڈراما نگار، ناول نویس اور مفکر رابندر ناتھ ٹیگور سے بالمشافہ ملتے رہنے اور اس کے فکر وفن کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے نادر مواقع حاصل ہوئے اور ٹیگور کی خصوصی توجہ کے تحت اس کے کتب خانۂ خاص سے استفادے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ یہیں ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں شامل مختلف انقلابی رہنماؤں سے روابط قائم ہوئے اور اسی مادرِ علمی میں مختلف معاشی، سیاسی، سماجی اور علمی نظریوں بالخصوص مارکسی فلسفے اور فکریات سے آگہی حاصل ہوئی اور انسانی تہذیب کے جدلیاتی عمل کو بیسویں صدی کے عالمی تناظر کے سمجھنے مواقع بار آور ہوئے۔ بے شک شانتی نکیتن میں رہ کر سوبھو صاحب کے شعور و ادراک، علم و آگہی، جذبہ و احساس اور بصیرت و بصارت کے عملی تفاعل کے دائرے میں غیر معمولی وسعت، تنوع، گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی تھی اور اس ضمن میں انھوں نے الوداعی تقریب (۱۹۴۰ء) میں سچ ہی کہا تھا:

> ”میں اس مادرِ علمی میں ایک رومانی ذہن رکھنے والے خام کارلڑکے کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اور محض دو سال کی قلیل مدت میں ایک باشعور انقلابی نوجوان کی حیثیت سے واپس جارہا ہوں۔“

سوبھو گیان چندانی ایسے باعمل مفکر، دانشور اور رہنما ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کے پچاس ساٹھ برس مختلف سیاسی، سماجی، ادبی و ثقافتی تحریکوں کے ذریعے ایک جمہوری، ترقی پسند، روشن خیال سیکولر اور منصفانہ معاشرے کے خواب کی تعبیر تلاش کرنے میں صرف کردیئے۔ اور تمام تر نامساعد حالات اور حزیمتوں کے باوصف وہ وفاق پاکستان کے جمہوری مستقبل پہ یقین رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہماری تہذیبی تاریخ کا اگلا پڑاؤ لازمی طور پر روشن خیال اور ترقی پسند پاکستان ہوگا جس کے امکانات سے وہ بالکل مایوس نہیں ہیں۔

سوبھو گیان چندانی ابتدا ہی سے سندھی زبان و ادب میں ترقی پسند تصورات کے فروغ کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ ہر چند تخلیقی سطح پر انھوں نے بہت کم افسانے لکھے ہیں لیکن ان کے افسانوں نے سندھی افسانہ نگاری میں سوشل ریلزم کی روایت کو استحکام بخشنے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے، جس سے انکار ممکن نہیں۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ سوبھو صاحب نے عدیم الفرصتی اور متنوع دلچسپیوں سے کہیں زیادہ اپنے استغنائی مزاج کے طفیل اپنی نثری تحریروں اور منظومات سے ناقابل تلافی اغماض برتا ہے جس کے نتیجے میں اچھا خاصا نثری ذخیرہ اور شاعری کا تمام سرمایہ تلف ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود اب بھی بے شمار مضامین، مقالات، شذرات، خاکے اداریے، انٹرویوز، لیکچرز اور دیباچے مختلف رسائل و جرائد اور مخزنوں کے ملبے تلے دبے ہوئے ہیں اور محض معدودے چند افسانے، مضامین، خاکے اور کالم کتابی صورت میں مجتمع کیے جا سکے ہیں۔ حد یہ ہے کہ ان کی معرکۃ الآرا خودنوشت سوانح عمری جو سندھی کے مؤقر ادبی جریدے ''**سوجھرو**'' کراچی میں قسط وار شائع ہوئی تھی، ہنوز کتابی صورت میں منتظر اشاعت ہے!

سوبھو صاحب کی منتشر تحریروں کو یکجا کر کے شائع کروایا جائے تو کم از کم دس کتابوں کا مواد دستیاب ہو سکتا ہے۔

سوبھو صاحب کی شخصیت پر ایم فل کی سطح پر جناب انور ڈنگرائی کا تحقیقی مقالہ ''موہن جو ماٹھوں'' (موہنجو ماڑھوں) کے عنوان سے شاہ عبداللطیف یونی ورسٹی خیرپور (میرس) سے منظور ہونے کے بعد کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے جس پر جناب محمد ابراہیم جویو نے تفصیلی دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔ اب سے دس سال قبل ڈاکٹر شاہ محمد مری سوبھو گیان چندانی کی شخصیت پر ایک تاثراتی پروفائل ''موہن جو دڑو کا جوگی'' کے عنوان سے پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن، کوئٹہ کے زیر اہتمام شائع کر چکے ہیں جو اب نایاب ہے۔ مؤقر سندھی ادبی جریدہ ماہنامہ ''**سوجھرو**'' کراچی، سوبھو صاحب کی خودنوشت سوانح عمری کو پینتالیس قسطوں میں شائع کرنے کے علاوہ ان پر ایک خصوصی اشاعت (مئی ۲۰۰۲ء) بھی پیش کر چکا ہے۔

سرحد کے اُس پار یعنی ہندوستان سے جناب نارائن بھارتی سوبھو صاحب کی شخصیت اور فن پر مختلف مشاہیر کے لکھے ہوئے مضامین پر مشتمل ایک کتاب بہ عنوان ''ساویہ ساچی ـــــ سوبھو'' الھاس نگر، بھارت سے شائع کر چکے ہیں جو پاکستان میں دستیاب نہیں ہے۔

مذکورہ بالا انفرادی کوششوں کے باوجود سوبھو صاحب کی شخصیت، فکر اور فن پر مکمل مواد کی دستیابی ہنوز ایک چیلنج کا حکم رکھتی تھی۔ میں اس سلسلے میں جناب محمد علی پٹھان، ڈاکٹر گل بالیدی، خالد چانڈیو، ڈاکٹر ساغر ابڑو اور عنایت میمن صاحبان کا مشکور ہوں جنھوں نے بعض مضامین کی فراہمی کو ممکن بنایا۔

سید مظہر جمیل

مختصر سوانحی کوائف

گوٹھ بندی (قدیم لبِ دریا)
تعلقہ ڈوکری، ضلع لاڑکانہ

گوٹھ 'بندی' موہن جودڑو سے پانچ کلومیٹر شمال کی جانب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو صدیوں سے آباد چلا آتا ہے۔ پچاس ساٹھ گھروں پر مشتمل یہ سندھ کے قدیم ترین دیہاتوں میں سے ایک ہے جو دریا کے کنارے سرسبز پس منظر کے ساتھ واقع ہوا ہے۔ جنوب میں ڈوکری شہر سے اس کا فاصلہ بہ مشکل سات کلومیٹر اور مغرب میں باڑھ سے آٹھ کلومیٹر ہوگا۔ اب تو خیر موہن جودڑو۔ باڑھ لنک روڈ نے سفر کی مشکلات قدرے کم کر دی ہیں لیکن ایک زمانہ تھا کہ لاڑکانہ سے بندی تک دس بارہ میل کا فاصلہ گھوڑے یا اونٹ اور آبی راستے میں کشتی کے ذریعے تین چار دن میں طے کیا جاتا تھا۔ بندی کا شمار ان ہزاروں بے شناخت دور افتادہ بستیوں میں ہوتا تھا جو فاصلے فاصلے سے سندھ کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں اور جنھیں جغرافیہ کے نقشے پر تلاش کرنا شاید ممکن نہ ہو۔ یوں بھی سندھ اپنے رقبے کے اعتبار سے ماضی میں گنجان آبادی والا علاقہ نہیں رہا ہے اور یہاں کی تہذیب زیادہ تر دریائے سندھ اور اس سے برآمد کیے جانے والے آبی وسیلوں کی مرہونِ منت رہی ہے کہ ندی، نالوں، نہروں، تالابوں، جھیلوں اور چاہیوں کے آس پاس تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کچے پکے مکانوں، اونچی نیچی گھاس پھوس کی جھونپڑیوں اور چھپروں پر مشتمل یہ آبادیاں بالعموم مختلف قوموں، ذاتوں اور پیشہ وروں پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ نسبتاً زیادہ آبادی والے گاؤں میں کوئی چھوٹا موٹا بازار بھی ہوتا تھا جہاں آس پاس کی بستیوں کے لوگ جمع ہوتے اور اپنے اپنے دیہاتوں کی سوغاتوں کا لین دین کرتے اور اپنے اپنے علاقوں کی خیر خبر اور حال احوال بھی حاصل کرتے تھے جو سندھی ثقافت کی قدیم اور مقبول رسم ہے۔ چھوٹے موٹے گاؤں دیہات میں بازار کا کیا سوال ہوتا ہے کہ یہاں کسی گھنے درخت تلے یا کسی چبوترے، اونچے ٹیلے، اوطاق (بیٹھک) یا ہٹی (دوکان) کے سامنے ہی چوپال جم جاتی ہے جہاں بستی کی سماجیاتی زندگی کے

آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ ان گاؤں میں اونچا چوبارہ اور پکی ماڑی تو بس وڈیرے کی ہوا کرتی تھی۔ خانۂ خدا، خواہ وہ مسجد ہو کہ مندر ہو کہ گوردوارہ، پہ چونے گارے کا اہتمام گویا سب کی مشترک اور ملی جلی ذمہ داری ہوا کرتی تھی۔

بندی بھی ایسی ہی اَن گنت بستیوں کی طرح ایک غیر معروف بستی تھی جہاں سائیں سوبھوگیان چندانی نے اب سے چھیاسی سال قبل ۳ رمئی ۱۹۲۰ء کو جنم لیا تھا۔ اس مٹھی بھر گاؤں کو جغرافیے کے نقشے پر تلاش کرنا تو شاید عبث ہوگا لیکن گزشتہ نصف صدی میں سوبھو صاحب کی نسبت سے اسے سندھ کی علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی زندگی میں جو غیر معمولی شہرت اور اعتبار حاصل ہوا ہے، وہی نسبت اب اس کی شناخت بن گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس مدت میں بعض غیر ملکی دانشور اور نام ور لوگ بھی محض سوبھو صاحب سے نیاز حاصل کرنے یہاں قدم رنجا فرماتے رہے ہیں اور ان ہی کے حوالے سے اَن گنت تحریروں میں اس بستی کا نام بھی محفوظ ہوتا چلا گیا ہے۔ ہر چند بچپن کے ابتدائی برسوں کے علاوہ سوبھو صاحب کو اپنی سیاسی، سماجی اور ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے 'بندی' میں زیادہ دل جمعی کے ساتھ رہنے کے مواقع کم کم ہی مل سکے ہیں لیکن ان کی شخصیت اور مزاج کی تعمیر و تشکیل میں اس جنم بھومی کی پُر سکون مدھرتا اور شادابی کے اثرات نمایاں ہیں اور اب جب کہ گزشتہ تین عشروں سے وہ مستقل طور پر لاڑکانہ منتقل ہو چکے ہیں، وہ بندی کی خنک ہواؤں اور مہکتی فضا کے حصار سے باہر نکل نہیں پاتے ہیں جیسے کہ روسی ادیب نکولائی گوگول یوکرائن کے اس دور اُفتادہ گاؤں سے جہاں اس نے جنم لیا تھا، زندگی بھر پیچھا نہ چھڑا سکا۔ اور نہ ہمارے آپ کے منشی دھنپت رائے، پریم چند موضع ملہی ضلع بنارس کی مہکتی صبحوں اور ڈھلتی دو پہروں کو اپنی یادداشت سے محو کر سکے تھے اور برملا کہتے تھے کہ میرا گاؤں اس حد تک میرے اندر بس گیا ہے کہ میں کہیں دور جا کر بھی کبھی خود کو اس کی گرفت سے آزاد نہ کر سکوں گا۔ اور سچی بات بھی یہی ہے کہ ہر انسان کی شخصیت کی تشکیل میں اس ماحول اور فضا کا نہایت اہم کردار ہوا کرتا ہے جس میں اس نے اپنی آنکھیں کھولی ہوں۔ چنانچہ گوٹھ بندی کی شانت اور مدھرتا سوبھو صاحب کی سرشت میں بھی ایسی رچ بس گئی ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی طبیعت پہ جھاگ اڑاتی ہوئی تیز و تندندی کی بجائے ایک سبک رو مگر مسلسل اُبلتے ہوئے جھرنے کا گمان گزرتا ہے جسے 'بندی' کے پُر سکون ماحول کا فیضان سمجھنا چاہیے۔ 'بندی' دریائے سندھ کی قدیم گزرگاہ میں واقع ہے اور پرانے زمانے میں یعنی کلہوڑہ عہد تک یہ علاقہ اپنی زرخیزی کی بنا پر 'لبِ دریا' کا علاقہ کہلاتا تھا۔ پرانی نہر (جسے عرفِ عام میں ''الھندو نارو'' (الھند نارو) کہتے ہیں) کے آثار تو اب بھی ہیں لیکن سکھر بیراج سے نکلنے والی دادو کینال جو اپنی وسعت اور بہاؤ میں خود ایک دریا سے کم نہیں اور پھر اس سے نکلنے والے طفیلی نالوں نے اس پورے علاقے کی زرخیز بنا دیا ہے۔ برساتی تالابوں کے پانی سے اٹھنے والی خنک ہوا اس کی فضاؤں میں تازگی کا احساس دلاتی ہے۔ دور تک لہلہاتے ہوئے کھیتوں، باغوں اور جنگلوں کی ہریالی اس علاقے کا مہکتا سنگھار تھا جو

وقت کے ساتھ ساتھ خشک ہوتا جارہا ہے کہ جب دریا کی کوکھ ہی سوکھنے لگی ہو تو اس سے نکلنے والے طفیلی ندی نالوں کا کیا ٹھکانا ہوسکتا ہے؟!

پہلے پہل سوبھو صاحب کے لکڑ دادا شری گیان چند جی گاؤں کے مکھیا اور دوسرے معززین کی دعوت پر کنڈیارو سے نقل مکانی کر کے اپنے کٹم کے ساتھ 'بندی' میں لگ بھگ کوئی ڈیڑھ دو سو سال پہلے آکر آباد ہوئے تھے۔ شری گیان چند کے چار فرزند روپ چند، پربھ داس، پاروبل اور جیوت رائے تھے۔ کنڈیارو سے نقل مکانی کر کے بندی میں آباد ہونے کا مقصد یہ تھا کہ اس دور افتادہ گاؤں اور آس پاس کی بستیوں میں رہنے والوں کے لیے روزمرہ ضروریاتِ زندگی اور دیگر اسبابِ تجارت کی فراہمی ممکن بنائی جاسکے کیوں کہ یہ علاقے عام گزرگاہوں سے الگ تھلگ اور کافی فاصلے پر واقع تھے اور عام آدمی کے لیے ضروریاتِ زندگی کی دستیابی آسان نہ تھی۔ دور دور تک پنسار کا کاروبار کرنے والا کوئی نہ تھا۔ 'بندی' گوٹھ دراصل سارا یہ خاندان کے مسلم گھرانوں کی بستی تھی۔ دوسری ذات کے بھی چند ایک گھر رہے ہوں گے۔ ہندو خاندان بس دو چار ہی تھے۔ گیان چند جی کے گھرانے کی آمد کا گاؤں والوں نے نہ صرف استقبال کیا تھا بلکہ گاؤں کے وڈیرے اور مکھیا نے انھیں رہائش کے لیے چند ایک کوٹھریاں ڈال دی تھیں جس میں انھوں نے شروع شروع میں ایک چھوٹی سی پنساری کی "ہٹی" (دوکان) قائم کی۔ انھیں علاقے کے ہر گھر کی ضرورت کی خبر ہوتی تھی، خاص طور پر زمیں دار اور کھاتے پیتے لوگوں کے گھروں میں استعمال ہونے والی اشیا کی فراہمی ان کے ذمے ہوا کرتی تھی۔ ظاہر ہے ان اشیا کو صرف اہم تجارتی شہروں اور قصبوں ہی سے حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اس زمانے میں شمال میں شکارپور اور چانڈکا (یہ پورا علاقہ بشمول لاڑکانہ پہلے اسی نام سے موسوم تھا) شہر واقع تھے، جنوب میں خلد آباد (خدا آباد) سیہون شریف وغیرہ اہم تجارتی مراکز ہوا کرتے تھے۔ تالپروں کے عہد میں لاڑکانہ شہر کے خدوخال بھی ابھر رہے تھے۔ سفر کی سہولتیں ناپید تھیں، لوگ قافلوں اور گروہوں کی صورت میں سفر کیا کرتے تھے تاکہ ڈاکوؤں اور لٹیروں سے بھی محفوظ رہ سکیں اور ایک دوسرے کے تجربوں سے راستے کی صعوبتوں اور تکلیفوں کو بھی کم سے کم کیا جاسکے۔ چنانچہ کاروباری بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لیے ان لوگوں نے جو کٹھنائیاں اٹھائی ہوں گی، ان کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ لیکن ان تھک محنت، سوجھ بوجھ اور ایمان داری کا پھل ہی تھا کہ گیان چند جی کے گھرانے کی کاروباری ساکھ میں دن دوگنا اضافہ ہوتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ خاندان کے بعض لوگوں نے ساہوکارے کا کام بھی شروع کر دیا جو سندھ کے ہندو واپاریوں کا مقبول ترین پیشہ تھا یعنی وہ ضرورت مندوں کو سود پر قرض کی فراہمی کیا کرتے تھے۔ یہ گویا اس زمانے کا بینکنگ سسٹم تھا جس کی بنیاد سود اور رہن پر رکھی گئی تھی۔ مسلمان زمیں دار کو عیش و عشرت اور نام و نمائش کے لیے بالعموم زرِ قرض کی ضرورت ہمیشہ لاحق رہا کرتی تھی جسے سندھ کے ہندو ساہوکار ہی پورا کیا کرتے تھے۔ اس قرض کے حصول کی خاطر وہ نہ صرف اپنی زرعی اراضی، کھیت کھلیان، رہائشی جائیدادیں، مال مویشی، زیور گہنے بلکہ قیمتی

تقریباتی ملبوسات تک رہن رکھ دینے سے باز نہ آتے تھے۔ چنانچہ ایک اندازے کے مطابق سندھ کے کم وبیش اسی فی صد مسلمان زمیں دار ہندو ساہوکاروں کے مقروض تھے اور قرضوں کی ادائیگی کی ضمانت کے طور پر ان کی قیمتی جائیدادیں اور املاک ان لوگوں کے پاس رہن اور گروی رکھی ہوتی تھیں۔ تالپروں کے عہد میں سندھ کے ہندو ساہوکاروں کی ساکھ نہ صرف ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل گئی تھی بلکہ بیرونی ممالک تک میں ان کی جاری کردہ ہنڈیوں کو قابلِ اعتبار سمجھا جاتا تھا۔ ایک طرف وسط ایشیائی علاقوں یعنی سمرقند، بخارا، آذربائیجان، افغانستان اور دوسری طرف افریقا، ہانگ کانگ، سیلون اور برما کے دور افتادہ شہروں میں ان لوگوں کی تجارتی کوٹھیاں قائم تھیں۔ مقامی طور پر بھی ان کے اثر ورسوخ اور ساکھ کا عالم یہ تھا کہ حکمراں طبقے بھی وقتِ ضرورت ان لوگوں سے قرض حاصل کرنے میں عار نہ سمجھتے تھے۔ یہ درست ہے کہ گیان چند خاندان کا ساہوکاری کاروبار بہت زیادہ وسیع نہ تھا کیوں کہ بعدازیں ان لوگوں کی اصل دلچسپی اور توجہ زمیں داری کی طرف ہوگئی تھی۔ خاص طور پر سوبھو صاحب کے دادا پربھ داس اور ان کی اولاد کو ساہوکارے کی بجائے عام کاروبار اور زراعتی پیشے سے دلچسپی تھی اور اسی میں انھوں نے غیر معمولی ترقی حاصل کی تھی۔

کلہوڑوں اور تالپروں کے زمانے میں سندھ کے ہندوؤں کو زرعی اراضی اور غیر منقولہ جائیدادوں پر مالکانہ حقوق حاصل کرنے کی اجازت نہ تھی لیکن انگریزوں کی آمد کے بعد قانونی طور پر یہ تفریق ختم کردی گئی جس کے نتیجے میں سندھ کے ہندو بھی زرعی اراضیات اور شہری املاک کو قانوناً خریدنے کے مجاز قرار دیے گئے۔ لہٰذا گیان چند جی کے خاندان نے بھی اس قانونی اختیار سے فائدہ اٹھایا اور 'بندی' کے آس پاس زرعی زمینیں خریدیں۔ اور اس طرح تجارت کے ساتھ ساتھ یہ لوگ زمیں داری اور کھیتی باڑی کے پیشے سے بھی منسلک ہوتے چلے گئے اور صدیوں سے غیر آباد زمینوں کو سرسبز لہلہاتی ہوئی کھیتیوں اور باغوں میں تبدیل کرکے رکھ دیا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے وسیع پیمانے پر مکھن اور گھی کی تجارت کو فروغ دینے کے لیے مال، مویشی بھی پالنے شروع کیے۔ یہ گویا اس زمانے کی ماڈرن ڈیری فارمنگ کے کاروبار کی ابتدائی صورت تھی۔ یوں بھی اس زمانے میں سندھ سے مکھن اور گھی اور دوسری خوردنی اشیا وافر مقدار میں وسط ایشیائی علاقوں کو بھیجی جایا کرتی تھیں اور شکار پور اور چانڈکا کے شہر اس تجارت کے اہم مراکز تصور کیے جاتے تھے۔

خاندانی پس منظر

سوبھو گیان چندانی کا اصل نام سوبھ راج ہے لیکن معروف وہ سوبھو گیان چندانی ہی کے نام سے ہوئے۔ وہ تین مئی ۱۹۲۰ء کو گوٹھ بندی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے دادا کے صرف دو بیٹے تھے: ٹانورمل اور

کھلن داس۔ سوبھو صاحب کے والد کی سات اولادیں ہوئیں: کلیانی (بیٹی)، کیول رام (بیٹا)، سوبھ راج (بیٹا)، پرمیشوری عرف پمی (بیٹی)، خوب چند عرف بھائی (بیٹا)، ودھیا (بیٹی)، ساوتری (بیٹی)۔ ان میں ودھیا کم عمری ہی میں بیوہ ہوگئی تھی اور اب ہندوستان میں اپنے سسرال میں رہتی ہے۔ ساوتری ترکِ وطن کرکے اپنے شوہر کے ساتھ ہندوستان میں آباد ہوگئی ہیں۔ چھوٹا بھائی خوب چند جو''بھائی'' کے نام سے مشہور ہوا، جواں عمری میں انتقال کرگیا۔ پرمیشوری عرف پمی بھی انتقال کرچکی ہے۔ بڑے بھائی کیول رام، جن سے سوبھو صاحب کو ہمیشہ بڑی تقویت حاصل رہی اور بڑی بہن کلیانی بھی سورگ باش ہوچکے ہیں۔

سوبھو صاحب کے اپنے دو لڑکے ہوئے۔ پہلا کنہیا لال اور دوسرا نرمل داس دونوں نہایت لائق فائق۔ کنہیا لال نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کرکے ڈاکٹری کی سند حاصل کی اور اس کی خواہش تھی کہ وہ پوسٹ گریجویشن کرکے اپنی فیلڈ میں عام لوگوں کی خدمت کرتا۔ لیکن قسمت کو یوں منظور نہ تھا اور کنہیا لال اپنی جوانی ہی میں ظالم منشیات کا شکار ہوکر راہیِ عدم ہوگیا۔ اپنے پیچھے دو چھوٹے بچے بھی چھوڑ گیا ہے۔ کنہیا لال کی وفات نے سوبھو صاحب کی زندگی اور طبیعت پر بہت دوررس اثرات مرتب کیے ہیں۔ دوسرا بیٹا نرمل داس جو انجینئرنگ کے پیشے سے وابستہ ہے اور جس کے بڑے بیٹے اویناش سے سوبھو صاحب کو بہت سی امیدیں وابستہ ہیں کہ اس میں پڑھنے لکھنے کا ذوق موجود ہے۔

سوبھو گیان چندانی کا خاندان سکھ مت کے بانی گرونانک کا ماننے والا ہے اور یہ لوگ نانک پنتھی کہلاتے ہیں۔ لیکن سکھ عقائد کے مطابق نہ تو یہ داڑھی رکھنے کے پابند ہیں اور نہ کرپان، کڑا اور کیس وغیرہ کو اپنے عقیدے کے لوازمات میں شمار کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں کے ہاں عام طور پر کم و بیش سب ہی اہم مذاہب کی اخلاقی اقدار کی پاس داری کا اہتمام ملتا ہے۔ ہندومت کی طرح سکھ مت کی اساس بھی خدا کی وحدانیت پر استوار ہے اور ہندو صنمیات میں دیوی دیوتاؤں کے تصور میں بھی دراصل خدائے واحد (پرم آتما) ہی کے مختلف روپ، مظاہر اور علامتیں کارفرما ہیں۔ ابوریحان البیرونی نے اپنی کتاب ''کتاب الہند'' میں ہندومت کے عقائد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ابتدائی ادوار میں ہندو دیومالائی تصورات سیدھے سادے اور فطرت کے قریب تر تھے اور وہ اللہ جل شانہٗ کی وحدت میں کلی طور پر یقین رکھتے تھے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ وہ بہ نفسہٖ 'قادرِ مطلق'، 'حکمت والا' اور غیر از مماثل اور مقابل ہے، یعنی نہ کوئی اس کا ثانی ہے اور نہ کوئی اس کا مقابل، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی زندگی کو موت سے بدل دیتا ہے۔''

البیرونی نے ہندومت کے تصورات کے ثبوت میں ان کی مذہبی کتابوں کے اقتباس بھی پیش کیے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ہندومت پر قدامت کی تہیں چڑھتی گئیں، اور جیسے جیسے معاشرتی

ضرورتیں، مسائل اور اسباب وعوامل بدلتے گئے، ویسے ویسے دوسرے مذاہب کی طرح ہندومت کے عقائد اور رسومات میں بھی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی گئیں۔ چنانچہ قرن ہا قرن پہ محیط مدت میں ہندومت کی نہ صرف دیوی دیوتاؤں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا بلکہ ان کی دیومالائی صنمیات بھی پیچیدہ تر ہوتی چلی گئی ہے۔ ہندومت پر کئی مذہبی ادوار گزرے ہیں اور ہر دور کی تاریخ کسی نہ کسی اہم وقوعے سے وابستہ رہی ہے جن کے توسط سے عقائد اور رسم ورواج کے ساتھ ساتھ دیوی دیوتاؤں میں بھی اضافے ہوتے چلے گئے ہیں لیکن اگر بہ غور دیکھا جائے تو فروعات (جو ہر قدیم مذہب کا مقدر ہوا کرتی ہیں) سے قطع نظر ہندومت کے بنیادی تصورات وحدانیت ہی کے دائرۂ کار میں روبہ عمل رہے ہیں جن کی شہادتیں رگ وید، پرانوں، منوسمرتی اور دوسری مذہبی کتابوں کے مندرجات سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

سندھ کے ہندوؤں میں اکثریت نانک پنتھی، وشنومت اور شیومت سے وابستہ تھی۔ ان کے عقائد اور رسومات میں سادگی اور وسیع المشربی کے عناصر نمایاں رہے ہیں۔ ان کے درمیان برہمنوں کی عدم موجودگی نے بھی مذہبی کٹر پنتھی رویوں کو پھلنے پھولنے سے باز رکھا ہے۔ یوں بھی سکھ مذہب ہندوستان کا سب سے کم عمر اور جدید ترین مذہب ہے، اس لیے اس کے ماننے والوں میں انسان دوستی، فطرت پرستی، پیار ومحبت اور رواداری کے رجحانات اور رویوں کی عمل داری نسبتاً زیادہ نمایاں رہی ہے۔ یہاں کے سکھ پنتھی جہاں گروگرنتھ صاحب کا پاٹھ کیا کرتے ہیں، وہیں رامائن اور گیتا کا جاپ بھی کرتے، مہابھارت کی کتھائیں اور ویدوں کے حمدیہ اشلوک پڑھنے میں بھی کوئی عار نہ سمجھتے تھے۔ ان کے مندر اور گردوارے بالعموم ساتھ ساتھ ہوتے ہیں جہاں ہندومت کے بتوں کے ساتھ ساتھ گرنتھ صاحب اور بابا گرونانک کی شبیہہ بھی رکھی ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کے ہاں مذہبی ہم آہنگی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کے صوفیوں اور بزرگوں پر بھی اعتقاد رکھتے ہیں اور ان کی ویسی ہی عزت وتکریم کیا کرتے ہیں جیسی کہ خود اپنے گروؤں اور اوتاروں کی کرتے ہیں۔ 'حضرت خضر' کا خالص اسلامی تصور ان لوگوں کے ہاں بھی 'اڈیرولال' (جھولے لال) کی صورت میں موجود رہا ہے جسے وہ دریائے سندھ کے حاکم سمان اور خوش حالی کی علامت جانتے ہیں۔ سندھ کے ہندوؤں اور بالخصوص نانک پنتھیوں کی وسیع المشربی کا عالم یہ ہے کہ جہاں وہ گردوارے (جنھیں وہ ٹھکانہ کہتے ہیں) میں گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتے ہیں، وہیں وشنو جی کی مندر کا گھنٹا بجانا اور مسلمانوں کی مسجد کے طاق میں چراغ جلانا نہیں بھولتے۔ سادھو، سنت، باوا، صوفی اور ولی سب کے ٹھکانوں سے وہ یکساں طور پر روحانی فیض اور آتما کی شانتی حاصل کرتے ہیں۔

تاریخ کے قدیم ادوار میں بھی سندھ میں برہمنوں کی آبادی نہ ہونے کے برابر رہی ہے اور برہمن جاتی کے لوگوں کو یہاں کے ہندو معاشرے میں وہ اہمیت حاصل نہ تھی جو ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں رہی ہے۔ اسی طرح یہاں چھوت چھات اور ذات پات کے سخت گیر تصورات اور رویئے بھی کبھی مقبول

نہیں رہے ہیں۔

اس پس منظر کے حامل سوبھو گیان چندانی کے آباواجداد مسلم اکثریت والے گاؤں 'بندی' میں یوں گھل مل گئے تھے کہ یہ غیر معروف بستی بالآخران ہی کی نسبت سے مشہور ہوئی۔ یوں اس بستی میں اکا دکا دوسرے ہندو گھرانے بھی آباد رہے تھے لیکن یہ عجب بات ہے کہ پورے گاؤں میں نہ تو کوئی ایسا مندر تھا نہ گردوارہ جہاں اجتماعی عبادت اور مذہبی رسومات ادا کی جاتی ہوں۔ ہاں ان کے گھروں میں پوجا پاٹ کے لیے جگہ مخصوص ہوتی، جہاں بزرگوں میں سے جس کا جی چاہتا، کبھی کبھار گرو گرنتھ صاحب کا پاٹھ کر لیتا اور کبھی رامائن کے اشلوک پڑھ لیتا اور بس۔ چھوت چھات اور مذہبی بیگانگیت کے عناصر سندھ کے ہندوؤں میں کبھی نہیں دیکھے گئے اور یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذہب بالخصوص مسلمانوں سے ان کے میل جول میں مذہبی عقائد اور رسوم ورواج کبھی حائل نہ ہو پائے۔

سوبھو جی کے دادا پربھ داس کے صرف دو بیٹے تھے، ایک سوبھو کے والد جن کا نام ٹانورمل تھا اور دوسرے کھلن داس۔ چونکہ ان کے چچا کھلن داس کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے انھوں نے سوبھو کے بڑے بھائی کیول رام کو گود لے رکھا تھا۔ لیکن چاچا چاچی لڑکپن کی دلچسپ حرکتوں کی وجہ سے انھیں بھی عزیز رکھتے تھے اور دادا کی توجہ تو پہلے ہی حاصل تھی۔ ان کی پیدائش کے وقت دادا کی زمیں داری خوب پھل پھول رہی تھی۔ اکثر زمینیں اور باغ 'بندی' اور آس پاس کے علاقوں ہی میں واقع تھے لیکن کچھ زمین ''گیریلو'' کے علاقے میں بھی تھیں جہاں چاول کی کاشت خوب ہوتی تھی۔ بابا ٹانورمل زیادہ تر گیریلو کی زمینوں پر رہتے تھے اور ہفتے دس دن ہی میں گاؤں کا چکر لگایا کرتے تھے۔ گوٹھ والی زمینوں کی دیکھ بھال چاچا کھلن داس کے ذمے تھی۔

بندی کے آس پاس درجنوں چھوٹے چھوٹے گاؤں اور بستیاں تھیں۔ ان میں سے اکثر گاؤں اور بستیوں کے رہنے والوں سے گیان چند گھرانے کے کاروباری تعلقات قائم تھے اور ان لوگوں نے ڈوکری اور لاڑکانہ کے آس پاس کے علاقے میں اپنے کاروبار کو وسعت دے رکھی تھی۔ کچھ لوگ زمیں داری کرنے لگے تھے اور چند گھرانوں نے مختلف کاروبار اختیار کر رکھے تھے۔ سوبھو جی کے ایک پھوپھا سود پر پیسے دینے کا کام کرتے تھے۔ ضرورت مند آتے اور حسب خواہش ان سے پیسے لے جاتے لیکن انھیں اپنی رقم یا سود کی وصولی کے لیے کبھی باہر نکلنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اگر کوئی غریب آدمی ادائیگی کے قابل نہ ہوتا تو اسے معاف بھی کر دیتے کہ اس زمانے میں سودی کاروبار کرنے والوں میں بھی انسانی ہمدردی کی قدر باقی تھی۔ سوبھو جی کے دادا اور ان کی اولاد نے سودی کاروبار کو کبھی پسند نہ کیا۔ سوبھو جی کے دادا بہت سویرے سو کر اٹھتے تھے اور بلند آواز سے اشلوک اور دعاؤں کا جاپ کیا کرتے تھے۔ کبھی گرو گرنتھ صاحب کا ورد ہوتا، کبھی رامائن کا جاپ۔ ان کی خوش الحانی سے صبح کی فضا جاگ اٹھتی تھی۔ ان

دعاؤں (ارداس) میں اپنی اور اپنے گھرانے کے ساتھ ساتھ جگ بھر کے لیے خیر و عافیت طلب کی جاتی تھی۔ سوبھو کو بچپن میں دادا سے اشلوک اور 'ارداس' سننے کا چسکا پڑ گیا تھا اور وہ بھی دادا کے ساتھ ساتھ انھیں دہرانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ انھیں سکھوں کے گرو گرنتھ صاحب کے علاوہ لوک کہانیاں سننے کا بھی بہت شوق تھا جنھیں سن کر طبیعت میں ایک قسم کا جوش اور اُبال پیدا ہوا کرتا تھا اور سکھوں کی خودداری، جاں فشانی اور بہادری پر ایمان راسخ ہو جاتا تھا۔ ان کے دادا انھیں ہر مذہب کی اچھی باتیں بتایا کرتے تھے۔ وہ جب بھی کسی مسجد کے سامنے سے گزرتے تو نہایت ادب سے ہاتھ باندھ کر گزرتے تھے۔ اس زمانے میں کبھی کوئی ہندو یا سکھ عورت کسی مسجد کے طاقچے میں منّت کا دیا جلا آتی تھی اور کبھی کسی مندر میں پوجا کا چڑھاوا چڑھا آتی تھی۔ عید تو عید، ہولی دیوالی، تیرتھ دسہرہ سب تیج تیوہار لوگ مل جل کر مناتے تھے۔ ان کے گھر میں دیوالی کی مٹھائیاں خوب تیار ہوا کرتی تھیں اور گاؤں بھر میں تقسیم کی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں نہ تو مسلمانوں میں کوئی کٹر پن تھا اور نہ ہندوؤں میں چھوت چھات۔ دادا کی سخاوت اور نرم مزاجی کے کئی قصے سوبھو جی کو اب تک یاد ہیں۔ ان کے دسترخوان پر کوئی نہ کوئی مہمان ضرور ہوا کرتا تھا۔ کسی ہاری یا کام کرنے والے کو بھی بغیر کھلائے پلائے نہ جانے دیتے۔ جب کوئی نہ ملتا تو گاؤں کا ایک چکر لگاتے اور کسی فقیر مسکین ہی کو پکڑ لاتے اور اس سے وہی برتاؤ کرتے جو ایک معزز مہمان سے کیا جانا چاہیے۔

سوبھو صاحب نے اپنی والدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "وہ ایک وسیع النظر اور ایسی ہمدرد خاتون تھیں جنھوں نے گاؤں گوٹھ کی غریب اور بے سہارا عورتوں کی امداد کو اپنا معمول بنا رکھا تھا اور ان کے گھر کے آنگن میں ہر وقت کوئی نہ کوئی ضرورت مند خاتون موجود رہا کرتی تھی۔ ایسی ہی ایک عورت مائی دھیانی تھی۔ یہ ایک ایسی مصیبت زدہ اور بے سہارا مسلمان عورت تھی جسے بار بار جنسی تشدد اور غیر انسانی مظالم کا شکار بنایا جاتا رہا تھا۔ گاؤں کی عورتیں اسے طنز سے 'آٹھ خصموں والی' کہہ کر پکارتی تھیں لیکن سوبھو صاحب کی والدہ تھیں کہ اس جیسی دھتکاری ہوئی عورتوں کی مدد کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہا کرتی تھیں۔"

(سوبھو صاحب نے مائی دھیانی کا پُر تاثر قلمی خاکہ بھی لکھا ہے جسے سوانحی خاکہ نگاری میں منفرد سمجھا گیا ہے) انھوں نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ مائی دھیانی' دونوں بھائیوں کو اپنے گھر اٹھا لے جاتی تھی۔ اس کی شخصیت میں ممتا کا جورس رچا بسا تھا، اس نے مائی دھیانی کے پیکر کو ان کے بچپن کے تصویر خانے میں زندہ جاوید بنا رکھا ہے۔

اپنی والدہ کا ذکر کرتے ہوئے سوبھو صاحب مزید لکھتے ہیں:

''میں اپنی والدہ کا دوسرا بیٹا ہوں۔ میرے بڑے بھائی کیول رام چچا اور چچی کے بھی منظورِ نظر تھے۔ کیوں کہ چچی کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تھی، اس لیے وہ اپنی ساری ممتا ہم دونوں بھائیوں پر لٹایا کرتی تھیں لیکن ان کا اصل لے پالک کیول رام ہی تھے۔''

میں نے جب اپنے لڑکپن کی بابت اپنی ماں سے پوچھا تو انھوں نے بتایا:

''تمھارا بڑا بھائی ہر وقت میرے پلو پکڑے ہوئے میرے پیچھے ریں ریں کرتا پھرتا تھا لیکن تم الگ تھلگ کسی کونے کھدرے میں سارا سارا دن اپنے آپ میں کھیلتے رہتے تھے اور مٹی اور گوبر سے لپے پُتے فرش پر ادھر اُدھر لڑھکیاں کھاتے پھرتے تھے۔ میں اس لیے بھی ان کا لاڈلا بنا ہوا تھا کہ میں روٹی وغیرہ کھانے سے کم رغبت رکھتا تھا اور مٹھائی اور اوپر کی دوسری چیزوں کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ خاص طور پر رات کے کھانے میں ماں اکثر مجھے پوری کچوری تل کے کھلاتی تھی۔ وہ اصلی گھی اور مکھن کا زمانہ تھا۔ اس لیے ہم نے بچپن میں اصلی گھی اور مکھن خوب خوب کھایا ہے۔''

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے:

''ہماری ماں بہت محنتی اور جفاکش خاتون تھیں اور ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ خالی وقت میں وہ ہمارے پنگوڑے کو ہلاتیں اور سلانے کے لیے نہایت دلچسپ اور مدھر لوریاں سنایا کرتی تھیں۔ اب ماؤں کو نہ فرصت ہے اور نہ انھیں اس طرح کی مدھر رسیلی لوریاں یاد ہیں۔ اسی لیے آج کے بچوں کے کان ان خوب صورت لوریوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔''

سوبھو صاحب نے مزید بتایا ہے:

''ماں اکثر آٹا پیسنے کی چکی بھی چلایا کرتی تھی اور میں چکی میں سے نکلنے والے آٹے کی مٹھیاں بھر بھر کر باہر بکھیرا کرتا تھا۔ ماں ایک ہاتھ سے مجھے اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کرتی اور دوسرے ہاتھ سے چکی چلائے جاتی تھیں۔ میں جب سیاست کے چکر میں پہلی بار جیل گیا ہوں تو ماں بڑے اہتمام کے ساتھ مجھے دیکھنے جیل آئی تھیں اور محض اس خیال سے کہ کہیں ہمارا دل دکھی نہ ہو، وہ بھی بہت بہادری اور ہمت کا اظہار کرتی رہی تھیں۔ اور دادا محض اس خیال سے کبھی جیل نہ آئے کہ وہ ہمیں جیل میں بند دیکھ کر کہیں رو نہ پڑیں! لیکن ماں کی حوصلہ

مندی ہم سب کی ہمت بڑھاتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ قسم قسم کے کھانے، پھل فروٹ اور دوسری ضرورت کی چیزیں وافر مقدار میں لاتی تھیں اور جب خود نہ آتی تھیں تو یہی چیزیں وہ دوسروں کے ذریعے بہت باقاعدگی سے بھیجتی رہتی تھیں۔ جب میں جولائی ۱۹۵۹ء سے مارچ ۱۹۶۴ء کے دوران مسلسل پانچ سال تک گوٹھ میں نظر بندی کے دن گزار رہا تھا تو مجھے ایک مدت کے بعد لمبے عرصے تک ماں کے ساتھ رہنے کا موقع نصیب ہوا۔ اور میں نے معاشرے میں ساس بہو کے رشتے کی سنجیدگی کو قریب سے دیکھا۔ خاندان کی بزرگ خاتون ہونے کی حیثیت سے ہماری ماں ہر قسم کے فیصلے کرنے کا اختیار رکھتی تھیں اور کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ ان کے کسی فیصلے سے اختلاف یا روگردانی کی ہمت کر سکتا۔ گھر کے اندر گھریلو معاملوں میں ماں کا حکم حرفِ آخر تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود اپنے طور پر سب بچوں کی پسند ناپسند کا خیال رکھا کرتی تھیں۔''

ماں کے علاوہ دوسری شخصیت جس نے سوبھو جی کے کردار سازی میں اہم حصہ لیا ہے، وہ ان کے دادا (پربھ داس) کی شخصیت تھی جن سے لڑکپن میں سب سے زیادہ مانوس رہے ہیں۔ انھیں دادا جی کے ہاتھ پاؤں دبانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ اور دادا بھی انھیں کندھے پہ چڑھائے چڑھائے پھرتے تھے۔ دادا پوتے گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ مگن رہتے تھے۔ وہ بڑے دیالو اور سخی آدمی تھے۔ عام لوگوں سے پیار و محبت اور بھائی چارے کا سلوک رکھتے تھے۔ وہ صوفی منش اور فطرت پرست آدمی تھے۔ کھیتی باڑی اور شجر کاری ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کبھی گرو گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتے، کبھی رامائن کے اشلوک، مہابھارت اور دوسری لوک کتھائیں سناتے، لوک ادب اور کہانیوں میں پوشیدہ سحر سے انھیں دادا ہی نے متعارف کروایا تھا اور ان کے دل میں حصولِ علم کی جوت بھی دادا جی ہی نے جگائی تھی۔ وسیع المشربی ان کا شیوۂ خاص تھا۔ وہ ہر صبح سویرے اپنی پاٹ دار آواز میں دعائیہ اشلوک پڑھا کرتے تھے اور جپ صاحب کا ورد کرتے تھے جنھیں سکھ لوگ بالعموم ''ارداس'' کہتے ہیں۔ ان دعاؤں میں اپنی خیر و عافیت کے ساتھ ساتھ آس پاس کے ڈھائی گھروں کی خیریت بھی طلب کی جاتی تھی۔ ان ڈھائی گھروں میں ایک گھر مسلمان کا ہوتا ہے۔ دوسرا ہندو کا اور آدھے میں باقی سب چھوٹے بڑے مذہب کے لوگ شامل ہو جاتے ہیں۔ سوبھو صاحب کے دادا ایک اور خوب صورت دعا کثرت کے ساتھ دہرایا کرتے تھے۔

''مالک! میری آل اولاد، جڑ بنیاد خوب پھلے پھولے، اُن کو تو پاتال تک ترقی دے لیکن وطن کی محبت کو ان کے خون میں ایسے شامل کر دے کہ وہ اس دھرتی کی موہ سے کبھی باہر نہ نکل پائیں۔''

یہی وہ بلند انسانی اقدار، محبت، خلوص، وطن پرستی اور وسیع المشربی کا ورثہ تھا جو سوبھو صاحب کو دادا کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ ان کے مزاج میں جو کشادہ قلبی ہے، اسے بھی یقیناً خاندان کی مشترکہ میراث سمجھنا چاہیے۔

سوبھو صاحب کے والد ٹانورمل سیدھے سادے زمیں دار مگر جفاکش انسان تھے جو خاندان کے ایک ایک فرد کی ضرورتوں سے باخبر رہتے تھے۔ جو قد کاٹھ میں بہت اونچے پورے تو نہ تھے لیکن ادھیڑ عمر میں کچھ وزن بھی بڑھ گیا تھا اور جسم بھی پھیل گیا تھا۔ سوبھو صاحب نے رنگ روپ اور ناک نقشے میں بہت کچھ اثرات اپنے ابا ہی سے حاصل کیے تھے۔ وہ گھریلو مزاج کے کنبہ پرور انسان تھے۔ ہر چھوٹے بڑے رشتے دار کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ اپنی پوری توانائی کے ساتھ حتی الامکان گھر بھر کی ضرورتیں کمال خوبی سے پوری کیا کرتے تھے۔ ان کا ہاتھ بھی بہت کھلا ہوا تھا۔ لہٰذا گوٹھ گاؤں کے باہر بھی اُن کی فیاضی کے چرچے عام رہا کرتے تھے۔ جب تک زمیں داری اور کاروبار مشترک رہے، بیشتر کام کاج خاص طور پر ٹانورمل جی ہی دیکھتے بھالتے رہے۔ کھیتی باڑی کے معاملات کے علاوہ دفتروں کے کام کاج بھی وہی دیکھا کرتے تھے۔ ان کے خاندان کی اچھی خاصی زمینیں جو سوا ایکڑ کے لگ بھگ تھیں، بندی ہی کے آس پاس تھیں لیکن کچھ اراضی انھوں نے دوسرے قریبی تعلقوں میں بھی خرید لی تھیں اور ان کے والد زیادہ تر باہر زمینوں ہی پر رہا کرتے تھے۔ ہفتے پندرہ دن میں گھر کا چکر لگایا کرتے تھے۔ وہ ایک سادہ طبیعت کے صوفی منش اور خداترس آدمی تھے۔

ابتدائی تعلیم

سوبھو صاحب نے ابتدائی تعلیم تو اپنے دادا پر بھ داس سے ہی حاصل کی تھی۔ سندھی حروف تہجی، فارسی الف بے، اور گورمکھی کی شدھ بدھ کم عمری ہی میں کروادی گئی تھی۔

گرنتھ صاحب اور رامائن کے بعض منتخب اشلوک بھی ورد کروا دیئے گئے تھے۔ پانچ سال کی عمر (۱۹۲۵ء) میں جب وہ ''بگھی'' نامی گاؤں کے گورنمنٹ پرائمری اسکول میں اپنے بڑے بھائی کیول رام کے ساتھ داخل کیے گئے تو انھیں بہت سی باتوں میں اپنے ہم سبقوں پر فوقیت حاصل تھی۔ یہ اسکول 'بندی' سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ راستہ بالعموم پاپیادہ طے ہوتا تھا، بس کبھی کبھار بیل گاڑی کی عیاشی نصیب ہوجاتی، ورنہ ادھر جانے والی گدھوں کی کوئی ٹکڑی بھی غنیمت ہوتی۔ یہ لوگ گدھوں پر سوار ہوکر ہی اسکول پہنچ جاتے۔ پڑھنے کا شوق تو ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ لہٰذا اسکول آنے جانے کے درمیان بھی کتابیں ان کی رفیق ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں سرکاری اسکول ہر گاؤں میں تو ہوتے نہیں تھے

بلکہ پندرہ بیس گوٹھوں کے درمیان جو بستی نسبتاً ذرا بڑی ہوتی اور جہاں نسبتاً کچھ دوسری سہولتیں بھی حاصل ہو سکتی ہوں، اسکول قائم کر دیے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے ''بگھی'' خوش نصیب گاؤں تھا جہاں پرائمری اسکول موجود تھا، جہاں دور دور گوٹھوں سے لڑکے پڑھنے آتے تھے۔ پرائمری اسکول میں داخلہ حاصل کرنا اس زمانے میں بھی آسان کام نہ تھا۔ کیوں کہ کلاس روم کی گنجائش اگر تیس طالب علموں کی ہوتی تھی تو اس تعداد سے ایک لڑکا زائد بھی داخل نہ کیا جاتا تھا۔ بگھی نسبتاً ایک بڑا گاؤں تھا۔ اس زمانے میں بھی دس پندرہ ہزار نفوس کی آبادی رہی ہوگی۔ دو چار مکانوں کو چھوڑ کر بیشتر گھر کچے مگر باقاعدہ طور پر بنے ہوئے تھے، گلیاں چوڑی اور اکثر میں اینٹوں کا فرش تھا۔ اسکول کی عمارت پکی اینٹوں کی تھی۔ کمرے کشادہ تھے، صحن بھی کھلا ہوا تھا۔ ہاتھ سے چلانے والا پانی کا نلکا بھی موجود تھا۔ صحن میں درختوں کی چھاؤں سے ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا۔ اسکول میں ہندو لڑکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مسلمان لڑکے بس گنتی کے تھے۔

مگن ہاروں (مکھی ھار) کی دو لڑکیاں بگھی کے اسکول میں پڑھتی تھیں۔ لیکن ہندو لڑکی کوئی نہ تھی۔ حالانکہ بگھی میں ہندوؤں کی آبادی کافی تھی۔ دور دراز مقامات سے آنے والے بعض استادوں کو اسکول سے ملحق رہائشی حصے میں رہنے کی اجازت تھی لیکن ان پر ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ اسکول کے بعد لڑکوں کو اسپیشل کوچنگ دیں گے۔ خاص طور پر چوتھی اور پانچویں جماعت کے طالب علموں کے لیے اسپیشل کوچنگ لینا ضروری تھی۔ اسکول میں قیام پذیر ماسٹروں کے لیے گاؤں کے ہندو گھرانوں سے دو وقت کی روٹی باقاعدگی سے آجاتی تھی۔ اور باہر سے آنے والے لڑکوں کی بھی ڈیوٹی تھی کہ وہ ماسٹروں کے لیے راستے میں پڑی لکڑی اور سوکھی جھاڑیاں لاکر ایک جگہ ڈھیر کیا کریں تاکہ وہ ان کے جلانے کے کام آسکے۔ سوبھو صاحب کو اس کام میں بھی مزہ آتا تھا۔ وہ کلاس روم اور اسکول کی صفائی ستھرائی کے کام بھی بہت خوشی سے کیا کرتے تھے۔ بگھی گاؤں کے وڈیرے عیسیٰ خان کی اوطاق (بیٹھک) اور حویلی میں جن لڑکوں کو آنے جانے کی اجازت تھی، ان میں سوبھو صاحب بھی شامل تھے۔ وڈیرے کی کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے وہ اسکول کے بچوں کو پسند کرتا تھا۔ فیاض بھی بہت تھا، لڑکوں میں پھل فروٹ، مٹھائی وغیرہ تقسیم کیا کرتا تھا۔ بڑے بھائی کیول رام پڑھنے لکھنے میں کوئی خاص دلچسپی نہ لیتے تھے۔ لیکن وہ اپنے چھوٹے بھائی کی خوب دیکھ ریکھ اور خدمت کیا کرتے تھے۔ ہاں کھیل کود اور دوسرے معاملات میں وہ بہت تیز تھے۔ گاؤں سے نکل کر اسکول کی کھلی فضا میں سانس لینا سوبھو جی کے لیے ایک نیا اور اہم تجربہ تھا۔ یہاں آکر ان کے جوہر بھی کھلے تھے اور وہ دیکھتے دیکھتے نہ صرف اپنی جماعت کے ہوشیار لڑکوں میں شمار ہونے لگے تھے بلکہ اسکول بھر میں انھیں خاص مقبولیت حاصل ہو چلی تھی۔ وہ کلاس میں اگلی بینچ پہ بیٹھتے اور اکثر و بیشتر انھیں اسمبلی میں دعائیہ نظم پڑھنے کا شرف بھی حاصل ہوا کرتا تھا۔

ان کا حافظہ بچپن ہی سے بہت اچھا تھا اور دادا جی نے گرنتھ صاحب اور رامائن کی کئی خوب صورت اور

منتخب دعائیں انھیں پہلے ہی یاد کرا رکھی تھیں۔ اس اسکول میں ان کے استادوں میں ماسٹر ریواچند، ابھر یومل، ویرومل اور یار محمد صاحبان کے نام انھیں اب تک یاد ہیں۔ انھیں یہ بات بھی یاد ہے کہ اس اسکول میں صبح سب سے پہلے ہر بچے کے دانتوں اور ناخنوں کا معائنہ کیا جاتا تھا اور اگر کسی کے دانت پیلے ہوتے تو انھیں نیم کی مسواک سے فوراً صاف کرنا پڑتے۔ اگر کسی بچے کو بخار کی شکایت ہوتی تو کونین کی گولی کھانے کو دی جاتی تھی۔ اس زمانے میں اسکول کسی کسی گاؤں میں ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ''بگھی'' کے اسکول میں آس پاس کے کئی گوٹھوں کے بچے پڑھنے آتے تھے۔ چوتھی کلاس میں تھے کہ انھیں اسکاؤٹ بننے کا موقع بھی حاصل ہوا اور داداجی نے شوق کے ساتھ اسکاؤٹ کی خاکی وردی سلوادی تھی جسے پہن کر بہ قول سوبھو صاحب ہم لوگ اپنے گاؤں اور بگھی گاؤں میں خوب دندناتے پھرتے تھے۔

پرائمری تعلیم کی تکمیل کے بعد انھیں اور ان کے بڑے بھائی کیول رام کو قمبر کے اے وی (A.V) ہائی اسکول میں (۱۹۲۹ء) داخل کروادیا گیا۔ اور اسکول سے وابستہ بورڈنگ ہاؤس (ہوسٹل) میں ان کی رہائش کا بندوبست بھی کردیا گیا۔ قمبر میں ان کے ننھیال کے لوگ بھی رہتے تھے مگر ان کے دادا کا خیال تھا کہ بچوں کو بہتر تعلیمی ماحول کے لیے رہائش بورڈنگ ہاؤس میں اختیار کرنی چاہیے۔ ہاں ننھیال سے قریب رہنے کی وجہ سے خیال تھا کہ گھر کی یاد انھیں بہت زیادہ دکھی نہ کرے گی۔ سوبھو صاحب بچپن ہی سے تنہائی پسند رہے ہیں۔ جلد از جلد دوست بنانے کی جو خوبی ان کے بڑے بھائی کیول رام کو ودیعت ہوئی تھی، وہ اس صلاحیت سے محروم تھے۔ قمبر میں بھی ان کے دوستوں کی تعداد محدود تھی۔ یہاں آکر انھوں نے اسکول کے گیمز میں بھی دلچسپی لینی شروع کی لیکن ان کا اصل مشغلہ اسکول لائبریری سے قصے کہانیوں کی کتابیں حاصل کرکے پڑھنا تھا۔ یہیں انھیں روچی رام تیج رام کے رسالے 'سناتن دھرم پرچار' سے تعارف حاصل ہوا جو کراچی سے نکلتا تھا۔ اس رسالے میں پرانی اور غیر مفید رسم و رواج پر مضامین شائع ہوتے اور زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کی خبریں بھی چھپتی تھیں۔ اس رسالے کو سماج سدھار تحریک میں بہت اہمیت حاصل تھی، اس میں عام لوگوں کے علاوہ بچوں کے لیے سبق آموز کہانیاں بھی شامل ہوا کرتی تھیں چنانچہ وہ اس رسالے کو بہت باقاعدگی سے پڑھنے لگے تھے۔ اور کئی باتیں جو شاید عام طور پر سمجھ میں نہ آپاتیں، ''سناتن دھرم پرچار'' کے مطالعے سے واضح ہونے لگیں۔

اس زمانے میں زندگی بہت سیدھی سادی اور سست رفتار ہوا کرتی تھی۔ تفریح اور چہل پہل کے وہ انداز بھی نہ تھے جو آج کل کے زمانے میں حاصل ہیں۔ بورڈنگ ہاؤس میں بھی شام سے ہی سناٹا چھا جاتا تھا۔ اس سناٹے میں بورڈنگ ہاؤس میں مقیم لڑکے سوبھو صاحب سے فرمائش کرکے مہابھارت کی کتھائیں یا رامائن کے اشلوک سنا کرتے تھے۔ قمبر کے اے وی ہائی اسکول میں انھوں نے پڑھنے پڑھانے کے علاوہ نئی نئی گالیاں ایجاد کرنے اور ہم عمر لڑکوں کے مضحکہ خیز نام رکھنے کا فن بھی سیکھ لیا تھا۔

کبھی ان کا ممدوح کوئی لڑکا ہوتا اور کبھی کوئی استاد۔ جس کے نتیجے میں اکثر ان کی پٹائی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ یوں انھوں نے ڈیل ڈول بھی خوب نکالا تھا، ورزش کا شوق بھی تھا۔ چنانچہ لڑنے بھڑنے سے ہچکچاہٹ بھی نہ ہوتی تھی۔ کوئی اور نہ ملتا تو بڑے بھائی سے بھی دھول دھپا کر بیٹھتے۔ لیکن یہ سب شرارتیں وقتی ہوتی تھیں اور اُن کی پڑھنے لکھنے کی سرگرمیوں کو کچھ زیادہ متاثر نہ کر پاتی تھیں۔ اس اسکول کی لائبریری سے انھوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور اس زمانے کے مقبول رسالوں کے علاوہ جاسوسی ناولوں، سکھوں کی تاریخی اور مذہبی کتابیں، رامائن اور مہابھارت کی کہانیاں، چہار درویش، گل بکاؤلی، امیر حمزہ جیسی داستانیں تک جن کے تراجم سندھی زبان میں دستیاب تھے، پڑھ ڈالیں۔ سکھ پنتھ کی کہانیاں جو گرونانک سے لے کر گرو گووند سنگھ تک تھیں، ان کی خاص دلچسپی کا مرکز تھیں۔ یہ کہانیاں بتیس جلدوں پر مشتمل تھیں۔ ان میں سکھوں کی پُر جوش جدوجہد کا دلچسپ احوال تھا جن کے پڑھنے سے طبیعت میں جوش پیدا ہوتا تھا۔ اسی طرح لوک کہانیوں کے ذخیرے میں بھی انھیں خصوصی دلچسپی تھی۔ یہاں ان کتابوں کو پڑھنے کے لیے وقت بھی بہت ملا۔ عموماً کلاس روم میں بھی درسی کتابیں پڑھنے کی بجائے کہانیوں کی کتابیں پڑھی جاتی تھیں۔

ابھی قمبر کے اسکول میں تعلیم کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر روچی رام شاہانی ریٹائرڈ ہو گئے۔ روچی رام شاہانی ایک شفیق اور ہر دل عزیز استادِ تھے۔ ان کی جگہ علی گڑھ کے تربیت یافتہ ایک ایسے استاد کا تقرر ہو رہا تھا جن کی سخت گیری کی شہرت ان سے پہلے اسکول میں پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ بزرگوں نے قمبر اسکول سے لاڑکانہ کے گورنمنٹ اسکول میں ان کا تبادلہ کروالیا۔ قمبر کے اسکول سے انھوں نے انگریزی کی چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول لاڑکانہ میں داخلہ سوبھو صاحب کی جنرل نالج اور بالخصوص مذہبی معلومات کی بنیاد پر ہوا تھا۔ چنانچہ یہاں بھی ان کی ذہانت اور مطالعے کی خوب دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اور ہر طرف سے ان کی پذیرائی ہو رہی تھی۔ خاص طور پر انگریزی کے استاد ان پر بہت مہربان تھے اور ان کے شوق مطالعہ کی فراوانی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے سوبھو صاحب کو اپنی ذاتی لائبریری سے کتابیں حاصل کرنے کی اجازت دے رکھی تھی اور اس سہولت سے انھوں نے خوب فائدے اٹھائے اور اور اپنے ذوقِ مطالعہ کو خوب تسکین دی۔ انگریزی ادب کی کلاسیک کی بھی کئی کتابیں یہاں ان کے مطالعے میں آئیں۔ انگریزی کے استاد کی ذاتی دلچسپی بھی ان کے لیے باعثِ حوصلہ افزائی تھی۔ وہ سوبھو صاحب کو ہلکے پھلکے فکشن، ڈرامے اور مضامین پڑھنے کو دیتے تھے اور جہاں کہیں مشکل پیش آتی، ان کی رہنمائی کیا کرتے۔ اس زمانے میں استاد اور طالب علم کا رشتہ صرف کلاس روم تک ہی محدود نہیں ہوتا تھا بلکہ استاد اپنے طالب علم کی رہنمائی کرنے اور اس کی تربیت میں فعال اور صحت مند کردار ادا کرنے کو اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھتا تھا۔ طالب علم میں خفتہ صلاحیتوں کو

بیدار کر کے اس کو درست راستے پر ڈالنا ہی ایک اچھے اور فرض شناس استاد کا کام ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ گورنمنٹ ہائی اسکول لاڑکانہ کے قیام کے دوران انھوں نے اپنی انگریزی کی استعداد کو خاصا مضبوط کرلیا تھا لیکن جب اسکول کے ہیڈ ماسٹر کرم چند ہنگورانی کا تبادلہ لاڑکانہ سے این جے وی (NJV) ہائی اسکول کراچی میں ہوا تو وہ سوبھو جی کو بھی اپنے ساتھ کراچی لے آئے۔ یہ دراصل ایک چھوٹی آب جو سے نکل کر زیادہ تیز اور زیادہ بڑے دریا میں پیراکی کے مترادف تھا۔ بڑے بھائی کیول رام شروع ہی سے پڑھائی میں کم دلچسپی رکھتے تھے لیکن دوسری ایکٹوٹیز وغیرہ میں بہت تیز تھے۔ لاڑکانہ کے گورنمنٹ اسکول میں بھی انھیں داخلہ مشکل ہی سے مل پایا تھا۔ چنانچہ لاڑکانہ سے کراچی جانے کی نوبت آئی تو انھوں نے تعلیم ہی سے دست کش ہونا بہتر سمجھا اور کھیتی باڑی اور کاروباری معاملات میں بابا کے ہاتھ بٹانے کو ترجیح دی۔ سوبھو گیان چندانی ایک طرح سے اپنے بڑے بھائی کیول رام کے اس ایثار کے لیے ہمیشہ مشکور رہے ہیں کہ انھوں نے خود تعلیم حاصل نہ کر کے چھوٹے بھائی کو بہترین تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ اس زمانے میں این جے وی ہائی اسکول، کراچی ہی نہیں بلکہ پورے سندھ کی بہترین درس گاہ شمار ہوتی تھی جہاں بہترین صلاحیت رکھنے والے طلبا و طالبات تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ قدم قدم پر نئے چیلنج اور نئے مقابلے درپیش تھے۔ اس زمانے میں این جے وی اسکول میں ایسے کئی ذہین، پڑھاکو اور تیز طالب علم پڑھ رہے تھے جنھوں نے بعد میں زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی اپنی انفرادیت منوائی اور شہرت و عزت حاصل کی۔ ان ہی لوگوں میں مشہور سندھی ادیب و دانشور لیکھو تلسانی اور ان کے بھائی تلوک تلسانی، منگھا رام ملانی وغیرہ شامل تھے لیکن ان میں سے کم کم لوگوں سے سوبھو صاحب دوستی قائم کر سکے تھے کیوں کہ اپنے آپ میں مگن رہنے کی سرشت یہاں بھی غالب تھی۔ اور وہ یہاں بھی فرصت کے اوقات میں تنہا کسی درخت کے نیچے مصروف مطالعہ رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ این جے وی اسکول کراچی کا دوران کی زندگی کا سب سے اہم دور رہا ہے کہ یہ ان کی شخصیت کے نکھار اور کردار سازی کا دور تھا، اس زمانے میں ان کے فکری رویوں اور رجحانات کی ایک سمت متعین ہونے لگی تھی اور زندگی کی بابت ان کے خیالات میں تنوع، وسعت و گہرائی پیدا ہو رہی تھی۔ سوبھو صاحب کے مزاج میں سنجیدگی، بردباری اور تفکر کے عناصر تو شروع ہی سے کارفرما رہے ہیں لیکن این جے وی ہائی اسکول کے زمانے میں جذباتی سطح پر بھی ایک نوع کا ٹھیراؤ پیدا ہوا ہے۔ دنیا بھر میں پیدا ہونے والے نئے نئے خیالات و تصورات سے بھلا کب تک غافل رہا جا سکتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کی نوجوان نسل میں آزادی کی لگن پیدا ہونے لگی تھی اور ملک کے طول و عرض میں انگریز سامراجیت کے خلاف جاری جدوجہد کی آنچ ان کو بھی گرمانے لگی تھی۔ اس وقت کراچی نہ صرف سندھ کا سب سے اہم شہر تھا بلکہ اسے ہندوستان کی قومی تحریکوں کے ایک مرکز کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ خلافت تحریک کے

زیر اثر مولانا محمد علی جوہر کا مقدمہ بھی اسی شہر میں چلایا گیا تھا جس کی وجہ سے اس شہر کو قومی آزادی کی تحریک میں ایک اہم مقام حاصل ہو چکا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاسی سرگرمیوں نے شہر کے نوجوانوں میں بھی سیاسی شعور پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ کرم چند گاندھی، جواہر لال نہرو، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، محمد علی جناح وغیرہ کے نام اب کسی کے لیے اجنبی نہ رہے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر کرم چند ہنگورانی کی وجہ سے انھیں چندر ما کاشی مندر کے احاطے میں ایک بہت آرام دہ کمرہ رہائش کے لیے حاصل ہو گیا تھا۔ یہ جگہ اسکول سے بھی کچھ زیادہ دور نہ تھی اور کرم چند ہنگورانی کے گھر سے بھی قریب تر تھی جہاں سوبھو صاحب کو آنے جانے کی کھلی آزادی تھی کہ پرنسپل ہنگورانی ایک طرح سے کراچی میں سوبھو صاحب کے سر پرست کا کردار بھی ادا کر رہے تھے۔ اس گھر سے وابستہ خوش گوار یادوں میں پرنسپل صاحب کی دو بھتیجیوں کے حسین چہرے بھی جھلکتے ہیں کہ یہ نٹ کھٹ اور شوخ و چنچل لڑکیاں اکثر ان کے ساتھ معصوم سی شرارتیں کیا کرتی تھیں لیکن یہ ایسے مٹی کے مادھو تھے کہ ہر دفعہ طرح دے کے نکل آتے تھے۔

اس زمانے سے وابستہ یادوں کو قلم بند کرتے ہوئے سندھی کے معروف ادیب لیکھو مل تلسانی جو سوبھو صاحب کے ہم جماعت بھی تھے، لکھا ہے

> ''سوبھو صاحب این جے وی اسکول میں آئے ہیں تو ان کی عمر لگ بھگ پندرہ سولہ برس رہی ہوگی۔ وہ ایک وجیہہ، خوب صورت، گوری چٹی رنگت اور مضبوط کاٹھی والے نوجوان تھے، جس کے رکھ رکھاؤ اور شخصیت میں غیر معمولی کشش تھی۔ اس کی بات چیت کا انداز اور نظم پڑھنے کا طریقہ نہایت مدھر اور دل کش تھا۔''

ایک دن دیکھا تو وہ صبح کی دعائیہ اسمبلی کے بعد میز پر چڑھا، گرو دیو رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور کتاب گیتا نجلی سے ایک انگریزی نظم پڑھ رہا تھا:

"Leave this chanting and Singing and felling of beads"

لیکھو مل تلسانی نے سوبھو جی کی شخصیت پر جو دلچسپ خاکہ لکھا ہے، اس کا خلاصا کچھ یوں ہے:

> ''جب میں سوبھو سے پہلے پہل متعارف ہوا تھا۔ اس کی کھدر کی قمیص، کھادی پتلون اور سر پر کھادی کی سفید ٹوپی مجھے اب تک یاد ہے۔ اس زمانے میں، میں بھی کھدر پوش تھا اور کھدر کی پوشاک پہننے والوں کا شیدائی بھی۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کا دائرہ دن بہ دن وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا تھا۔ نوجوانوں میں گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے اثرات نمایاں تھے۔ چنانچہ خود میرے دل میں جواہر لال نہرو اور گاندھی جی کی شخصیات کے اثرات پڑنے لگے تھے۔ میں سمجھتا ہوں سوبھو کی زبانی گرو دیو کی خوب صورت نظم سننے کے بعد ہی میرے دل میں

ٹیگور کی شاعری سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ وہ اور میں چھٹی انگریزی کلاس میں ہم جماعت تھے۔ وہ کلاس میں پہلی قطار میں بیٹھتا تھا اور میں کلاس کی دوسری تیسری قطار میں بیٹھا کرتا تھا۔ وہ غیر متعلق لوگوں سے کم کم بولنا چاہتا تھا۔ بس ہر وقت اپنے آپ میں مگن رہا کرتا، میں بھی مزاجاً کم سخن واقع ہوا ہوں اور فوراً دوستی گانٹھنے کے ہنر سے بھی واقف نہیں ہوں۔ چنانچہ ہم دونوں کی دوستی میں بھی کچھ وقت لگا تھا۔ آدھی چھٹی (Races) میں بھی وہ اکیلا کسی درخت کے نیچے بیٹھے ''**رسالو شاھ عبداللطيف ڀٽائي**'' (رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی) کا مطالعہ کیا کرتا تھا جو اس وقت ہمارے کورس میں شامل تھا— ہماری دوستی آہستہ آہستہ ہی پروان چڑھی تھی، میں کبھی کبھار اس سے ملنے اور گپ لگانے کاشی مندر کی رہائش گاہ پر چلا جاتا تھا لیکن وہاں جاکر شدید احساس ہوتا کہ جیسے میں مندر میں پوجا پاٹ کرنے آیا ہوں، اس زمانے میں سوبھو بھی ایسے ہی لگتا تھا، جیسے کوئی چھوٹا سا سنت سادھو ہو— ایک دن میں نے اس کے کمرے میں سوامی رام تیرتھ جی کی زندگی پر لکھی ہوئی کتاب دیکھی جو تین چار سو صفحوں پر مشتمل ہوگی۔ سوبھو سے پتا چلا کہ سوامی جی پنجاب کے ایک بہت بڑے اور نامی گرامی سنت ہیں۔ اس وقت تک میں ایک بھی ایسی مہان شخصیت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن ان کی سوانح عمری پڑھنے کے بعد میں نے بھی سوامی رام تیرتھ جی کی تحریروں کا مجموعہ "In the wood of God-Realization" پڑھ ڈالا— اسی سال اسکول کے میگزین میں گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کے بارے میں انگریزی زبان میں سوبھو کا لکھا ہوا ایک زبردست مضمون چھپا تھا۔ پہلے اس نے گرودیو کی نظم سنائی تھی— اور اب ایک پورا مضمون ان پر لکھ دیا تھا جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ میری دانست میں یہ پہلا مضمون تھا جو گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کے بارے میں کسی سندھی نے لکھا تھا۔ بس یہیں سے میرا گرودیو کی شخصیت اور شاعری سے واقفیت کا آغاز ہوتا ہے۔

سوبھو کو مطالعے کا شوق اتنا زیادہ تھا کہ وہ ہر وقت کتابیں پڑھنے میں مصروف دکھائی دیتا تھا۔ کلاس روم میں بھی کوئی نہ کوئی غیر نصابی کتاب پڑھتا رہتا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوتا کہ وہ کوئی ناول پڑھ رہا تھا۔ درسی کتابوں میں اس کی دلچسپی واجبی تھی لیکن وہ کلاس میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھا اور کلاس میں بھی اچھے

نمبر حاصل کرتا تھا۔ حساب میں بہت تیز تھا، انگریزی بھی اچھی لکھ لیتا تھا۔ اس کی دوستی میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ یوں تو مجھے بھی مطالعے کا شوق شروع سے رہا ہے لیکن سوبھو کے مطالعے کی وسعت اور تنوع میرے لیے ایک چیلنج بن گیا تھا اور اس سے دوستی کے ساتھ ساتھ ادب سے لگاؤ میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی صحبت میں کتابوں سے خوب حظ اٹھایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں 'سندر ساہت' اور 'رتن' جیسے معیاری رسالے نکلتے تھے۔ 'سندر ساہت' اردو اور ہندی کی نہایت معتبر اور اہم کتابیں ترجمہ کر کے قسط وار شائع کرتا تھا جن میں منشی پریم چند، سدرشن، اوپندر ناتھ اشک اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کی منتخب تحریریں شامل ہوتی تھیں، اسی طرح ''رتن'' بنگالی ادب کے فن پارے سندھی میں ترجمہ کر کے پیش کیا کرتا تھا جن کے ذریعے ہم نے رابندر ناتھ ٹیگور، شرت چندر چٹرجی، بنکم چندر چٹرجی وغیرہ کے فن پاروں کے لطف اٹھائے تھے۔''

''سن ۱۹۳۷ء میں ہم دونوں نے میٹرک کے امتحان ساتھ ساتھ دیئے تھے۔ سوبھو نے میٹرک اعزاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ حساب میں ستر فی صد نمبر کے ساتھ ڈسٹنکشن (Distinction) حاصل کی تھی۔ انگریزی اور دوسرے مضامین میں بھی بہت اچھے نمبر حاصل کیے تھے حالانکہ سوبھو درسی کتابوں میں کم ہی دلچسپی لیا کرتا تھا اور زیادہ وقت غیر نصابی کتابیں پڑھنے میں صرف کرتا تھا۔''

میٹرک پاس کرنے کے بعد سوبھو گیان چندانی نے ڈی جے سندھ کالج کے شعبۂ آرٹس میں داخلہ لیا، وہاں ان کے مضامین میں فلسفہ، منطق وغیرہ شامل تھے جن میں انھیں ہمیشہ خاص دلچسپی رہی۔ کالج آنے کے بعد انھوں نے اپنی رہائش بھی کاشی مندر سے گاڑی کھاتے کے ایک مکان میں منتقل کر لی تھی۔ لیکھو تلسانی اور ان کے بھائی تلوک تلسانی سے جو دوستی این جے وی ہائی اسکول میں قائم ہوئی تھی۔ اس میں اب مزید گہرائی اور پختگی پیدا ہوئی۔ خاص طور پر لیکھو اور سوبھو کے درمیان روابط ہر قسم کے تکلفات سے آزاد ہوتے چلے گئے۔ ان دونوں کے شوق بھی یکساں تھے، دونوں اچھی کتابیں پڑھنے کے شائق تھے اور اپنے مطالعے کے نتائج سے ایک دوسرے کو باخبر بھی رکھتے تھے۔ دونوں کے مزاج میں فلسفیانہ سنجیدگی اور کرنٹ افیئرز سے باخبری کے رجحانات واضح تھے۔ یہاں تک کہ دونوں کی پسندیدہ شخصیتیں اور ہیرو بھی کم و بیش ایک ہی تھیں۔ دونوں ''گاندھی وادی'' تھے اور دونوں معاصر سیاسی رویوں سے بھی یکساں طور پر متاثر تھے۔ دونوں رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری اور نثر کے گھائل تھے۔ ایسی ہی متعدد یکساں

باتیں تھیں جن پر سوبھو گیان چندانی اور لیکھومل تلسانی کی دوستی کی بنیادیں استوار ہوئی تھیں۔ ڈی جے کالج کا زمانہ بالعموم ان لوگوں کا ساتھ ساتھ ہی گزرا کرتا تھا۔ شام کو یہ تینوں دوست یعنی سوبھو گیان چندانی، لیکھو تلسانی اور تلوک تلسانی وغیرہ صدر کے پرشیئن کافی ہاؤس میں بھی بیٹھنے لگے تھے۔ بعد میں دوسرے سنجیدہ مزاج دوست بھی شریکِ محفل ہونے لگے تھے جہاں مختلف موضوعات پر گرما گرم بحث ہوا کرتی تھی۔ ان ہی محفلوں میں شانتی نکیتن کی بابت بھی تبادلہ خیال ہوا کرتا تھا اور بالعموم خیال کیا جاتا تھا کہ یہ گویا کوئی آشرم ہوگا جہاں لوگ داخل ہو کر مخصوص طرزِ حیات میں زندگی بسر کرنا سیکھتے ہوں گے۔ خاص طور پر لیکھو تلسانی کے ذہن پر شانتی نکیتن کا رومانی تصور چھایا رہتا تھا۔

چنانچہ انھوں نے چھٹی کلاس ہی میں رابندر ناتھ ٹیگور کو خط لکھ ڈالا تھا۔ جس میں اپنی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ وہ کچھ مدت کے لیے شانتی نکیتن کے آشرم میں رہنے کے خواہش مند ہیں تا کہ وہاں رہ کے وہ گرودیو کے نکتہ نظر، اسلوبِ حیات اور آدرش سے آگاہی حاصل کرسکیں۔ اس خط کے جواب میں انھیں ٹیگور کے سکریٹری کا خط موصول ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ شانتی نکیتن آشرم کی بجائے ایک باقاعدہ درس گاہ ہے جس میں داخلے کے کچھ معیار اور اصول ہیں۔

انٹر پاس کرنے کے بعد لیکھو تلسانی کے جی میں یہ ہُوک ایک مرتبہ پھر اُٹھی اور انھوں نے سوبھو سے بھی اپنی خواہش کا تذکرہ کیا۔ یہاں سوبھو خود شانتی نکیتن جانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے شانتی نکیتن کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ شانتی نکیتن میں صرف ان ہی صاحبِ استعداد طالب علموں کو داخلہ مل سکتا ہے جو ان کے مقرر کردہ معیار پر پورے اترتے ہوں اور داخلے کے لیے ہونے والے تحریری امتحان میں کامیابی حاصل کر سکتے ہوں۔ یہ صورتِ حال سوبھو صاحب کے لیے قابلِ قبول نہ تھی، اس لیے انھوں نے فوری طور پر شانتی نکیتن کے پرنسپل کو ایک تار دیا جس میں اپنے تعلیمی کوائف بھی لکھے اور رابندر ناتھ ٹیگور اور شانتی نکیتن سے ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا اور درخواست کی کہ اس داخلہ کے لیے ان کو تحریری ٹیسٹ کی شرط سے مبرا کر دیا جائے اور انھیں ان کی ذاتی استعداد کے بنا پر داخلہ دے دیا جائے۔ یہ محض ان کی خوش قسمتی ہے کہ وہاں سے جواب اثبات میں موصول ہوا کہ:

> You are admitted. Join the College term on 19th June 1939 and contact our representative at Karachi. They will arrange for your group travel at half the railway fare to Shanti Niketan.

بعد میں معلوم ہوا کہ داخلے کی منظوری خود ٹیگور نے دی ہے۔

سوبھو صاحب نے جب گھر والوں کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا تو ابتدا میں ان کے چاچا نے اس تجویز کی مخالفت کی کہ شانتی نکیتن بہت دور واقع ہے اور اتنی کم عمری میں انھیں گھر سے اتنی دور جانے کی اجازت نہیں مل سکتی لیکن ان کے اٹل ارادے کے سامنے یہ مخالفت بھی بالآخر تائید میں تبدیل ہوگئی اور وہ شانتی نکیتن جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ انھیں معلوم ہوا کہ لاڑکانہ کی تیس لڑکیاں اور دو لڑکے پہلے ہی شانتی نکیتن میں پڑھتے ہیں اور اس سال بھی دو لڑکیاں لاڑکانہ سے عازمِ شانتی نکیتن ہوں گی۔ پروگرام کے مطابق ان سب کو کراچی میں جمع ہونا تھا اور بذریعہ ٹرین براستہ لاہور، سہارن پور، بردوان، کیول پور، بول پور اسٹیشن پہنچنا تھا جو شانتی نکیتن کا اسٹیشن تھا۔ یہ دلچسپ سفر بذاتِ خود ایک اہم تجربہ تھا جس نے سوبھو صاحب اور ان کے رفیقوں کو زندگی کے وسیع تر منظر نامے سے دو چار کر دیا تھا۔

شانتی نکیتن

تین چار دن کے طویل اور تھکا دینے والے مگر بھیدوں بھرے یادگار سفر کے بعد کلکتہ ایکسپریس بالآخر بردوان ریلوے جنکشن پر پہنچ گئی، یہ کوئی نصف شب کا وقت ہوگا اور یہاں سے ایک اور ٹرین کے ذریعے بول پور ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا تھا، جہاں سے شانتی نکیتن دو ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ ان یادگار لمحوں کو یاد کرتے ہوئے سوبھو صاحب نے بتایا کہ جس وقت ہماری ٹرین بول پور اسٹیشن پہنچی ہے تو وہ صبح کاذب کا سماں تھا۔ ہر طرف گھنے درختوں کی قطاریں تھیں جیسے دور دور تک سبز مخمل اور بانات کے شامیانے تنے ہوئے ہوں۔ اَن گنت چڑیوں اور بے شمار پرندوں کی چہچہاہٹ اور گونجار نے فضا میں طلسماتی موسیقی بکھیر دی تھی۔ سپیدۂ سحری آہستہ آہستہ پورے منظر کو اُجال رہا تھا۔ ہم سب قدرت کی صناعی پر مبہوت تھے۔ غالبًا ایسے ہی کسی منظر کو دیکھ کر جوش ملیح آبادی نے کہا ہوگا:

ہم ایسے حسن پرستوں کو قبولِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

سوبھو صاحب نے شانتی نکیتن میں اپنی آمد کو یاد کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ہمارے قافلے میں اس وقت تیس لڑکیاں اور صرف چند لڑکے شامل تھے۔ اسٹیشن پر شانتی نکیتن کی طرف سے خیر مقدم کرنے والا اسٹاف موجود تھا۔ ہم سب کالج کی بس میں سوار ہو کر جب شانتی نکیتن کی حدود میں داخل ہوئے تو ہر طرف سے طرح طرح کی موسیقی، راگ راگنیوں اور سازوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ کہیں کوئی بنگالی راگ آلاپ رہا تھا، کہیں سے ہندی بھجن کی مدھر تانیں

بلند ہو رہی تھیں۔ کہیں کسی کونے سے ستار کی جھنکاریں سنائی دیتی تھیں تو کہیں تان پورے کی نغماتی آوازیں کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ معلوم ہوا پاس ہی ''کلا بھون'' کی عمارت ہے جہاں سے رقص و موسیقی کی رنگ برنگی آوازیں آ رہی تھیں۔ کہیں طبلے کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی چھم چھم میں کوئی رقاص رقص کی مشق کر رہا تھا، تو کہیں کوئی گائیک سُر تال کی الاپ سے موسیقی کے ریاض میں مصروف تھا۔ ہر طرف ایک گمبھیرتا اور شانتی کا دور دورہ تھا۔ ہر چند ہم سب بہت تھکے ہوئے تھے لیکن شانتی نکیتن نے ہمیں خاص طور پر مجھے اپنے سحر میں لے رکھا تھا۔ بس یہی لگتا تھا کہ میں اپنے خوابوں کی جنت میں آ گیا ہوں۔ اور ایک ذرا آرام کرنے کے بعد میں دن بھر ادھر اُدھر گھوم پھر کر خود کو ماحول سے آشنا کرتا رہا— ہم لوگ کالج ٹرم شروع ہونے سے پہلے پہنچے تھے۔ کالج کی کلاس تو خیر ابھی شروع بھی نہ ہوئی تھیں، ہوسٹل میں بھی سناٹا تھا۔ بس ہم لوگ تھے یا ہماری طرح دور دراز سے آنے والے اکا دُکا دوسرے طالب علم تھے جو کالج کھلنے سے چند روز قبل پہنچ گئے تھے۔ دن تو خیر جوں توں گزر گیا لیکن رات کے سناٹے میں گھر کی یاد اور تنہائی کے احساس نے مجھے ایسا دبوچا کہ میں ایک دم اداس ہو کر رہ گیا۔ اور یہ سوچ سوچ کے دل پر بوجھ بڑھتا چلا گیا کہ بھلا اس نامانوس جگہ میں دن کیوں کر کٹیں گے؟ یہاں نہ تو آس پاس سندھی بولنے والا کوئی دکھائی دیتا ہے اور نہ اپنے گوٹھ گاؤں کا ماحول نصیب ہوگا۔ رات گئے تک گھر کے ایک ایک فرد کی یاد آتی چلی گئی۔ یار بیلی، دوست احباب، کون تھا جو اس سمے یاد نہ آیا ہو اور جس کی یاد میں آنکھیں نم نہ ہوئی ہوں۔ جی میں رہ رہ کر نئے نئے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ اور میں سوچنے لگا تھا کہ ایسے غیر مانوس ماحول میں رہنے سے بہتر ہے کہ میں واپس چلے جاؤں اور لیکھو تلسانی کی طرح کراچی میں داخلہ لے لوں لیکن یہ گم راہ کن خیال جس تیزی اور شدت سے پیدا ہوا تھا، اتنی ہی آسانی کے ساتھ ختم بھی ہو گیا۔''

سوبھو صاحب نے اپنی اس اداسی کا تذکرہ کرتے ہوئے مزید لکھا ہے:

''اس موقعے پر، ہم سفر لڑکیوں نے بہت دلاسا دیا۔ خاص طور پر لاڑکانہ کی سندری کشن چند شیوداسانی نے جو گورنمنٹ اسکول لاڑکانہ میں بھی ساتھ پڑھ چکی تھی، میرا بہت حوصلہ بڑھایا۔ اس نے بتایا چونکہ ابھی کالج کھلنے میں دو چار

دن باقی ہیں، اس لیے اکثر لڑکے لڑکیاں کلکتہ گھومنے پھرنے چلے گئے ہیں اور دو چار دن میں کالج کھل جانے پر وہی رونقیں واپس لوٹ آئیں گی اور ایسا ہی ہوا بھی، کہ جیسے جیسے شانتی نکیتن میں ٹرم کے آغاز کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی، ویسے ویسے طالب علم گروہ در گروہ چلے آ رہے تھے۔ ہوسٹل کی رونق بحال ہو چلی تھی۔ ہندوستان کے ہر علاقے کے لڑکے اور لڑکیاں اپنی اپنی زبانیں اور اپنے اپنے طور طریقوں کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ جہاں مدراس، کیرالا اور تلگو بولنے والے لڑکے لڑکیاں تھیں، وہیں پشتو اور کشمیری طالب علم بھی موجود تھے۔ بنگالیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی لیکن مرہٹی، گجراتی، نیپالی، اودھ، بہار، یوپی، سی پی، پنجاب اور حیدر آباد دکن کے لڑکے لڑکیاں بھی دکھائی دیتے تھے۔ سندھ ہی کے تین درجن کے لگ بھگ طالب علم تھے جن میں لڑکیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ بیرونِ ہند سے آنے والوں میں انڈونیشیا، ملایا، فلپائن، برما، افریقی، یوروپی، جاپانی اور چینی بھی دکھائی دے جاتے تھے۔ غرض اچھی خاصی بین الاقوامی درس گاہ تھی جس میں ہر رنگ، نسل اور مذہب کے ماننے والے ایک مخصوص نصاب کے ذریعہ حصولِ علم کی چاہ میں شانتی نکیتن چلے آئے تھے۔ دراصل 'شانتی نکیتن' کا قیام ایک ایسے طرزِ فکر اور اسلوبِ حیات کی ترویج کے لیے عمل میں آیا تھا جس کی بنیادیں بین الاقوامیت، سیکولرازم، جدید سائنسی اندازِ تعلیم، عالمی انسانی برادری، امن و شانتی اور فطرت دوستی جیسے اہم تصورات پر استوار تھیں۔ یہاں مذہبی، قومی، جغرافیائی، لسانی اور گروہی تعصبات کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ یہ بنارس کی ہندو یونی ورسٹی اور علی گڑھ کی مسلم یونی ورسٹی سے مختلف درس گاہ تھی، جہاں فکری اور عملی پہل کاری کے لیے نسبتاً زیادہ آزاد اور لبرل ماحول نصیب تھا۔ ایک مخصوص اسلوبِ حیات اور اندازِ فکر جن پہ کلاسیکل ہندوستانیت بلکہ بنگلہ کلچر کی چھاپ لگی تھی، یہاں کی شناخت تھی۔''

گہوارۂ امن

شانتی نکیتن جس کے معنی ہیں ''گہوارۂ امن''، اس کا قیام پہلے پہل رابندر ناتھ ٹیگور کے والد مہارشی دیبندر ناتھ ٹیگور نے ۱۸۱۳ء میں ایک آشرم (عبادت گاہ) کے طور پر قائم کیا تھا جہاں لوگ کچھ عرصے قیام کر کے اپنے اپنے عقیدے کے مطابق تزکیۂ نفس کیا کرتے تھے۔ بعد میں رابندر ناتھ ٹیگور نے اس مقام

پر ایک برہمو ودیالہ (اسکول) بنا دیا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں ٹیگور نے اس مقام سے قریب ہی موجودہ درس گاہ کے قیام کی بنیاد رکھی جسے بعد میں ''وشو بھارتی یونی ورسٹی'' کے نام سے ایک عالمی درس گاہ کی حیثیت حاصل ہوئی لیکن اس کی شہرت 'شانتی نکیتن' کے قدیم نام ہی سے پھیلی۔ ٹیگور نے اس درس گاہ کو ہندوستان کی قدیم تاریخی درس گاہوں کے انداز میں منظم کرنا چاہا تھا جہاں طالب علم کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے علمی و جذباتی کردار کو بھی نکھارا جاتا تھا اور جہاں مشرق کی بہترین فکری و اخلاقی روایات کے ساتھ ساتھ مغربی فلسفے، تاریخ اور سائنسی افکار کو بھی پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ ''وشو بھارتی یونی ورسٹی'' ایک عالمی درس گاہ اور دانش کدہ تھی جہاں قدیم و جدید علوم و فنون، تاریخ و تمدن، فلسفے اور منطق، تحقیق و تنقید، لسانیات و عمرانیات، سائنس اور ٹیکنالوجی، درس و تدریس کے بابت مختلف اور متنوع شعبے اور ادارے قائم تھے جن میں تعلیم پانے کے لیے دنیا بھر سے طالب علم شریک ہوا کرتے تھے۔ فائن آرٹس کے کم و بیش تمام ہی شعبے سرگرم عمل تھے۔ جن میں فن مصوری، سنگ تراشی، مجسمہ سازی، سنگیت، رقص، ناٹک اور تمثیل کو منفرد اہمیت حاصل تھی۔

''وشو بھارتی یونی ورسٹی'' کے نصاب (Curriculum) میں پرفارمنگ آرٹس کے تمام شعبوں کو غیر معمولی اہمیت نے اس کو ہندوستان کی دوسری درس گاہوں سے کہیں زیادہ ممتاز بنا دیا تھا۔ جس طرح یہاں دنیا بھر کے طالب علم کھنچے چلے آئے تھے۔ اسی طرح پڑھانے والوں کی ٹیم بھی عالمی شہرت یافتہ اساتذہ پر مشتمل تھی جنھیں یوروپ و امریکا اور ایشیا کی دانش گاہوں سے منتخب کیا جاتا تھا۔ شانتی نکیتن سے کچھ فاصلے پر ٹیگور کا قائم کردہ ایک اور ادارہ 'سری نکیتن' واقع ہے جہاں دیہی تعمیر نو، زرعی معیشت و معاشرت، صحت و سماجی بہبود، قدیم صنعت و حرفت اور فنون سے متعلق تحقیقی ادارے کام کرتے تھے۔ ان ہی اداروں میں ایک بہت بڑا کیٹل فارم اور اس سے وابستہ ڈیری فارمنگ کی تجربہ گاہیں بھی قائم تھیں، جہاں سندھ کی سرخ جلد والی گائیں بھی موجود تھیں۔

ہر شعبۂ علم سے متعلق کالج، اسکول، درس گاہیں اور ہوسٹل الگ الگ واقع ہوئے تھے۔ وسیع و عریض کھیل کے میدان و ورزش گاہیں، باغ باغیچے موجود تھے۔ یہ سب ادارے کئی میلوں میں پھیلے ہوئے تھے جنھیں پاپیادہ گھوم پھر کر دیکھ لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔

یہ بات درست ہے کہ شانتی نکیتن کی تہذیبی فضا پر گرو دیو رابندر ناتھ ٹیگور کے اسلوب فکر اور شخصیت کے بہت گہرے نقوش رہے ہیں، جس طرح مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ پر سرسید احمد خاں اور ہندو یونی ورسٹی بنارس پر مدن موہن مالویہ کے فکری اثرات رہے ہیں۔

شانتی نکیتن میں سوبھو صاحب کو ہندوستان کے معروف سیاسی و سماجی رہنماؤں اور علمی و ادبی شخصیتوں کو قریب سے دیکھنے اور سننے کے مواقع ملے۔ ان میں عالمی شہرت کے لوگ بھی تھے، راجے مہاراجے،

مشہور ادیب، فلسفی اور دانشور بھی۔ وہاں آئے دن کوئی نہ کوئی مشہور آدمی کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں آتا تھا۔ کبھی کوئی صرف گرو دیو رابندر ناتھ ٹیگور کے درشن کرنے حاضری دیتا تھا اور کسی کو یونی ورسٹی انتظامیہ والے کسی خاص موضوع پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کرتے تھے۔ سوبھو صاحب کے پاس مہاتما گاندھی اور کستوری بائی کی ایک ملاقات کا فوٹو گروپ محفوظ ہے۔ جواہر لال نہرو، لکشمی پنڈت، مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد اور جوش ملیح آبادی وغیرہ اکثر و بیشتر آتے رہتے تھے۔ ان ہی لوگوں میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ رہنما پنا لال داس گپتا کا نام بھی شامل ہے جن سے ملاقات کے بعد سوبھو صاحب کے فکری و عملی رجحان تبدیل ہو کر رہ گئے اور ان ہی کی ایما اور مشاورت پر سوبھو صاحب نے ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ کے مقام پر آل انڈیا اسٹوڈنٹس کانگریس کی کل ہند کانفرنس میں طلبا کے ایک وفد کے ساتھ شرکت کی تھی۔ اس کانگریس میں شریک ہو کر سوبھو صاحب نے معروضی حالات، سیاست اور جنگِ آزادی ہند کی بابت ایک نیا وژن حاصل کیا تھا۔ اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ اگر ہندوستان کی طلبا تنظیمیں متحد ہو جائیں تو وہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں غیر معمولی اور فعال کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اور سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کو بھی مجبور کر سکتی ہیں کہ وہ محض ذاتی، گروہی اور طبقاتی مفادات کی خاطر عوامی اور قومی مفادات کے خلاف سودے بازی کا طریقہ نہ اختیار کر سکیں۔ اس زمانے میں ہندوستان کی طلبا تحریک پر مجموعی طور پر بائیں بازو کے اثرات تھے لیکن اس کے ایک بڑے حصے پر کانگریسی سیاست کی چھاپ بھی موجود تھی۔

شانتی نکیتن جانے کی بابت اپنی یادداشت تازہ کرتے ہوئے سوبھو صاحب نے مزید لکھا ہے وہاں جانے سے قبل مجھ میں ایک قسم کی رومانیت کا غلبہ تھا۔ چند ماہ بعد ہی شانتی نکیتن اور ٹیگور کی بابت رومانیت کم ہوتی گئی۔ یہ خیال کہ شانتی نکیتن صرف رومان پسند، خواب دیکھنے والوں اور لوٹس ایٹر (Lotus eater) کی جنت ہے جہاں آدمی فطرت سے لو لگاتے ہی آس پاس کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے ''مکتی'' پالیتا ہے، ایسا درست نہیں ہے۔ بے شک وہاں کا طریقِ تعلیم عام رواجی طریقوں سے مختلف تھا، وہاں طالب علم کو نصابی کتب کے ڈھیر تلے دبا دینے کی بجائے اس میں حصولِ علم کا شوق پیدا کر دیا جاتا اور ایسی نخل کاری کر دی جاتی تھی جو وقت اور مطالعے کے ساتھ ساتھ برگ و بار لاتا ہے۔ شانتی نکیتن میں طالب علم کی شخصیت سازی پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ علم پرور، حسن افروز اور جمالیاتی ذوق کو ابھارنے والے ماحول میں آدمی ایک مخصوص طرزِ زندگی کو پسند کرنے لگتا ہے جس میں سادگی اور فطرت پسندیت کو بہت دخل ہوتا ہے۔

ہندوستان کے قدیم ثقافتی مظاہر کو شانتی نکیتن کی فضا میں خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ وہاں اس دور میں بھی جب ہندوستان آزادی کے پُر جوش نعروں سے گونج رہا تھا اور برطانوی سامراج کے خلاف ہر قسم کی تحریکیں عروج پر تھیں، بالعموم سیاسی موضوعات پر گفتگو کم کم ہوتی تھیں۔ سوبھو صاحب ''سوراج'' اور

آزادیٔ ہند کے پُرجوش حامی تھے۔ اس لیے انھیں اپنے اس جذبے کی تسکین کے لیے شانتی نکیتن سے باہر دوستیاں تلاش کرنی پڑیں۔

''دی مین فرام موہنجودڑو''۔ ٹیگور

سوبھوجی نے گرودیو رابندرناتھ ٹیگور سے اپنی پہلی ملاقات کے احوال سناتے ہوئے بتایا:
''ابھی شانتی نکیتن میں تیسرا چوتھا دن ہی تھا، لڑکے لڑکیاں چھٹی سے واپس آنے شروع ہوگئے تھے۔ ہر طرف ایک چہل پہل کا سماں پیدا ہوچلا تھا۔ سوبھو صاحب کو ایک روز پرنسپل انیل کمار نے جو گرودیو ٹیگور کے پرسنل سیکریٹری بھی تھے، طلب کیا۔ اور انگریزی میں پوچھا، ''کیا تم ہی وہ لڑکے ہو جو موہن جو دڑو، لاڑکانہ سے آئے ہو؟'' میں نے بھی انگریزی ہی میں جواب دیا، ''یس سر، میں ہی وہ لڑکا ہوں جس کو آپ نے ازرہِ مہربانی بغیر ٹیسٹ کے داخلہ دیا ہے۔''
اس پر وہ بولے، ''تم پہلے لڑکے ہو جسے گرودیو کے حکم پر اس طرح ٹیلی گرام کرکے بلوایا گیا ہو، کیوں کہ گرودیو جہاں کہیں علم کی سچی طلب دیکھتے ہیں، اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ میں تمھیں جلد گرودیو سے ملاؤں گا، کیا تم گرودیو سے ملنا چاہوگے۔''

یہ تو ان کی سب سے اہم اور قدیم خواہش تھی۔ چنانچہ دوسرے دن طے شدہ پروگرام کے مطابق پرنسپل انیل کمار چندر، سوبھوجی کو گرودیو سے ملانے لے گئے۔ یہ وہاں کا رواج تھا کہ گرودیو ہر سال نئے داخل ہونے والے چند منتخب طلبا و طالبات سے جن کا تعلیمی ریکارڈ غیر معمولی ہوتا تھا یا ان میں کوئی دوسری غیر معمولی خوبی ہوتی تھی، ملاقات کرتے تھے۔ سوبھو صاحب چودہ پندرہ برس کی عمر ہی سے ''ٹیگوریت'' کے اسیر تھے۔ وہ زمانہ تھا بھی ٹیگور کی شہرت کا۔ اس شہرت کو مزید استحکام نوبیل انعام کے حصول نے بخشا تھا۔ گویا ٹیگور کی شخصیت کے گرد رومانیت کا ایک سنہری ہالہ موجود تھا جو ہر سنجیدہ اور رومان پسند نوجوان کے لیے باعث کشش ہوتا ہے۔ چنانچہ سوبھو گیان چندانی بارہ تیرہ برس کی عمر تک گرودیو کی کم و بیش سندھی میں دستیاب تمام تحریریں پڑھ چکے تھے۔ گیتا نجلی کا ترجمہ بھی نہ صرف ان کی نظر سے گزر چکا تھا بلکہ اس کے کچھ حصے انھیں ازبر بھی ہوچکے تھے۔ انھوں نے پندرہ برس کی عمر میں رابندرناتھ ٹیگور پر ایک مضمون لکھا تھا جو ۱۹۳۹ء کے سالانہ کالج میگزین میں شائع ہوا تھا۔ اس پس منظر میں گرودیو سے پہلی ملاقات ان کی زندگی کا اہم واقعہ تھا۔

سوبھو صاحب نے اس ملاقات کو یاد کرتے ہوئے بتایا:

''گرودیو اس وقت اسی بیاسی برس کے رہے ہوں گے۔ ایک نیچی سی آرام کرسی پر بیٹھے بلکہ نیم دراز تھے۔ درمیانے قد کے منحنی سے آدمی تھے۔ جوانی میں شاید اچھا قد کاٹھ رکھتے ہوں۔ انھوں نے تمام زندگی عملی سرگرمیوں میں گزاری تھی۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ محنتی اور پھرتیلے بھی رہے ہوں گے۔ اس وقت تو بڑھاپے کے آثار نمایاں تھے، آواز بھی دھیمی تھی۔ سفید براق دھوتی، سفید بنگالی کرتا اور پاؤں میں بنگلہ چپل۔ وہ انتہائی سادگی کا نمونہ تھے۔ ایک طرف چھوٹی تپائی پر چند کاغذات کے پلندے تھے، دوسری طرف کی میز پر کتابیں اور رسائل ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔''

پرنسپل انیل کمار چندا نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا:

''یہ لڑکا موئن جو دڑو کے قریب ایک گاؤں سے آیا ہے، اس کا نام سوبھو گیان چندانی ہے۔''

گرودیو نے مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا مگر موئن جو دڑو کا نام سن کر اک دم چونکے اور بولے:

''اچھا اچھا موئن جو دڑو۔ آہ! تمھارے ظالم لوگوں نے ہمارے ایک نہایت قیمتی آدمی کو قتل کر دیا ہے۔''

ان کی آواز میں غم کی لہر اس وقت بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔ یہ صورت حال میرے لیے انتہائی غیر متوقع تھی اور میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ گرودیو کس شخص کی بات کر رہے ہیں جسے سندھیوں نے قتل کر دیا ہے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ گرودیو کا اشارہ بنگال کے عالمی شہرت یافتہ اور نہایت قابل ماہر آثار قدیمہ اور انتھرپولوجسٹ، محقق اور ریسرچ اسکالر، آر سی موجمدار کی طرف ہے جنھوں نے موئن جو دڑو کے علاوہ وادی سندھ کے دوسرے آثار قدیمہ کی دریافت، کھدائی اور تحفظ کے بارے میں بھی بے مثال اور گراں قدر، خدمات انجام دی تھیں۔ اور جنھیں ۱۹۳۹ء میں سندھ کے ایک دہشت گرد ڈاکو عبدالرحمٰن بروہی نے قتل کر دیا تھا۔ میں چپ رہا، بھلا کیا کہتا؟ گرودیو کچھ دیر خاموش رہے اور پھر دھیمے لہجے میں بولے:

''میں تمھیں دوش نہیں دیتا ہوں اور نہ سندھیوں کو بہ حیثیت قوم ملزم قرار دیتا ہوں لیکن میرا خیال ہے آج کل سندھ میں بدامنی اور منافرت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ سندھ ہمیشہ سے ایک پُرامن معاشرہ رہا ہے لیکن ادھر وہاں کی جو خبریں اخبارات میں شائع ہو رہی ہیں، وہ تشویش ناک ہیں۔''

گرودیو کے اُس تاثر میں ایک طرح کی صداقت تھی کیوں کہ سکھر کی مسجد منزل گاہ کی بابت جو ہندو مسلم فساد ہوا تھا، اس نے ملک گیر پیانے پر سندھی معاشرے کو بدنام کرڈالا تھا۔ گرودیو نے اس کے بعد میرا نام ''شوبھوگیان چندانی فرام موئن جودڑو'' دہرایا۔ اور پھر کہنے لگے:

''آج سے میرے نزدیک تمھارا نام،

''The man from Moen-jo-Daro'' ہوگا''

یہ میرے لیے ایک اعزاز تھا اور میں بہت جلد شانتی نکیتن میں ''اے مین فرام موئن جودڑو'' کے نام سے معروف ہوگیا۔ ہماری یہ گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی اور میرا خیال ہے، گرودیو نے میرے لب و لہجے اور خوداعتمادی کو پسند کیا تھا۔ کہنے لگے:

''تمھیں اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں خصوصی طور پر دلچسپی لینی چاہیے اور اگر کبھی کوئی مسئلہ ہو تو مجھے ملنے سے مت ہچکچانا۔''

اس کے بعد گرودیو نے ایک اور ملاقات میں کہا:

''سندھیوں نے شانتی نکیتن کو دو قابلِ قدر تحفے بھیجے ہیں، ایک تو سندھ سے برآمد کردہ سرخ رنگ کی گائیں ہیں جو کیٹل فارمنگ میں گایوں کی صحت، افزائش اور دودھ کی خوبی کے لیے بہترین مثال قرار دی جاسکتی ہیں۔ ہمارے فارم کو ان سے بہت فائدے پہنچے ہیں، دوسرے سندھ سے آنے والی لڑکیاں ہیں جو خوب صورت اور جاذبِ توجہ ہونے کے ساتھ، بہت ذہین اور محنتی ہیں اور اپنی تعلیم کے ساتھ فائن آرٹس، رقص، سنگیت اور موسیقی میں بھی عمدہ کارکردگی کی مثال قائم کرتی ہیں۔''

سوبھو صاحب نے گرودیو سے اپنی ایک اور ملاقات کا احوال بھی سنایا جو قدرے Tense اور کشیدہ ماحول میں ہوئی تھی۔ انھوں نے بتایا:

''ابھی ہمیں شانتی نکیتن میں آئے ہوئے چار چھ ماہ ہی ہوئے ہوں گے اور میں نے نصابی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا شروع کردیا تھا۔ اس وقت میں ایک ایسے اسٹڈی سرکل کا نہ صرف سرگرم رکن تھا، بلکہ جوائنٹ سیکریٹری بھی تھا جس میں انگریزی، روسی، فرنچ اور جرمن ادب کی منتخب کتابیں پڑھی جاتی تھیں اور ان پر بحث مباحثے ہوا کرتے تھے۔ ہمارے اساتذہ بھی ان مباحثوں میں شرکت کرتے تھے۔ میرا انگلش لب و لہجہ بھی ٹھیک ٹھاک تھا اور حافظہ بھی بہت اچھا نصیب ہوا تھا۔ مجھے مطالعے کا شوق بھی دیوانگی

کی حد تک تھا۔ چنانچہ کالج کے لڑکوں اور اپنے استادوں کے درمیان مجھے جلد ہی اچھی شہرت حاصل ہوگئی تھی — جنوری ۱۹۴۰ء میں، میں اپنے ہوسٹل کا وارڈن مقرر کیا گیا تھا۔ اس وقت مجھے ہوسٹل کے طلبا میں کسی قدر بے چینی کا احساس ہوا۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ کالج اور ہوسٹل کے طلبا ۲۶ یا ۲۷ر جنوری کو یومِ آزادی کے سلسلے میں ایک جلسہ کرنا چاہتے ہیں جو دراصل ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا کانگریس کے لاہور اجلاس میں پاس کی گئی ''قراردادِ آزادیِ ہند'' کی یاد میں ہر سال منعقد ہوتا ہے جس میں طلبا کے علاوہ قومی آزادی کے رہنماؤں کو بھی مدعو کیا جاتا رہا ہے لیکن اب چند برسوں سے ''گرودیو'' نے اس جلسے پہ پابندی لگا دی ہے۔ اس وقت سوراج کی تحریک عروج پر تھی اور طلبا ہر قیمت پر اس یادگار دن کو منانا چاہتے تھے اور وہ اب مجھے اپنا رہنما بنا کر کالج کے پرنسپل صاحب سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں نے پرنسپل سے ملاقات کر کے انھیں طلبا کے جذبات سے آگاہ کیا۔ انھوں نے بتایا چونکہ اس جلسے پر گرودیو نے پابندی لگا دی ہے، اس لیے ان کی اجازت کے بغیر جلسے کا انعقاد ممکن نہیں۔ ہم نے کہا آپ گرودیو سے بات کرلیں اور انھیں طلبا کے جذبات سے آگاہ کردیں کہ وہ اس سلسلے میں کسی پابندی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں اور اگر انھیں جلسہ کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ بغیر اجازت ہی جلسہ منعقد کرنے پر مجبور ہوں گے۔ پرنسپل نے نہ صرف گرودیو سے بات کی بلکہ ان سے میری مختصر ملاقات بھی کروا دی۔ گرودیو نے کہا کہ ''وہ خود سوراج کی تحریکوں کے حق میں ہیں، لیکن انھوں نے کالج میں سیاسی جلسے جلوسوں پر صرف اس لیے پابندی لگائی ہے کہ کالج کے طلبا کو پولیس کی پکڑ دھکڑ اور خاص طور پر خفیہ ایجنسیوں کی دہشت گردی سے محفوظ رکھا جائے چونکہ اخبارات عالمی جنگ کی خبروں سے بھرے ہوئے ہیں اور حکومتی ادارے نقضِ امن کی معمولی سی بات کو بھی نظرانداز نہ کریں گے۔ اس لیے اگر تم لوگ بہ ضد ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر شانتی نکیتن کے اندر نظم و ضبط اور امن وامان کی ذمہ داری تمھاری ہوگی۔ میں نے گرودیو کو سب کی طرف سے یقین دلا دیا کہ طلبا کوئی ایسی حرکت نہ کریں گے جو ہماری درس گاہ کے لیے باعثِ ندامت ہو۔

اس کے بعد آزادی کا جلسہ خوب دھوم دھام سے ہوا۔ صبح سات بجے prayer ہوتی تھی جس میں ایک استاد نے بنگلہ زبان میں بڑی جوشیلی تقریر کی جس نے

طلبا کے جوش و خروش کو مزید بھڑکا دیا۔ آخر پروگرام کے مطابق شام کو لیکچر ہال میں باقاعدہ جلسہ منعقد ہوا جس میں متعدد طلبا و طالبات اور استادوں نے بنگالی، ہندی اور انگریزی میں ہندوستان کی آزادی کے حق میں پُر جوش تقریریں کیں۔

اس جلسے میں دنیا بھر کی قومیتوں کے لوگ موجود تھے۔ ان میں سے کچھ پڑھنے والے طالبِ علم تھے، کچھ پڑھانے والے اساتذہ۔ آخر میں، میں نے طلبا کے اصرار پر پانچ سات منٹ انگریزی میں تقریر کی اور ہندوستان کی مکمل آزادی اور سوراج کی قومی تحریک کے مقاصد کو اجاگر کیا۔ میری تقریر کو طلبا کے علاوہ غیر ملکی طلبا و اساتذہ نے بطور خاص پسند کیا۔ یہ میری اوّلین تقریر تھی جو میں نے کسی بڑے جلسے میں کی تھی، جلسے کے آخر میں جب پسینے سے شرابور میں اسٹیج سے اترا تو آسٹریلیا سے آئے ہوئے ایک استاد میرے پاس آئے اور مجھے تقریر کی مبارک باد دی۔ اس دن کے بعد کئی چینی، جاپانی اور امریکن نیگرو اسٹوڈنٹس بھی میرے فین بن گئے۔

تیسرے دن لائبریری سے باہر نکل رہا تھا تو ایک سانولے رنگ کے بزرگ جنھوں نے کھدر کے کپڑے اور صدری پہنی ہوئی تھی، میرے قریب آئے اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا، ''شوبولو (Well done)۔'' وہ بنگالی میں کہہ رہے تھے، ''سندھی ہو کر بنگالیوں کو جگانے آئے ہو۔'' لوگوں نے بتایا وہ بنگال کے عظیم پینٹر اور قوم پرست نندلال بوس تھے، ان کی آشیرواد میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا جس پر میں آج بھی فخر کرتا ہوں۔''

لیکن اس جلسے اور تقریر کے کچھ اور نتائج بھی سامنے آئے جس کا علم بعد میں ہوا۔ ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ سوبھو صاحب کو پرنسپل نے اپنے دفتر میں بلوایا اور بتایا:

''تمھارے بارے میں انٹیلی جنس والوں کی چٹھی آئی ہے جس میں تمھاری activity کی بابت جانچ پڑتال کی گئی ہے۔ ہم نے انھیں لکھ دیا ہے کہ تم ایک devoted اور بہت قابل طالب علم ہو اور کسی بھی ایسی activity میں شامل نہیں ہو جسے خلافِ قانون قرار دیا جا سکتا ہو۔''

بعد میں گھر سے آنے والے خطوط سے بھی پتا چلا کہ انگریز سرکار کے ہرکارے وہاں بھی ان کے بارے میں اطلاعات جمع کرتے پھر رہے ہیں۔ یعنی انگریز کے خفیہ محکمے میں سوبھو صاحب کا باقاعدہ کھاتا طالب علمی ہی کے زمانے میں کھل چکا تھا۔ ظاہر ہے ان باتوں کی خبریں گرودیو تک بھی پہنچی ہوں گی لیکن ان کی طرف سے کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔

شانتی نکیتن: حصولِ تعلیم کے مراحل

حصول علم کا شوق ان کے خون میں دوڑتا تھا اور شانتی نکیتن میں انھیں ایسا ماحول، سہولت اور رہنمائی حاصل ہوگئی تھی جہاں انھوں نے اپنے اس شوقِ فراواں کی جی بھر کر تسکین حاصل کی۔ سوبھو صاحب نے شانتی نکیتن میں بی اے آنرز کے لیے پولیٹکل سائنس اور اکانومکس اینڈ ہسٹری آف اکانومک تھاٹ (Political Science and Economics and History of Economic thought) کے مضامین منتخب کیے۔ انگلش ادب تو کمپلسری سبجیکٹ تھا ہی، اختیاری مضمون میں سندھی ادب کو رکھا تھا۔ شانتی نکیتن کے منتظمین کے لیے یہ صورتِ حال مشکل تھی کیوں کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ بی اے آنرز کے طالبِ علم کو سندھی ادب کی کن کتابوں کا مطالعہ کرایا جائے کیوں کہ وہاں اب تک سندھی زبان کو محض ایک علاقائی بولی سمجھا جاتا تھا اور انھیں خبر نہ تھی کہ اس زبان میں کلاسیکل شاعری اور نثری ادب بھی موجود ہے۔ اور سندھی زبان میں جدید طرز کی شاعری اور نثر نگاری بھی شروع ہو چکی ہے، سندھی نہ صرف ذریعہ تعلیم ہے بلکہ دفتروں اور عدالتوں تک میں رائج ہے، کئی شہروں سے اخبارات و جرائد بھی باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہے۔ اور ایک ترقی پذیر زبان کی حیثیت سے سندھی زبان و ادب وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے کلکتہ یونی ورسٹی کے پروفیسر کشنو کرپلانی سے رجوع کیا، کشنو کرپلانی جو لندن اسکول آف اکانومکس کے تربیت یافتہ تھا اور پرنسپل انیل کمار چندر کے دوست بھی تھے۔ چنانچہ پروفیسر کشنو کرپلانی نے نہ صرف انھیں سندھی پڑھانے کی ذمہ داری لے لی تھی بلکہ پولیٹکل سائنس میں ارسطو کی کتاب ''پالیٹکس'' سمجھنے میں بھی بہت رہنمائی کی۔ سندھی ادب کے لیے ''شاہ جو رسالو'' کا ایک انتخاب، مرزا قلیچ بیگ کی چند نثری کتابیں جن میں ناول، ڈرامے بھی شامل تھے، سچل اور سامی کی شاعری کے انتخاب اور کشن چند بیوس کی شاعری کے چند حصے شامل تھے۔ کشنو کرپلانی خود بہت عالم آدمی تھے اور عملی سیاست میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ اور انیل کمار چندر دونوں ۱۹۳۲-۳۳ء کے زمانے کی ستیہ گرہ تحریک میں بھی شامل تھے اور دونوں جیل کی ہوا بھی کھا چکے تھے۔ چنانچہ پولیٹکل سائنس اور اکانومکس کے جدید نظریات سے روشناس کرانے کے لیے ان سے بہتر آدمی دستیاب ہی نہیں تھا۔ خاص طور پر سرمایہ دارانہ معیشت اور سوشلزم کے درمیان فرق کو جس طرح کشنو کرپلانی نے واضح کیا ہے اور عالمی سیاست، سماجیات، ادب اور خیالات وتصورات پر روسی انقلاب کے اثرات کو سمجھنے کی بابت جس طرح کشنو کرپلانی نے رہنمائی کی ہے، وہ آج بھی ان کے ذہن پر نقش

ہیں۔ کشنو کرپلانی واقعتاً ایک مکمل استاد اور نہایت ہمدرد دوست تھے۔

سوبھو جی کے انگریزی کے استاد ایک یہودی پروفیسر الیگزینڈر ارسین تھے۔ انھوں نے بہت محنت اور خصوصی توجہ کے ساتھ نہ صرف انگریزی ادب کی تاریخ پڑھائی بلکہ فرنچ، جرمن اور روسی ادب کے شاہکار تخلیقات اور رویوں سے بھی روشناس کرایا۔ انھوں نے کورس کے باہر کی چند کتابیں پڑھنے کو دیں جن میں کافکا، گالزوردی، تھامس ہارڈی اور جارج برنارڈ شا کی منتخب تحریریں شامل تھیں۔ شانتی نکیتن میں پڑھانے کا طریقۂ کار ذرا مختلف اور غیر رواجی قسم کا تھا۔ وہاں کورس کی کتابوں ہی پر اکتفا نہ کیا جاتا تھا بلکہ جنرل اسٹیڈی کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی، عام طور پر طالبِ علم میں تحصیلِ علم کی خواہش کو ابھارا جاتا تھا۔

مذکورہ بالا موضوعات کے علاوہ سوبھو جی قدیم تہذیب و تمدن کے موضوع سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ انھیں ہسٹری آف انشیئنٹ پیوپلز "History of ancient peoples" اور انتھروپولوجی کی بابت متعدد نایاب کتابیں بھی پڑھنے کو ملیں۔ تعلیم کے دوران کشنو کرپلانی کا رویہ بہت دوستانہ اور مخلصانہ ہوتا تھا اور چونکہ انھیں سوبھو میں سیاسی صورتِ حال کو سمجھنے اور علمی نظریوں کو معروضی حالات پر منطبق کرنے کی صلاحیت دکھائی دیتی تھی، اس لیے وہ ان سے ہندوستان کی معروضی صورتِ حال اور سیاسی مستقبل کے بابت تفصیلی بحث مباحثے بھی کیا کرتے تھے۔ وہ خود سوشلسٹ نظریات رکھتے تھے۔ جب ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے پاکستان کا ریزولیشن پاس کیا تو کرپلانی نے اس قرارداد کے پس منظر اور اس کے نتائج پر بھی تفصیلی بحث کی تھی۔ کشنو کرپلانی بعد میں بھی سوبھو صاحب کے نظریاتی ساتھی اور رہنما بنے رہے تھے۔

دو سال کی مختصر مدت میں انھیں دنیا کے بہترین ادب سے تعارف حاصل ہوا۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شانتی نکیتن جانے سے قبل انھیں ٹیگور کی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنے کا چسکا تھا اور ٹیگور کی بابت دنیا کے ادیبوں نے جن اچھی اور بری آرا کا اظہار کیا تھا، اسسے بھی آگاہی حاصل کر لی تھی لیکن شانتی نکیتن آنے کے بعد ٹیگور کو پڑھنے کی رغبت کم ہوگئی تھی اور اس کی جگہ عالمی ادب، تاریخ و تمدن اور فکر و فلسفے کی بابت پڑھنے کا شوق بڑھ گیا تھا۔

وہاں دو بہت وسیع و عریض لائبریریاں تھیں۔ ایک کتب خانہ عام تھا جو سب کے لیے عام تھا، جہاں ہر قسم کی منتخب کتابیں ہزاروں کی تعداد میں موجود تھیں جن سے انھوں نے بھی خوب خوب فیض اٹھائے تھے۔ اس کے علاوہ ایک کتب خانہ خاص بھی تھا جہاں دنیا کی نادر کتابیں رکھی ہوتی تھیں۔ یہ کتب خانہ خاص صرف ٹیگور کے تصرف میں رہتا تھا اور گرودیو اپنا بیشتر وقت یہیں گزارتے تھے۔ ان کے دل میں بھی اشتیاق پیدا ہوا کہ اس کتب خانے کو بھی دیکھنا چاہیے۔ اس شوق کو ہوا دینے میں کچھ ہاتھ 'پربھات' نامی لائبریرین کا بھی تھا جس کی ٹیگور جیسی لمبی داڑھی تھی، اس کے مشورے سے یہاں بھی پرنسپل انیل ان کے کام آئے اور انھوں نے گرودیو سے اجازت حاصل کر لی کہ سوبھو جب چاہیں، کتب خانہ خاص سے استفادہ کر سکتے ہیں، بس ایک پابندی عائد رہی کہ جس کمرے میں گرودیو بیٹھتے ہیں اور جہاں ان کے

استعمال کی اشیا رکھی ہیں، اس سے دور رہیں۔ ویسے گرودیو جہل چیئر پر پورے کتب خانے میں جو تین چار بڑے بڑے کمروں پر مشتمل تھا، گھومتے پھرتے تھے لیکن اکثر و بیشتر اپنے کمرے ہی میں بیٹھتے تھے۔ سوبھو صاحب نے یہاں سے مختلف مذاہب اور تمدنوں کی بابت نہایت نایاب کتابیں حاصل کیں۔ جن میں اسلام پر لکھی گئی ایم این رائے کی کتاب بھی شامل تھی۔ ان کتابوں کے مطالعے سے ان کے فکری تناظر میں وسعت و گیرائی پیدا ہوئی۔ وہاں پہلے دن ہی گرودیو کا سامنا ہوگیا۔ انھوں نے نمسکار کر کے چپکے سے دوسرے کمرے کا رُخ کیا۔ یہاں سامنے ہی شیلف پر مالی نووسکی کی کتاب "Social life of Savages of Malasia" دکھائی دی جسے انھوں نے فی الفور اپنے قبضے میں کرلیا۔

بنگال کے انقلابی

شانتی نکیتن کے قیام کے دوران سب سے اہم واقعہ جو پیش آیا وہ سوبھو صاحب کا بنگال کے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے انقلابیوں سے رابطہ تھا۔ وہ تعلیمی کیریئر کے دوسرے سال کے ابتدائی دن تھے۔ جب انھیں کسی اجنبی شخص کی جانب سے پیغام ملا کہ آپ سے چند بنگالی انقلابی دوست جو ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بھی پیش پیش ہیں، ملنے کے خواہش مند ہیں، ان میں سب سے اہم نام پنالال داس گپتا کا تھا۔ یہ ایک بہت دلچسپ صورت حال تھی کیوں کہ اس وقت تک وہ یہاں کسی سیاسی رہنما سے واقف بھی نہ تھے اور نہ اس بات کا کوئی اندازہ تھا کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں جو ان جیسے خام نوعمر اور اجنبی آدمی سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ ظاہر ہے یہ پیغام نہایت خفیہ ذریعے سے ملا تھا اور دراصل ملاقات کے متمنی لوگوں نے ایک اجنبی شخص سے ملاقات کی خواہش ظاہر کر کے ایک بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ خیر ہر چہ بادا باد سوبھو جی پروگرام کے مطابق اپنے نیپالی دوست کو ساتھ لے کر بارش میں بھیگتے ہوئے بول پور پہنچے۔ اسٹیشن کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں پنالال داس گپتا سے ملاقات ہوئی۔ اس سے پہلے انھیں پتا نہ تھا کہ پنالال داس گپتا کون ہیں۔ انھوں نے سوبھو جی کی ''یومِ آزادی'' والی تقریر کی خوب جی کھول کر داد دی۔ کچھ باتیں ادھر اُدھر کی کیں، اور آئندہ ملتے رہنے کا وعدہ لیا۔ ایسا ہی ایک بلاوا بلھن پور کے چند انقلابیوں کی طرف سے حاصل ہوا تھا۔ وہاں بھی خاموشی سے اور بہت احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہوئے پہنچے کیوں کہ انھیں اس بات کا تو احساس ہوگیا تھا کہ جو لوگ انڈر گراؤنڈ رہ کر کام کر رہے ہیں، ان کے بارے میں ذرا سی بے احتیاطی بھی خطرے کا باعث ہوسکتی ہے۔ وہاں نوجوانوں کا اچھا خاصا مجمع تھا جس میں ہندوستان کے کم و بیش ہر علاقے کے لوگ شامل تھے۔ بنگالیوں کی کثرت تھی لیکن مدراسی اور بہاری بھی موجود تھے۔ ان لوگوں نے ان کو خوب ہاتھوں ہاتھ لیا اور انھیں اپنی جدوجہد کے مقاصد سمجھائے۔ کھانا بھی کھلایا اور چلتے ہوئے چند کتابوں کی ایک فہرست بھی تھما دی کہ موقع مل جائے تو ان

کتابوں کو بھی پڑھ لوں۔ انھوں نے دوسرے ہی دن اُن کتابوں کو لائبریری سے حاصل کیا۔ ان کتابوں میں ٹراسکی کی لکھی ہوئی کتاب "A history of Russian revolution" بھی شامل تھی۔ اس کتاب کے پہلے صفحے پر ہی ایک ہیڈنگ تھی:

There is only one privileged class in the Soviet Union that is our children.

سوبھو جی کو ٹرائسکی کی کتاب بہت پسند آئی اور انقلاب روس سے ان کی دلچسپی میں زیادہ گہرائی پیدا ہوگئی۔ اس سے قبل وہ سوشلزم کی بابت چند ابتدائی کتابیں پڑھ چکے تھے۔ آہستہ آہستہ اس انقلابی گروپ سے ان کی دوستی مستحکم ہوتی گئی اور ان میں سے بعض لوگوں سے ذاتی تعلقات قائم ہو گئے جو تاعمر قائم رہے۔

بنگال کے انقلابی گروپوں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے سوبھو جی نے بتایا کہ دراصل سوبھاش چندر بوس کی شخصیت میں نوجوانوں کو غیر معمولی جاذبیت محسوس ہوتی تھی اور انگریزوں کے خلاف بغاوت کے عناصر اتنے شدید تھے کہ اڑ کر لگتے تھے۔ انقلاب روس اور دوسرے ممالک میں سوشلزم کی فتوحات نے بھی باغیانہ رجحانات کو ہوا دی تھی۔ بنگال قحط کے اثرات سے ابھی سنبھل نہ پایا تھا کہ اسے جنگی جنون نے آلیا تھا۔ انگریزوں کی عوام دشمن پالیسی نے ہر قسم کی جمہوری وسیاسی تحریکوں پر پابندیاں عائد کردی تھیں۔ اس صورت میں ان گروہوں کے لیے جو ہندوستان کو برطانوی سامراج سے نجات دلا کر سوشلسٹ معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے، اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ زیر زمین رہ کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان میں سے کئی گروہ کوئی واضح پروگرام اور نصب العین بھی نہ رکھتے تھے، سوائے اس کے کہ وہ آزادی کے حصول کے لیے ہر قسم کی کارروائی کرنے کے لیے بھی تیار رہتے تھے۔ بعض گروپ تو خونی کارروائیوں تک کو جائز سمجھتے تھے اور خودکش ہلاکتوں کو بھی آزادی کی خدمت میں بھینٹ جانتے تھے۔ اس صورت حال نے ان انقلابی گروہوں میں ایک لحاظ سے بے خوفی اور جرأت مندی تو ضرور پیدا کردی تھی لیکن انھیں بیشتر عوامی رابطے سے محروم کر رکھا تھا۔ سوبھو صاحب نے بتایا کہ ان میں سے شاید چند ایک گروپ کمیونسٹ پارٹی سے رابطے میں ہوں گے لیکن اکثر اپنی اپنی صوابدید پر مصروف کار تھے۔ سوبھو صاحب نے مزید فرمایا کہ اس زمانے میں ان انقلابیوں کی بابت بہت سی باتیں اور طرزِ عمل ان کی سمجھ میں نہ آتے تھے لیکن جب عملی زندگی میں خود انھیں زیر زمین تحریکیں چلانی پڑیں تو اس طریق کار کی ایک ایک بات واضح ہوتی چلی گئی۔

انقلابی لوگوں سے ملنے کے بعد سوبھو صاحب کے ذہن میں زندگی کا یہ رخ بھی واضح ہو گیا کہ آدرش وادی آدمی کیا ہوتا ہے اور اس کو کس طرح کی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔

الوداعی پارٹی

سوبھو صاحب ۱۹۴۱ء کے اواخر میں بی اے کے امتحان سے فارغ ہو چکے تھے لیکن رزلٹ کا انتظار تھا۔ انگریزی کے استاد الیگزینڈر ارایسن نے اپنے گھر پر فارغ التحصیل ہونے والے طلبا و طالبات کی الوداعی دعوت کا اہتمام کیا جو وہ ہر سال کیا کرتے تھے۔ اس میں سب نے اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ شانتی نکیتن چھوڑنے کا سب ہی کو یک گونہ قلق تھا۔ انھیں بھی اس مادرِ علمی سے بچھڑنے کا دکھ تو تھا لیکن اس بات کی خوشی بھی تھی کہ وہ واپس سندھ جا رہے ہیں، جہاں ان کے دوست احباب اور گھر والے تو منتظر ہیں ہی لیکن عملی زندگی کا ایک وسیع میدان ان کے سامنے پڑا ہوا ہے، ان کے والد اور بھائی انھیں آئی سی ایس کا امتحان پاس کرا کے ایک بڑا بیوروکریٹ بنانا چاہتے تھے کہ اس زمانے میں انگریز حکومت کی افسری ہی اعلیٰ ترین اسٹیٹس سمبل ہوا کرتی تھی، خاص طور پر کھاتے پیتے لوگوں کے لیے۔ لیکن شانتی نکیتن کے قیام کے دوران ہی سوبھو صاحب اپنا راستہ منتخب کر چکے تھے۔ اس الوداعی پارٹی میں تمام شرکا کو دعوت دی گئی کہ وہ مختصر طور پر بتائیں کہ انھوں نے شانتی نکیتن کے قیام کے دوران کیا حاصل کیا ہے۔ مختلف لوگوں نے مختلف انداز میں جواب دیے۔ جب سوبھو صاحب کی باری آئی تو انھوں نے ایک فقرہ کہا کہ:

"I came here as a boy and I go back as a man."

''جب میں یہاں آیا تھا تو محض ایک ناتجربہ کار لڑکا تھا مگر میں یہاں سے ایک نوجوان مرد کی حیثیت سے جا رہا ہوں۔''

اس جملے کی بلاغت کی سب نے داد دی اور بات تھی بھی درست کہ جب سوبھو شانتی نکیتن آئے تھے تو ان کی عمر محض انیس برس تھی اور جب وہ یہاں سے جا رہے تھے تو وہ اکیس سال کے مکمل مرد بن چکے تھے۔ ان دو برسوں میں ان کے خیالات و تصورات میں غیر معمولی تبدیلیاں آئی تھیں اور ان کے فکری انداز میں رومانیت کے عناصر کی جگہ ٹھوس حقیقت پسندیت آ چکی تھی۔ مذہبی جھکاؤ سائنسی اور منطقی استدلال سے تبدیل ہو گیا تھا۔ ہندوستان کی آزادی اور سوراج نصب العین بن چکا تھا۔ تنہائی پسندیت اور گوشہ نشینی کی بجائے اب وہ لوگوں سے قریب تر ہونے اور ذاتی دوستیوں کو نظریاتی اور عملی رفاقتوں میں بدلنے کے خواہش مند ہوا کرتے تھے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا رویہ ان کے مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ شانتی نکیتن ہی کے قیام کے دوران انھوں نے کئی ایسی دوستیاں بنالی تھیں جن سے تعلقات بعد میں بھی نہ صرف باقی رہے بلکہ زیادہ مضبوط اور وسیع تر ہوتے چلے گئے۔ سوشلسٹ تحریکوں میں ان کی دلچسپی عملی سرگرمیوں میں تبدیل ہو گئی تھی اور وہ کُل ہند اسٹوڈنٹس موومنٹ کے ایک سرگرم

کارکن بن چکے تھے۔ سومیندر ناتھ ٹھاکر سے جو گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کے بھتیجے تھے اور ایک زمانے میں جرمنی کی کمیونسٹ تحریک سے وابستہ رہنے کی وجہ سے وطن بدر کیے جا چکے تھے، سوبھو کے قریبی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ اس طرح ترقی پسند ادبی تحریک میں بھی ان کی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی اور وہ جوش، فیض، مخدوم، پریم چند، کرشن چندر، سجاد ظہیر وغیرہ کی تحریروں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان سے متاثر بھی۔ سوبھو صاحب نے یہ بات کہیں لکھی ہے کہ عام طور پر لوگ شانتی نکیتن میں آرٹسٹ بننے آتے ہیں۔ خواب دیکھنے والے اور لوٹس ایٹر (Lotus eater) یعنی فطرت پرست لوگ شانتی نکیتن کا رخ کیا کرتے تھے۔ لیکن وہ ایک عام سیدھے سادے نوجوان کی حیثیت سے یہاں آئے تھے لیکن ایک انقلابی کے خواب اور جذبے کے ساتھ شانتی نکیتن سے رخصت ہوئے ہیں۔

شانتی نکیتن کے الوداعی جلسے میں انگریزی استاد الیگزینڈر اریسن نے سوبھو صاحب کی تحسین کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''شانتی نکیتن کی ماضی قریب میں سوبھو جیسے ذہین اور حصولِ علم کی طلب رکھنے والے لوگ کم آئے ہیں اور وہ اپنے دو سالہ دور کی بہت سی یادیں یہاں چھوڑے جا رہے ہیں۔ عام طور پر مخلوط تعلیمی اداروں میں لڑکے لڑکیوں کے تعاقب میں پھرتے ہیں اور ان کی دلچسپیاں نصابی سرگرمیوں سے کہیں زیادہ غیر نصابی معاملات میں ہوتی ہیں لیکن سوبھو نے اپنی دل کش شخصیت کے باوجود اپنے آپ کو اس طرح کی سرگرمیوں سے محفوظ رکھا، حالانکہ کئی لڑکیاں تھیں جو ان کے پیچھے دیوانی ہوئی جاتی تھیں مگر سوبھو نے جو تعلیمی ریکارڈ قائم کیا ہے اور آنرز میں جو مقالہ لکھا ہے، وہ کالج کے ریکارڈ میں محفوظ رہے گا، کیوں کہ انھوں نے اس مقالے کی تیاری میں نصاب کی کتابوں سے کہیں زیادہ وسیع تر مطالعے کو استعمال کیا ہے۔''

شانتی نکیتن۔ یادیں سوغاتیں

شانتی نکیتن کی خوش گوار یادوں میں سے کوئی کوئی یاد اب بھی چمک دکھا جاتی ہے۔

''ایسی ہی یادوں میں سے ایک تصویر اس لڑکی کی ہے جو لاڑکانہ کے اسکول میں ان کی ہم جماعت تھی، اس کا نام سندری کشن چند شوداسانی تھا۔ اس سے اسکول کے زمانے میں بھی اچھی خاصی دوستی تھی اور وہ ایک مرتبہ اپنی ماں اور بھابی کے ساتھ سوبھو جی کے گھر بھی آ چکی تھی، اور لاڑکانہ سے شانتی نکیتن آنے والی

لڑکیوں میں وہ بھی شامل تھی۔ وہ ہمیشہ ان کا بہت خیال رکھتی تھی، عمر میں شاید
ایک دو سال بڑی ہوگی۔ دوسری لڑکیاں اس سے جلتی تھیں اور سوبھو کا نام لے کر
اسے چھیڑا کرتی تھیں لیکن چونکہ اس کے علم میں تھا کہ سوبھو کے گھر والوں نے
شانتی نکیتن آنے سے قبل ان کی منگنی کردی ہے اور یوں بھی سوبھو جی لڑکیوں میں
کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ اس لیے وہ بھی اپنے طور پر احتیاط برتتی تھی اور
دوسری لڑکیوں کو بھی ڈانٹتی رہتی تھی کہ سوبھو کو تنگ کرنا چھوڑ دیں۔''

وہ شانتی نکیتن گرلز ہوسٹل میں رہتی تھی۔ اس کی کلاسیں بھی جدا تھیں اور یہ بھی یہاں آکر روز بہ روز مصروف ہوتے چلے گئے تھے۔ لہٰذا سندری سے ملنے کے مواقع بھی کم ملتے تھے۔

''ایک مرتبہ بہت دنوں کے بعد وہ راستے میں مل گئی تو کہنے لگی کہ تم تو بس
پڑھائی میں ایسے لگے ہو کہ مجھے بھی بھول گئے۔ اتنے گلے شکوے کیے کہ سوبھو
شرمندہ ہو کر رہ گئے۔ آخر وہ سندری کو لے کر قریب ہی ایک درخت تلے بیٹھ گئے
اور دونوں نے گھنٹوں اتنی گپ شپ لگائی کہ ماضی کے سب گلے شکوے دور
ہو گئے۔ آخر سندری کو بھی انھوں نے آہستہ آہستہ اپنی سیاسی سرگرمیوں میں شامل
کرلیا اور شانتی نکیتن سے واپسی کے بعد ۱۹۴۲ء کی ''کوئٹ انڈیا موومنٹ'' میں
کراچی سے جیل جانے والی غالباً وہ سب سے پہلی لڑکی تھی۔''

اسی طرح انھیں ایک واقعہ اور یاد آتا ہے:

''بنگال میں بارشیں بہت ہوتی ہیں، ہر طرف سبزے کی بہار ہے، یہاں عام طور
پر لڑکے لڑکیاں سب چپل پہنا کرتے ہیں اور بوٹ پہننے کا رواج کم تھا۔ ایک
دن بوندا باندی ہو رہی تھی، سوبھو جی بارش اور کیچڑ میں لت پت اپنے ہوسٹل کی
طرف جا رہے تھے۔ لڑکیوں کے ایک ہوسٹل سے ان پر ہوٹنگ شروع ہوگئی۔
ایک پنجابی لڑکی بہت تیز طرار تھی اور جب بھی موقع ملتا، انھیں پریشان کرنے کی
کوشش میں لگی رہتی تھی۔ یہ ہمیشہ ہنس کے ٹال دیا کرتے تھے کہ اس نے ان کا
نام ہی ''سندھ کا جنگلی''، ''سندھ کا جنگلی'' رکھ دیا تھا۔ اب جو اس نے انہیں بارش
میں بھیگتے ہوئے اپنے ہوسٹل کی طرف بھاگتے دیکھا تو ان پر ہوٹنگ شروع
کردی کہ دیکھو ''وہ سندھ کا جنگلی، سندھ کا جنگلی جا رہا ہے۔''

انھوں نے کچھ دیر تو برداشت کیا لیکن جب ہوٹنگ بڑھ گئی تو جھنجھلا کر جواباً کوئی سخت بات کہہ دی۔ معاملہ یہاں تک بڑھا کہ اس لڑکی نے پرنسپل سے ان کی شکایت جا لگائی لیکن پرنسپل نے پوری بات سننے

کے بعد خود اس لڑکی کو وہ ڈانٹ پلائی کہ اس کا مزاج درست ہوگیا۔ اس واقعے کے بعد بعض لڑکے بھی انھیں چھیڑا کرتے تھے، ان کا ایک دوست بھون کمار پانڈے بھی تھا، جو ان کے ساتھ مل کر اکثر ورزش کرتا اور ان کو چھیڑ چھیڑ کر کہا کرتا تھا کہ:

''سندھ کے جنگلی، تمھارا یہاں گزارا کیسے ہوگا رے۔''

اس ایک جملے کی یاد انھیں اب بھی اداس کر دیتی ہے۔

شانتی نکیتن کے یومِ تاسیس (Foundation day) کو یاد کرتے ہوئے سوبھو صاحب نے بتایا:

''یہ دن ۲۱ یا ۲۲ رفروری کو ہر سال منایا جاتا تھا۔ اس دن کالج اور ہوسٹل میں بڑی رونق ہوتی تھی۔ خاص طور پر لڑکیاں گہرے رنگوں کی ساڑھیاں باندھتی تھیں، پُرکشش چست بلاؤز پہنتیں، خوب بنتی سنورتیں، سنگھار کرتیں، بالوں میں گجرے باندھتیں اور اٹھلاتی ناچتی ہوئی آڈیٹوریم ہال میں جمع ہوا کرتیں۔ لڑکے بھی لباس میں خاص اہتمام کرتے۔ ٹیگور خود بھی اس محفل میں اکثر شریک ہوتے اور سب کے ساتھ گھل مل کر گیت سنگیت سنا کرتے۔ یہ شانتی نکیتن کی زندگی کا یادگار دن ہوا کرتا تھا جو سال میں صرف ایک دن آتا تھا۔ یہ دن عشق و محبت کی خوشبو سے مہکتا ہوا دن ہوتا تھا اور محبت کرنے والے سال بھر اس دن کا انتظار کیا کرتے تھے۔''

ایک مرتبہ فاؤنڈیشن ڈے کا جلسہ جاری تھا اور گرو دیو ٹیگور خود صدارت کر رہے تھے۔ ان ہی کا لکھا ہوا گیت اسٹیج پر گایا جا رہا تھا:

زندگی کا دوسرا کنارا آگا ہے
خاتمہ بس سامنے ہے
دھند لکے میں اب کیا بچا ہے
زندگی گزراں اور گزراں ہی رہی
زندگی جتنی گزرنی تھی گزار آئے ہیں، ہم
موت چپکے سے نہ جانے کب چلی آئے ادھر
منتظر ہوں منتظر
آؤ ہم اس ساعتِ آخر کا خیر مقدم کریں

ابھی یہ گیت جاری ہی تھا:

''ٹیگور خود اپنی شکستہ اور بیٹھی ہوئی آواز میں شروع ہوگئے اور اپنا ہی گیت گانے

لگے۔ سارے آڈیٹوریم میں سناٹا چھا گیا، سب ساز بند ہو گئے، بس لوگوں کی سانسوں اور سسکیوں کی آوازیں تھیں اور ٹیگور کا درد بھرا گیت، جو وہ گا رہے تھے۔''

اور اس کے بعد جو لمحے بھی گزرے ضائع گئے
اور جو لمحے اب گزرتے ہیں وہ بھی بے فیض ہیں
اور ہم جو منتظر ہیں صبح فردا کے لیے
سب ہی ایک موہوم سے انتظار میں
بے فیض اور بے درد وقت کے شکنجے میں ہیں

گرودیو کے گیت نے فضا میں غمگینی کی کیفیت پیدا کر دی تھی اور گیت کے ختم ہونے تک خود گرودیو نڈھال ہو کر رہ گئے تھے۔ محفل دیکھتے دیکھتے برخاست ہو گئی۔ خود گرودیو بہ عجلت ہال سے روانہ ہو گئے تھے۔ میں نے بعد میں اپنے بنگالی دوستوں اور استادوں سے دریافت کیا کہ آخر اس گیت میں ایسی کون سی بات ہے جس نے گرودیو کو اس قدر پریشان کر دیا تھا۔ لوگوں نے بتایا:

''ان دنوں گرودیو کو اپنی ضعیفی کا احساس زیادہ ہو گیا ہے۔ اس گیت میں کہا گیا ہے کہ آسماں روشن رنگوں سے دمک رہا ہے، چاروں طرف پھولوں کی خوشبو زندگی کے تال پر رقص کر رہی ہے لیکن میں نہ تو آسمان کی چمک دمک سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں اور نہ رقص کرتی ہوئی بہار کی طرح رقص فرما سکتا ہوں۔ زندگی کا سفر جاری رہے گا، بس میں کہیں پیچھے رہ جاؤں گا۔''

اگست ستمبر ۱۹۳۹ء کے ''پوجا ہالی ڈیز'' (جو دسہرہ کی طرح کا خالص بنگالی تہوار ہوتا ہے) کے دوران انڈونیشیا کے طالب علم خیر الدین، نیپالی دوست نریندر ناتھ اور مرہٹہ دوست آپٹے کے ساتھ سوبھو صاحب نے آسام، کلکتہ اور مغربی بنگال کے سفر کی ٹھانی اور کلکتہ کے علاوہ، چاندپور، سلہٹ، چٹاگانگ، اگرتلہ، شیلانگ اور دوسرے مقامات تک گھوم پھر آئے اور یوں بنگال کی کھلی فضا اور ماحول، معاشرت، تہذیبی رچاؤ اور بنگالیوں کی عادات و اطوار اور رہن سہن کو سمجھنے کے مواقع ملے۔ اس پورے سفر میں آمد و رفت وغیرہ پر ستر روپے فی کس سے زیادہ مصارف نہ آئے تھے، جب کہ قیام و طعام کے سلسلے میں شانتی نکیتن کے مہمانوں کے لیے آؤ بھگت کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ یوں بھی ان دنوں بنگال میں طالب علموں کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ اسی سفر کے دوران معروف انقلابی خاتون کلپنا دت سے بھی ملاقات ہوئی اور بنگال اسمبلی کے اسپیکر ارون چندا سے بھی ملے بلکہ ارون چندا نے جو شانتی نکیتن کے پرنسپل انیل چندا کے بڑے بھائی تھے، ان لوگوں کی میزبانی بھی کی۔ سوبھو صاحب نے لکھا ہے:

''اس سفر کے دوران بنگال کے جادو اور حسن کی کارفرمائیوں نے انھیں مبہوت کر دیا تھا اور ان کی دوستی کے حلقے میں وسعت پیدا ہوگئی تھی۔ بنگالی زبان کی چاشنی سے وہ پہلے ہی آگاہ تھے لیکن اب ان پر کھلا کہ بنگلہ زبان معنویت، حسن اور موسیقی کے اعتبار سے بھی غیر معمولی وسعت، گہرائی اور تنوع رکھتی ہے۔''

شانتی نکیتن میں قیام کے آخری دنوں میں وہ کالے پانی کی سزا کاٹ کر آنے والے چند انقلابیوں سے ملنے ولبھ نامی ایک گاؤں میں بھی گئے تھے، جہاں انھیں متعدد سیاسی رہنماؤں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان لوگوں میں کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ افراد بھی تھے اور سبھاش چندر بوس سے تعلق رکھنے والے سوشلسٹ انقلابی بھی۔ اور سومین ٹھاکر کے مقلدین دہشت گرد بھی۔ اس سفر میں بھی نیپالی دوست رانا مہندر اور حیدر آباد دکن کے شنکر آئر شریک تھے۔

''۱۹۴۰ء کی تعطیلات میں انھیں شانتی نکیتن ہی میں ٹھہرنا پڑا کیوں کہ ایک بنگالی ہم جماعت کینسر میں مبتلا تھا اور اس کی تیمارداری کے لیے اس کے پاس کوئی عزیز موجود نہ تھا۔ چنانچہ سوبھو صاحب نے نہایت خلوص، ہمدردی اور جاں فشانی کے ساتھ اس بیمار دوست کی تیمارداری کی لیکن افسوس وہ جاں بر نہ ہو سکا اور اس کی یاد اب تک ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔''

کراچی سے شانتی نکیتن تک پہلا تین چار روزہ ریل کا سفر ان کی یادوں میں اب تک لو دیتا ہے:

''پہلی مرتبہ گھر سے نکلنے کی سنسناہٹ اور جب سفر بھی خیالی و تصوراتی جنت کا درپیش ہو تو انسان کی شادمانی اور ایکسائٹمنٹ کا کیا ٹھکانا ہو سکتا ہے۔ کراچی سے دو اسپیشل بوگیاں شانتی نکیتن جانے والے طلبا و طالبات کے لیے پنجاب میل میں لگتی تھیں۔ ایک بوگی میں لڑکیاں سوار تھیں جب کہ لڑکے جو دو یا تین تھے، بازو والے کمپارٹمنٹ میں سوار تھے۔ لاہور سے یہ بوگیاں کلکتہ میل میں لگ جاتی تھیں۔ لڑکیوں میں سے بیشتر ہندو عاملوں کے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں جو بالعموم کھاتے پیتے، خوش حال اور مہذب ہوتے ہیں۔''

بقول پیر علی محمد راشدی:

''سندھ کے عامل ایشیا کے انگریز ہوتے ہیں۔''

لہٰذا ہم سفر لڑکیوں میں بھی جوانی کے ناز و انداز کے علاوہ شرارت، چلبلا پن اور تیزی و طراری بھری ہوئی تھی۔ ان میں لاڑکانہ کی بھی دو لڑکیاں تھیں جو سوبھو جی کو پہلے ہی سے جانتی تھیں۔ اکثر لڑکیاں ہر بڑے اسٹیشن پر اترنا چاہتی تھیں جب کہ لڑکوں کو ہدایت تھی کہ انھیں ایسا نہ کرنے دیا جائے۔ چنانچہ وہ

راستے بھر کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کر دیتی تھیں جو ان لوگوں کے لیے وبالِ جان ہو جاتیں۔ لاہور سے ایک سکھ لڑکا بھی شریکِ سفر ہو گیا تھا۔ وہ ان سندھی لڑکوں کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتا رہا اور ساتھ ساتھ انھیں اپنی ہلکی پھلکی پُر لطف باتوں اور شعر و شاعری سے محظوظ کرتا رہا۔ اور یہ پُر لطف مگر سنسنی خیز سفر تو چار دن کے بعد ختم ہو گیا۔ لیکن یادوں کا سفر ہنوز جاری ہے!!

''ایک مرتبہ علی الصبح چار بجے جب چاروں طرف اندھیرا تھا۔ ہاسٹل کے چند دوست ان کے کمرے میں آ گئے اور مجھے اٹھا کر اصرار کرنے لگے کہ چلو ہم لوگ ''**نیرو**'' (تاڑی) پی کر آتے ہیں۔ انھیں اس وقت تک معلوم ہی نہ تھا کہ ''**نیرو**'' کیا چیز ہوتی ہے۔ دریافت کرنے پر پتا چلا یہ ناریل کے درخت سے کشید کیا ہوا ایک طرح کا رَس ہوتا ہے جسے اگر سورج نکلنے سے قبل پیا جائے تو مزے دار اور پُر لطف ہوتا ہے لیکن سورج نکلنے کے بعد جیسے جیسے گرمی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس میں نشہ آور کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے اور ذائقہ بھی بدلنے لگتا ہے۔ چنانچہ یہ سب لوگ منھ اندھیرے پڑوس کے ایک باغ میں گھس گئے، وہاں دیکھا تو کھجور کے درختوں میں بہت اونچائی پر جہاں پھل لگا کرتے ہیں۔ ایک ایک دو دو مٹی کی ہانڈی بندھی ہوتی ہے۔ لڑکوں نے بتایا کہ رات بھر ان ہنڈیوں میں ''**نیرا**'' (تاڑی) جمع ہوتا رہتا ہے۔ صبح تک ہانڈیاں بھر جائیں گی لیکن باغ والے اسے سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد جب اس میں نشہ آور کیفیت پیدا ہونا شروع ہو جائے گی، یعنی وہ ''**نیرو**'' (تاڑی) بن جائے گی تو درخت سے اتاریں گے، کیوں کہ ان کو اچھی قیمت صرف ''**نیرو**'' (تاڑی) ہی کی صورت میں ملے گی۔ اگر ہم کسی طرح ان کے آنے سے قبل ہنڈیوں کو اتار کر اس میں جمع مشروب پی لیں تو مزہ آ جائے۔ اب سوال یہ تھا کہ ہنڈیاں درخت سے کیسے اتاری جائیں۔ کسی کو درخت پر چڑھنا ہی نہ آتا تھا۔ سندھ میں چونکہ کھجور کے درخت عام ہیں اور بچپن میں ان پر چڑھنے اترنے کی ان کو اچھی خاصی مشق تھی، لہٰذا یہ فٹافٹ درخت پر چڑھ گئے۔ چار چھ درختوں سے ہانڈیاں اتاری گئیں تو اس سے چار چھ گلاس ''**نیرا**'' (تاڑی) جمع ہو سکا۔ اس سے زیادہ پینے کی صلاحیت ان لوگوں میں تھی بھی نہیں۔ ان سب نے وہیں بیٹھ کر ''**نیرا**'' (تاڑی) پیا۔''

بقول سوبھو صاحب:

''انھیں کوئی خاص لطف نہیں آیا۔ بس تازگی اور مٹھاس بھرا شربت تھا جس میں

ہلکی سی کسانند بھی تھی یعنی زبان اور حلق میں خراش پیدا کرتی تھی۔''

اس کے بعد انھوں نے سب سے چار چار آنے جمع کیے اور ان خالی ہانڈیوں میں ڈال دیئے کہ غریب لوگوں کا نقصان نہ ہو۔ اس طرح کی باتیں بھلا کہاں چھپی رہتی ہیں۔ دوسرے دن کالج اور ہاسٹل میں یہ قصہ مشہور ہوگیا تھا۔ لیکن خیر گزری کہ کسی کی طرف سے کوئی شکایت نہیں آئی کیوں کہ باغ والوں کو ہانڈیوں کی قیمت تو مل ہی گئی تھی۔ اس کے برعکس لڑکوں کی ایک ٹولی چاندنی رات میں اسی باغ میں جا گھسی اور ''نیرو'' (تاڑی) پی کر کافی غل غپاڑہ مچایا۔ ان کی ایک دو ہانڈیاں بھی توڑ دی تھیں اور باغ کے رکھوالے کو پیسے بھی نہیں دیئے تھے۔ چنانچہ دوسرے دن ان کی باقاعدہ شکایت پرنسپل کے پاس آگئی تھی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ لڑکوں کی شناخت نہ ہوسکی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

شانتی نکیتن سے ملحق ایک بہت بڑا باغ بھی تھا جس میں قسم قسم کے میوہ جات لگے تھے، یہ بوٹنی سائنس کی تجربہ گاہ تھی۔

> ''ایک رات لڑکوں کا ایک گروپ اس باغ میں گھس گیا تھا اور وہاں سے قسم قسم کے پھل توڑ لایا تھا۔ یہ باغ بھی گرودیو کے بیٹے کا تجرباتی باغ تھا اور اس میں گرائپ فروٹ لگے تھے۔ صبح مالی نے پرنسپل کو شکایت کردی۔ پرنسپل نے انھیں بلایا کیوں کہ وہ ہاسٹل کے وارڈن تھے اور تاکید کی کہ لڑکوں کو ہدایت کردوں کہ آئندہ خیال رکھیں، ویسے ان کے گرائپ فروٹ کھانے پر پرنسپل کو کوئی اعتراض نہیں تھا کہ اس میں کونین کی مقدار بھی شامل ہوتی ہے جو صحت کے لیے بہتر ہوتی ہے لیکن یہ باغ بوٹنی سائنس کی تجربہ گاہ بھی ہے، اس لیے خیال رکھا جائے اور آئندہ شکایت کا موقع نہ ملے تو بہتر ہے۔ دراصل پرنسپل انیل چندر معاملے کو رفع دفع کردینے کا ماہر شخص تھا جس کی وجہ سے طلبا اور انتظامیہ کے درمیان کھینچا تانی کی نوبت بہت کم آپاتی تھی۔''

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم

عملی زندگی کے چند مراحل

سوبھو صاحب اپریل ۱۹۴۱ء میں شانتی نکیتن سے تعلیم مکمل کر کے کراچی واپس لوٹے۔ ان کے قریبی دوست لیکھو تلسانی نے ان کی واپسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جب وہ شانتی نکیتن سے لوٹا تو بالکل ہی ایک دوسرا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ وہ کومل، نازک، خوش اندام لڑکا اور ننھا منا سنت جو یہاں سے شانتی نکیتن گیا تھا، اب ایک اونچا پورا تندرست اور ٹھوس کاٹھی والا بھرپور جوان مرد بن چکا تھا۔ اس کو دیکھ کر شرت چندر چٹر جی کا ناول ''آزادی کے دیوانے'' کے ڈاکٹر کا کردار نگاہوں میں گھوم جاتا تھا۔ سوبھو اس کردار ہی کی طرح مضبوط، اٹل، وجیہہ اور بلند قامت تھا لیکن سوبھو کی بنیادی شخصیت اور مزاج میں کوئی غیر معمولی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی، ہاں اس کی قابلیت اور ذہنی صلاحیتوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے خیالات و تصورات زیادہ صاف، واضح اور حقیقت پسندانہ ہو گئے تھے، اس کی طبیعت کی سادگی میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ اور اس کے عام برتاؤ، اخلاق اور رکھ رکھاؤ میں مزید انکساری اور وقار پیدا ہوا تھا۔''

طلبا تحریک

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان بھر میں قومی آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں اور کانگریس، مسلم لیگ، اکالی دل، ہریجن سب ہی سیاسی جماعتیں اور گروہ انگریزوں کے خلاف مکمل آزادی کے حق میں سرگرمِ عمل تھے۔ شانتی نکیتن سے واپسی پر سوبھو صاحب نے وقت ضائع کیے بنا وکالت کرنے کے لیے ایس ای شاہانی لا کالج میں ایل ایل بی کی کلاس میں داخلہ لے لیا تھا لیکن اس سے پہلے انھیں خاندان والوں کی

شرط کو پورا کرنے کے لیے شادی کے منڈپ پر بھی بیٹھنا پڑا اور اپنی منگیتر لیلاں جن سے شانتی نکیتن جانے سے قبل منگنی کردی گئی تھی، شادی رچانا پڑی۔ شادی کے بعد وہ چند ماہ گاؤں میں رہے اور پھر کراچی چلے آئے تاکہ وکالت کی تعلیم مکمل کی جاسکے۔ اسی سال گوبند مالھی اور لیکھو تلسانی نے بھی ایل ایل بی کے سال اوّل میں داخلہ لیا تھا اور خوش قسمتی سے کالج کے قریب ہی کرائے پر ایک اچھی رہائش کا بندوبست بھی ہوگیا تھا۔ نوبیاہتا بیوی کو ابھی گاؤں ہی میں گزارا کرنا تھا کہ انھوں نے شادی تو کرلی تھی لیکن شادی شدہ زندگی کے آداب سے واقفیت تک نہ تھی۔ لیکھو تلسانی اور سوبھو جی انٹر تک پہلے بھی ہم جماعت اور قریبی دوست تھے، گوبند مالھی سے ان کی دوستی لیکھو تلسانی کے توسط سے ہوئی اور پھر تعلقات اتنے بڑھے کہ وہ نہ صرف ایک ساتھ ہی رہنے لگے بلکہ ان کی سرگرمیاں اور ذوق وشوق کا دائرہ بھی ایک ہی ہوتا گیا جس طرح پورے ملک کی سیاسی فضا گرم ہونے لگی تھی، اسی طرح کراچی بھی ان دنوں سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ ان دنوں خاص طور پر طلبا تحریک اپنے عروج پر تھی جس کی رہنمائی حشو کیول رامانی (جو حال ہی میں لندن سے تعلیم حاصل کرکے لوٹے تھے) کررہے تھے۔ حشو کیول رامانی بہت پڑھے لکھے آدمی تھے اور بائیں بازو کے سوشلسٹ تحریکوں کے زبردست حامی۔ اس زمانے میں آزادیِ ہند اور سوراج کا نعرہ تمام سرگرمیوں کا محور تھا، خاص طور پر طالب علم تنظیموں میں، سیاسی جماعتیں اپنے اپنے مقاصد کے لیے طلبا میں بھی اپنا اثر ورسوخ پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھیں لیکن بائیں بازو کے زیرِاثر کام کرنے والی طلبا تنظیمیں زیادہ تر سوشلسٹ پروگرام کے تحت سماجی انقلاب کے نعرے لگاتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ ہندوستانی سماج میں مزدوروں، محنت کشوں، غریبوں اور کسانوں کو بھی اقتصادی اور سیاسی آزادی حاصل ہونی چاہیے اور غریب کے بچوں کو بھی تعلیم کے مساوی حقوق حاصل ہوں۔ انھیں زیادہ سے زیادہ تعلیمی مراعات دی جانی چاہییں اور حصولِ تعلیم کے بعد کامیاب طلبا کو مناسب ملازمت کی ضمانت بھی فراہم کی جائے۔

شیخ ایاز نے اپنی ساہیوال جیل کی یادداشتوں میں حشو کیول رامانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''انھوں نے لندن سے واپسی کے بعد جہاں طلبا تحریک کو منظم کیا، وہیں اس نے بعض نوجوان دوستوں کو ترقی پسند خیالات اور یورپ میں چلنے والی انقلابی تحریکوں اور نئے رجحانات سے بھی آگاہ کیا تھا۔ اس نے انگریزی ادیبوں اسٹیفن اسپنڈر، کرسٹوفر اشروڈ اور آڈن کے بارے میں بہت معلومات افزا لیکچر دیے۔ وہ بہت اچھا مقرر اور تنظیم کار تھا لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ طلبا کمیونٹی کے مختلف گروپوں کو منظم کرنا تھا۔ اس نے آکسفورڈ میں اندرا گاندھی کے ساتھ اس وقت پڑھا تھا جب اندرا اور فیروز گاندھی کا معاشقہ چل رہا تھا۔

ہندوستان آکر جہاں حشو کیول رامانی نے سندھ کی اسٹوڈنٹس تحریک کی رہنمائی شروع کی تو دیکھتے دیکھتے نوجوانوں کا ہیرو بن گیا تھا۔ اسی زمانے میں اس نے برطانوی حکومت کے خلاف ایسے پمفلٹ اور پوسٹر بھی لکھے جنھیں گوری سرکار نے سخت ناپسند کیا۔ انگریزوں کے خلاف ایک پوسٹر جس میں اس نے ہندوستان کے نقشے پر گورے فوجی کا لانگ بوٹ بنایا گیا تھا اور نیچے لکھا تھا:

"Stop this march of imperialism."

چنانچہ حکومت نے اسے بغاوت کے الزام میں گرفتار کرلیا اور دو سال کی قید بھی سنادی لیکن وہ ڈیڑھ سال ہی میں باہر آگیا تھا۔ اس وقت تک سوبھو گیان چندانی بھی شانتی نکیتن سے کراچی آچکے تھے اور تعلیمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں میں مصروفِ عمل تھے۔ لیکن حشو نے جیل سے رہا ہوتے ہی سوبھو سے دوستی کی اور انھیں طلبا تحریک میں رہنمایانہ کردار ادا کرنے پر مجبور کردیا۔

اور بقول شیخ ایاز:

> ''حشو نے جیل سے نکلتے ہی سوبھو کے ساتھ پورے سندھ کا دورہ کیا اور کراچی سے سکھر تک طلبا تنظیموں کو نئے سرے سے منظم کیا۔ اس وقت سندھ کی پوری اسٹوڈنٹ کمیونٹی حشو کیول رامانی کے زیرِ اثر تھی۔ چنانچہ اسٹوڈنٹس یونینوں میں اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے حشو کیول رامانی نے سوبھو کو سندھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا سیکریٹری منتخب کرادیا۔''

اس زمانے میں طلبا تحریک کالجوں اور اسکولوں کی فیسیں کم کرانے کے لیے اور دوسری تعلیمی سہولتوں کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہی تھی جن میں مزید اسکول، کالج اور ہوسٹلز کے قیام کے مطالبے بھی شامل تھے۔

ابھی سوبھو ایل ایل بی کے دوسرے سال ہی میں تھے اور فائنل امتحانات کی تیاری شروع کرنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ برطانوی حکومت کے خلاف "Quit India Movement" (کوئٹ انڈیا موومنٹ — ہندستان چھوڑ دو تحریک) شروع ہوگئی تھی اور ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو ہندوستان کے کم و بیش تمام قوم پرست رہنما قید کرلیے گئے تھے۔ چونکہ یہ جنگِ عظیم دوم کے عروج کا زمانہ تھا، برطانوی حکومت ہندوستانیوں سے سختی کے ساتھ نمٹنے کا ارادہ کرچکی تھی۔ اس صورتِ حال کا اثر ملک کے دور دراز علاقوں میں بھی پڑ رہا تھا۔ ساری فضا انتہائی خطرناک حد تک دھماکا خیز بن چکی تھی۔ لہٰذا جگہ جگہ جلسے جلوس اور احتجاجی مظاہرے شروع ہوگئے تھے، جن میں طلبا تنظیمیں بھی پوری طرح سرگرم عمل ہوچکی تھیں۔ سندھ میں سوبھو گیان چندانی اور ان کے رفقا پیش پیش تھے۔ کراچی، حیدرآباد، نواب شاہ، سکھر، شکارپور اور

دوسرے چھوٹے بڑے شہروں میں ایک آگ سی پھیل گئی تھی اور تحریک کے لیڈر ایک ایک کر کے گرفتار ہوتے چلے جاتے تھے۔ سندھ کے چھوٹے بڑے شہروں سے کم وبیش چار پانچ ہزار طالب علموں سے جیلیں بھر گئی تھیں۔ سوبھو گیان چندانی طلبا تحریک کی قیادت کے سلسلے میں کبھی یہاں ہوتے، کبھی وہاں۔ پولیس جگہ جگہ ان کی بو سونگھتی پھرتی تھی لیکن یہ کوئی نہ کوئی بھیس بدل کر بچ نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے تھے، لیکن تابہ کے۔ آخر جب طلبا پر پولیس تشدد انتہا کو پہنچ گیا تو سوبھو صاحب نے بھی خود کو گرفتار کروا دینے کا فیصلہ کر لیا اور بالآخر ۲۵ رجنوری ۱۹۴۳ء کی صبح میٹھارام ہوسٹل کراچی کے ٹینس کورٹ سے تقریر کرتے ہوئے گرفتار ہو گئے۔ ان کے ساتھ طلبا کے ایک بڑے جتھے نے بھی اپنی گرفتاریاں پیش کیں تا کہ جو ساتھی جیل میں ہیں، ان کی ہمتیں بندھی رہیں۔ یہ سوبھو صاحب کی پہلی جیل یاترا تھی جو جولائی ۱۹۴۴ء تک جاری رہی۔ اس عرصے میں انھیں کراچی، حیدرآباد اور سکھر کی جیلوں میں رکھا گیا لیکن وہ بھلا جیل میں بھی کہاں چین سے بیٹھنے والے تھے۔ چنانچہ جس جیل میں بھی جاتے، اسٹڈی سرکل بناتے، ادبی سنگتیں قائم کرتے، بحث مباحثے برپا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بعض طلبا کو جن میں شاعری کے جراثیم تھے، انقلابی نظمیں لکھنے پر بھی اکسایا، خود بھی بعض سماجی وسیاسی موضوعات پر مضامین لکھے جن کی نقلیں جیل کے اندر اور باہر تقسیم کی جاتی تھیں۔

ابھی سوبھو صاحب جیل ہی میں تھے کہ عالمی سیاست نے ایک نئی کروٹ لی اور نازی ہٹلر نے سوشلسٹ روس پر حملہ کر دیا اور اس طرح روس کو جنگ میں ملوث کر دیا گیا تھا۔ اور روسی بلاک جرمنی، اٹلی اور جاپان یعنی Axis power کے خلاف برطانوی، امریکی، فرانسیسی اتحاد کے ساتھ حلیف بننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس صورتِ حال میں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اور سوشلسٹ تنظیمیں عالمی جنگ میں نہ تو مزید غیر جانب دار رہ سکتی تھیں اور نہ برطانوی حکومت کی مخالفت جاری رکھ سکتی تھیں۔ چنانچہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اس جنگ کو جسے وہ ۱۹۴۴ء تک فسطائی (Fasciest war) جنگ قرار دیتے تھے، 'عوامی جنگ' (people's war) کا درجہ دے دیا اور جنگ کے ایشو پر برطانوی حکومت کی مدد کرنے کی ٹھانی۔ اس فیصلے کے نتیجے میں ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی اور اس کی حلیف جماعتوں پر سے قانونی طور پر عائد پابندیاں اٹھالی گئیں اور بائیں بازو کے کارکنوں کو جیلوں سے رہائی حاصل ہو گئی، اسی فیصلے کے نتیجے میں فیض احمد فیض جیسے ترقی پسند شعرا نے برطانوی فوج میں ملازمتیں قبول کیں۔ اس وقت سوبھو صاحب جیل ہی میں تھے، انھیں بھی کمیونسٹ پارٹی نے پیغام دیا کہ وہ طلبا تحریک کو فی الفور ختم کر دیں اور جنگ کے حق میں بیان دے کر جیل سے باہر آ جائیں لیکن سوبھو صاحب نے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جنگ جس میں انسان مرتے ہیں اور انسانی تہذیب تباہ و برباد ہوتی ہے، راتوں رات 'فسطائی جنگ' سے 'عوامی جنگ' میں تبدیل نہیں ہو سکتی اور جیل سے آزادی حاصل کرنے کے بجائے

جیل ہی میں رہنا گوارا کیا۔ سوبھو صاحب کے اس فیصلے کا ایک منطقی جواز یہ بھی تھا کہ اس وقت صرف صوبہ سندھ میں کم و بیش پانچ ہزار طلبا جیلوں میں بند تھے اور وہ ان سب کی آزادی سے قبل خود جیل سے نکل آنے کو ایک مجرمانہ فعل سمجھتے تھے۔ بالآخر جولائی ۱۹۴۴ء میں حکومت نے یک طرفہ طور پر طالب علموں کو آزاد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس وقت تک سیاسی جماعتوں اور حکومت کے درمیان کئی گول میز کانفرنسوں کے ذریعے یہ بات کم و بیش طے ہوچکی تھی کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ہندوستان کو مکمل آزادی حاصل ہوجائے گی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان پاور شیئرنگ کے بابت مذاکرات بہرحال جاری رہے۔ بعد میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اس بات کو تسلیم کیا کہ سوبھو صاحب نے جیل سے رہائی کی خاطر طلبا تحریک کو ختم کرنے سے انکار کرکے طالب علموں میں بائیں بازو کے اثرات کو مزید مستحکم کیا ہے۔

سوبھو گیان چندانی ان لوگوں میں سے ہیں جو زندگی بھر اپنے ہی ضمیر کے قیدی بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اپنے سیاسی، سماجی اور تاریخی شعور، خیالات اور تصورات کی پاداش میں انھیں چھ مرتبہ قید و بند کی اذیتیں سہنی پڑی ہیں، وہ مجموعی طور پر کم و بیش دس سال مختلف قید خانوں میں پابندِ سلاسل رہے ہیں۔ جب کہ پانچ سال تک اپنے گاؤں بُندی میں نظر بند رکھے گئے۔ قید کے دوران چند ماہ بدنامِ زمانہ لاہور قلعہ میں بھی گزارے۔ قلعہ لاہور کی قید، ایذا دہی، عقوبت اور تشدد پسندی کے باب میں اپنی مثال آپ سمجھی جاتی ہے اور یہاں قید کیے جانے والے ضمیر کے قیدیوں کو آزادی کم کم ہی نصیب ہوا کرتی ہے۔ حسن ناصر بھی اسی قید خانے میں قتل کیے گئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۶۶ء تک کسی نہ کسی سیاسی الزام کی پاداش میں لگاتار انھیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑی ہیں۔

طلبا تحریکوں کے علاوہ انھوں نے سندھی معاشرے میں سماجی تبدیلیوں کے فروغ کے لیے بھی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ محنت کشوں اور ہاریوں کی تنظیموں میں بھی جس عزم، حوصلے اور انہماک وتن دہی کے ساتھ سوبھو گیان چندانی شریک رہے، اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہ بنیادی طور پر جمہوری مزاج، عوام دوست اور انقلاب پسند شخص ہیں اور ان کی تمام تر سرگرمیوں میں ان ہی اصولوں کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ شانتی نکیتن کے قیام کے دوران ان کے تعلقات ہندوستان کے مختلف انقلابی گروپس سے قائم ہوگئے تھے، ان میں سے کچھ سوشلسٹ اور کمیونسٹ عناصر بھی تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو آزادی کے حصول میں دہشت گردی اور انارکزم کے انسان کش ذرائع کے استعمال کو بھی جائز سمجھتے تھے اور برطانوی نظم ونسق کو مفلوج کرنے کے لیے قتل وغارت گری کو بھی درست خیال کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر کے ڈانڈے سبھاش چندر بوس کی ''آزاد ہند فوج'' سے بھی جاملتے تھے۔ سوبھو گیان چندانی اب جس سیاسی شعور اور انقلابی جدوجہد کے مرحلے میں تھے، اس کے تحت انھوں نے دہشت

پسندیت کے تمام حربوں کو نہ صرف ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے بلکہ ان کی کھل کر مخالفت بھی کی ہے اور اس سلسلے میں بعض انتہا پسند سیاسی جماعتوں کے دباؤ کو بھی پوری قوت کے ساتھ مسترد کر دیا تھا، جیسے ''ہیمو کالانی'' اور ''پر چوودھیارتی'' کی دہشت گرد تنظیم نے سوبھو صاحب کو ورغلانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انھوں نے غیر جمہوری طریقوں کو قبول کرنے سے یکسر انکار کر دیا تھا اور اس کی بجائے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے ان کے ذہنی روابط زیادہ مستحکم ہوتے چلے گئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۴ء میں قید سے رہائی پانے کے بعد ان کا بیشتر وقت سندھ میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم اور توسیع میں گزرنے لگا۔ یہاں تک کہ انھوں نے رہائش بھی پارٹی کے صدر دفتر اور کمیون میں اختیار کر لی تھی۔

ابھی سندھ میں کمیونسٹ تحریک کی جڑیں زیادہ مضبوط نہ ہوئی تھیں اور نہ وہ مسلم لیگ اور کانگریس کے مقابلے میں عوامی سطح پر کسی بڑے اجتماع کا انعقاد کر سکتے تھے۔ اس ماحول میں سوبھو صاحب سندھ میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کے سلسلے میں سیّد جمال الدین بخاری کے دست راست بنے تھے۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ سندھ میں عوامی سطح پر کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے جو پہلی تقریب منعقد کی گئی، وہ لینن کی سال گرہ تھی جو ۱۹۴۵ء میں منائی گئی تھی اور جس سے اہم کمیونسٹ رہنماؤں، ترقی پسند ادیبوں، طالب علموں اور ٹریڈ یونین ورکرز نے خطاب کیا تھا اور جسے سندھ میں کمیونسٹ تحریک کا باقاعدہ نکتہ آغاز سمجھا گیا۔ اس اجلاس میں بزرگ انقلابی ریلا رام میلا رام نے بھی شرکت کی تھی۔ یہ وہ بزرگ تھے جو کمیونسٹ پارٹی پر عتاب کے دنوں اور پابندی کے زمانے میں نیپیئر روڈ میڈیکل کالج کے کونے پر (جہاں آج کل حبیب بینک واقع ہے)، ایک ٹھیلہ لگایا کرتے تھے جس پر بہت معمولی چیزیں فروخت کے لیے ہوتی تھیں۔ ان کا حلیہ بھی ایک دہقانی غریب پھیری والے کا ہوتا تھا۔ یہ اپنی شکستہ پنجابی میں آواز لگاتے تھے۔ دراصل یہی ٹھیلہ اس وقت زیرِ زمین کمیونسٹ رہنماؤں اور ورکرز کے لیے قابل بھروسا رابطے کا ذریعہ ہوا کرتا تھا، کیوں کہ اس زمانے میں نہ صرف کمیونسٹ پارٹی پر پابندی تھی بلکہ اس کے ذیلی اداروں پر بھی کھلے عام سوشلسٹ خیالات کی تشہیر کرنے کی ممانعت تھی حتیٰ کہ ٹریڈ یونین سرگرمیاں اور طالب علم تنظیموں کو بھی شک و شبے کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

پہلا پاکستان ڈے۔ ۱۹۴۶ء

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر ہندوستان کی آزادی کا معاملہ کم و بیش طے ہو چکا تھا اور برطانوی حکومت بعد از خرابیِ بسیار ہندوستانیوں کے مکمل آزادی کے مطالبے کو تسلیم کر چکی تھی۔ گویا انگریزوں کا جانا ناگزیر ٹھہر گیا تھا۔ صبح گیا یا شام گیا۔ لیکن اس تاریخی فیصلے کی عملی جزئیات اور تفصیلات ہنوز طے ہونا

باقی تھیں اور اس سلسلے میں ہندوستان کی تمام اہم سیاسی پارٹیوں اور گروہوں کے درمیان باہمی مذاکرات جاری تھے اور ہندوستان کی آزادی کے بابت بیک وقت متعدد تجاویز، پلان اور اسکیمیں مختلف سطحوں پر زیرِ غور تھیں۔ ہندوستان کی فضا مجموعی طور پر غیر معمولی طور پر بے یقینی، بدگمانی اور شدید جذباتی تشنج کا شکار تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے رویوں میں یک گونہ کھنچاؤ پیدا ہو چلا تھا۔ مسلم لیگ مطالبۂ پاکستان پر اٹل تھی۔ اور مسلم آبادی والے علاقوں ہی میں نہیں بلکہ ان خطوں میں بھی جو پاکستان کی سرحدوں سے باہر تھے، مسلمان ''لے کے رہیں گے پاکستان'' اور ''بٹ کے رہے گا ہندوستان'' کے فلک شگاف نعرے لگاتے پھرتے تھے، دوسری جانب سیاست دانوں کا درمیانہ روطبقہ ایسا بھی تھا جو پاکستان کو ایک آزاد، خود مختار اور جداگانہ ملک کی بجائے ''پاکستان وِد ان ہندوستان'' (Pakistan within Hindustan) یعنی میانہ روسیاسی گروہ کو نوزائیدہ، بھارت اور نوزائیدہ پاکستان کے درمیان ایک کنفیڈریشن کے امکانات نظر آ رہے تھے، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا بھی ابتدا قوم پرستوں کے نکتہ نظر سے متفق تھی اور اس کی خواہش بھی یہی تھی کہ ملک تقسیم نہ ہو اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی سلوک اور برتاؤ کا کوئی ایسا سیاسی فارمولا نکال لیا جائے جس کی بنیادیں باہمی اعتماد اور افہام و تفہیم پر استوار ہوں لیکن جب تمام کوششیں یکے بعد دیگرے ناکام ہوتی چلی گئیں اور سیاسی معاملات ہی نہیں بلکہ ہندو مسلم بھائی چارے، تہذیبی اختلاط، یگانگت اور رواداری میں ایسے شگاف پڑنے لگے جن کا سدِباب ممکن ہی نہ رہا تھا ایسی مشکل صورتِ حال میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے ایک غیر معمولی اور دوررس فیصلہ کیا اور اس نے مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کی حمایت کا اعلان کر دیا اور پاکستان کے قیام کو ہندوستان کے مسلمانوں کا جمہوری حق قرار دیا۔ اس قرارداد کا اوّلین مقصد تو یہی تھا کہ آزادی کی تحریک جو کئی عشروں پر محیط تھی اور جسے اَن گنت شہیدوں کے خون سے سینچا گیا تھا، خوش گوار انداز میں بارآور ہو سکے اور تحریکِ آزادی کے اس آخری مرحلے میں ہندو مسلم عوام کو مذہبی عصبیتوں اور تہذیبی نفرتوں کے درمیان خون آشام تصادم اور اس کے مذموم اثرات سے محفوظ رکھا جا سکے۔ چنانچہ اس فیصلے کے تحت سب سے پہلے سندھ میں کمیونسٹوں اور بائیں بازو کے دانشوروں نے سندھ کی مسلم لیگی قیادت کے ساتھ مل کر ''پاکستان ڈے'' کا پروگرام تشکیل دیا۔ یاد رہے کہ پاکستان کے قیام کی پہلی قرارداد ۱۹۴۳ء میں سندھ اسمبلی ہی نے پاس کی تھی جسے جی ایم سیّد نے پیش کیا تھا اور جہاں مسلم لیگ کی اکثریت تھی۔ دراصل اس قرارداد ہی نے مطالبۂ پاکستان کو دستوری اور قانونی بنیاد فراہم کی تھی۔

'پاکستان ڈے' کے پروگرام کے تحت ۱۸ جنوری ۱۹۴۶ء کو کراچی میں ایک عظیم الشان ریلی کا اہتمام کیا گیا۔ اس جلوس میں مسلم لیگ کا پرچم سعید ہارون نے اٹھایا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کا سرخ جھنڈا کیرت بابانی نے بلند کیا تھا اور سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا پرچم سوبھو گیان چندانی کے ہاتھ میں تھا۔ کہا جاتا ہے

کہ پاکستان ڈے کا یہ پہلا تاریخی جلوس تھا جس میں مسلم لیگیوں کے علاوہ کمیونسٹوں کے زیر اثر مزدور یونینوں، ہاری تنظیموں اور طلبا کی جماعتوں نے شرکت کی تھی۔ جلوس کے اختتام پر ایک عظیم الشان جلسہ بھی منعقد ہوا تھا جس میں دیگر رہنماؤں کے علاوہ سوبھو صاحب نے بھی خطاب کیا تھا۔ اس جلسے کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

''اس جلسے میں، میں تقریر کر رہا تھا تو میرا مؤقف مسلم لیگی رہنماؤں سے قدرے مختلف تھا۔ اور ہم پاکستان کے مطالبے کو مذہبی عصبیتوں کی بجائے جمہوری بنیادیں فراہم کرنا چاہتے تھے۔ نیز ہماری خواہش تھی نوزائیدہ مملکت میں شروع ہی سے جمہوری اقتدار، عوام دوستی، معاشی انصاف، مذہبی رواداری سلوکِ باہمی اور عدلیہ کی آزادی ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے ان باتوں کا مسلم لیگیوں کے حلق سے اترنا مشکل تھا۔ چنانچہ محمود ہارون نے میری تقریر کے دوران مداخلت کرنے کی کوشش بھی کی۔''

اور کہا:

''مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کمیونسٹ پروپیگنڈا بند کرو'' لیکن اس کے بھائی سعید ہارون نے فوراً مداخلت کی اور کہا، ''سوبھو ہمارا دوست ہی نہیں بلکہ وہ سندھ کا خدمت گزار بھی ہے، اسے ہمارے پلیٹ فارم سے یہ بات کرنے کا حق ہے جیسا کہ ہم ان کے پلیٹ فارم پر جا کر اپنی بات کیا کرتے ہیں۔''

مسلم لیگ سے بائیں بازو کی مفاہمت کو وسیع اور مستحکم بنیادیں فراہم کرنے میں سیّد جمال الدین بخاری کا بھی نہایت وقیع کردار رہا ہے کہ ان کا تعلق علی گڑھ یونی ورسٹی سے رہا تھا اور گجرات کے جید اور عالم خاندان سے تعلق رکھنے کی بنا پر بھی مسلم لیگیوں سے روابط قائم کرنا ان کے لیے نسبتاً آسان تھا۔ چنانچہ سندھ کے مسلم لیگی حلقوں میں جمال الدین بخاری کا خاصا اثر و رسوخ تھا۔

رائل انڈین آرمی کی بغاوت

۱۹۴۶ء ہی میں انڈین نیشنل آرمی، رائل انڈین نیوی کی بغاوت کے دھماکہ خیز واقعات پیش آئے تھے جنھوں نے پورے ہندوستان کی سیاسی فضا کو شعلہ فشاں بنا دیا تھا۔ اس بغاوت کا اصل مرکز تو بمبئی تھا جہاں رائل انڈین نیوی کے نوجوانوں نے ہندوستان کی آزادی کے حق میں اور انگریز افسران کے ناروا سلوک کے خلاف بھوک ہڑتال شروع کی تھی جو ۱۷ر فروری سے ۲۳ر فروری تک جاری رہی تھی۔ یہ

سات دن ہندوستانی فوج کی تاریخ میں قومی حمیت اور حریت پسندیت کے یادگار دن کہے جاسکتے ہیں اور جس کے زیرِاثر آزادی کی تحریک میں زبردست تموج پیدا ہوا تھا۔ سندھ میں اس تحریک کے اثرات ۲۱۔ ۲۲ رفروری کو ظاہر ہوئے۔ ابتدا میں اس تحریک کی تائید اور ہمدردی میں کانگریس، مسلم لیگ اور کمیونسٹوں کے درمیان اتحاد قائم ہوا تھا اور اسی اتحاد کے تحت ۲۱ رفروری کو احتجاج اور ۲۲ رفروری کو مکمل ہڑتال کے اعلان کیے گئے تھے۔ ادھر انگریز حکمرانوں نے بھی احتجاج اور ہڑتال کو سختی کے ساتھ کچلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ چنانچہ احتجاجی جلوس پر آنسو گیس اور لاٹھی چارج بھی کیا گیا اور سیکڑوں کی تعداد میں احتجاجی کارکنوں کو گرفتار کرلیا گیا، ان ہی میں سوبھو گیان چندانی بھی شامل تھے، اور اندر کمار گجرال بھی۔ دوسرے دن جلسہ بھی منعقد ہوا جس میں مسلم لیگ اور کانگریس کے نمائندوں نے مصلحت پسندانہ تجاویز پیش کیں لیکن معاملہ احتجاجی رہنماؤں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ سوبھو صاحب اور ان کے رفقا ایک دن قبل ہی گرفتار ہوچکے تھے اور کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جو احتجاج کرنے والے عوام کے جذبات پر قابو پاسکتا چنانچہ تشدد کی کارروائیاں شروع ہوئیں اور آخرکار فائرنگ کے نتیجے میں کم و بیش گیارہ آدمی ہلاک ہوئے۔ سوبھو صاحب کو سات آٹھ دن کی قید کے بعد چھوڑ دیا گیا تھا۔ رائل انڈین نیوی کی بغاوت میں معروف سندھی ادیب علی احمد بروہی نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا اور انھوں نے سب سے پہلے اس تحریک کی تفصیلات کو سندھی زبان میں محفوظ کیا ہے۔

Hasnain Sialvi

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
(ٹریڈ یونین سرگرمیاں)

سوبھو گیان چندانی کا تعلق اس نسل سے ہے جس کی ساخت پرداخت علم و فکر، عقل و دانش اور منطق و استدلال ہی سے عبارت نہ تھی بلکہ یہ لوگ اپنے آدرش میں مکمل یقین اور پُرخلوص انہماک کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے میں بھی کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں اپنی صلاحیت کی بنیاد پر بہترین آسائشیں، راحتیں، مال و دولت اور جاہ و منصب حاصل ہوسکتے تھے لیکن معاشرتی فلاح و بہبود اور انسانوں کے لیے اجتماعی خیراندیشی کے احساس نے انھیں شخصی مفادات اور ذاتی منفعتوں سے بالاتر کر رکھا تھا۔ شانتی نکیتن سے واپسی کے بعد جہاں سوبھو صاحب نے مختلف و متنوع سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا، وہیں ہندوستان کے سب سے مظلوم اور ناآسودہ طبقات یعنی محنت کشوں اور ہاری کھیت مزدوروں کی فلاح و بہبود کے امور میں بھی دلچسپی لینی شروع کردی تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک انھوں نے سندھ کی مزدوروں ٹریڈ یونینوں میں عملی خدمات انجام دیں اور مزدور

تنظیموں کو ایسے جدید خطوط پر منظم کیا جن میں آجر اور اجیر، صنعت کار اور محنت کش کے درمیان بہترین عملی افہام و تفہیم کی فضا پیدا ہو سکے اور جس کے نتیجے میں صنعتی ترقی اور معاشی بہبودی کے نئے امکانات تلاش کیے جا سکیں۔ انھوں نے ٹریڈ یونین تحریک کو محض ہڑتال اور صنعتی کشیدگی کی فضا سے نکالنے کے لیے دونوں فریقوں کے درمیان مذاکرات اور باہمی گفت و شنید کی صحت مند روایت کو تقویت پہنچائی۔ اس سے قبل جمال الدین بخاری سندھ میں کمیونسٹ تحریک اور اس کے زیرِ اثر ذیلی تنظیموں کو منظم کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ وہی ٹریڈ یونین تحریک کی بھی رہنمائی کرتے تھے۔ قاضی مجتبیٰ اور نارائن داس بیچر ان کے معاون تھے۔ اس زمانے میں بھی کراچی شہر ٹریڈ یونین کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ ۱۹۴۵ء تک پورے سندھ میں کل ساڑھے چار سو فیکٹریاں اور کارخانے تھے جن میں بیالیس ہزار محنت کش کام کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر چھوٹے کارخانے تھے جن میں چاول صاف کرنے کے کارخانے، فلور ملز، چمڑا رنگنے کی ٹینریز، ذبیحہ خانے اور کولڈ اسٹوریج بھی شامل تھے جہاں مزدوروں کی تعداد کم ہوتی تھی، وہاں نہ تو یونین سازی کی اجازت تھی اور نہ امکان۔ بڑے کارخانوں میں سیمنٹ، اسلحہ سازی، کاٹن، ٹیکسٹائل اور ری رولنگ کے کارخانے تھے جن میں سے اکثر کراچی میں واقع ہوئے تھے۔ لیکن سب سے اہم منظم اور طاقت ور یونین ریلوے ورکرز یونین تھی جس کے مراکز کراچی، کوٹری، حیدرآباد، روہڑی، جیکب آباد میں تھے۔ کراچی کی بندرگاہ میں بھی جہاز سازی اور جہازوں کی مرمت سے متعلق بعض ورک شاپس موجود تھے جہاں محنت کشوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ شہری مزدوروں بالخصوص غیر ہنر مند مزدوروں کی معاشی اور قانونی حالت انتہائی مخدوش تھی۔ ان دنوں مرد مزدوروں کی اجرت ایک روپیہ دو آنے اور عورتوں کی اجرت تیرہ آنے ہوتی تھی اور شدید موسم گرما میں اوقاتِ کار بارہ گھنٹے سے متجاوز تھے۔ مزید برآں انھیں کسی قسم کی مراعات، ہفتہ واری چھٹی اور طبی سہولتیں حاصل نہ تھیں۔ چنانچہ سندھ کے محنت کشوں کی حالتِ زار ہندوستان کے دوسرے صنعتی علاقوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ دگرگوں تھی۔ ہر چند ۱۹۴۰ء کے بعد بائیں بازو کے اثرات ہر شعبے میں بڑھے تھے اور سندھ کی ٹریڈ یونین تنظیموں میں بھی اس کے اثرات موجود تھے، خاص طور پر ریلوے یونین میں محمد ابراہیم اور سی آر اسلم جیسے رہنماؤں کے مضبوط اثرات تھے لیکن شہروں کی ٹریڈ یونین تحریک صرف کراچی کے بیڑی ورکرز یونین، ہوٹل ورکرز یونین اور تانگہ ورکرز وغیرہ تک محدود ہوتی تھی، ہر چند ان یونینوں کے اراکین کی تعداد بہت تھی لیکن صحیح معنوں میں انھیں صنعتی مزدور نہیں کہا جا سکتا تھا۔ سوبھو گیان چندانی نے ٹریڈ یونین تحریک میں دلچسپی کا آغاز ہی ایک صنعتی یونٹ میں یونین کی تشکیل سے کیا تھا۔ یہ ایک کیمیکل ڈرم بنانے کا کارخانہ تھا جس کا نام ''کیمیکل بیرل فیکٹری'' تھا اور جو ریلوے پراپرٹی (جہاں آج کل روزنامہ ''جنگ'' کا دفتر ہے) پر واقع تھا۔ اس فیکٹری میں کیمیکل گیس تیار ہوتی اور انھیں گیس کے سلنڈر میں بھرا جاتا تھا اور ہندوستان

کے دوسرے صنعتی علاقوں میں بھیجا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کی خاصی کھپت تھی۔ سوبھو صاحب اس یونین کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے۔ انھوں نے سب سے پہلے لیبر قوانین اور دیگر متعلقہ قواعد کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ کیا اور اس مطالعے کی روشنی میں انتظامیہ کو ایک پیشگی نوٹس برائے مذاکرات ارسال کر دیا۔ اس زمانے میں مسٹر ہولٹ کراچی کے ڈپٹی کمشنر بھی تھے اور لیبر کمشنر بھی۔ چنانچہ انھوں نے سوبھو صاحب کو طلب کیا اور پوچھا کہ آپ تو کمیونسٹ ہیں پھر آپ نے ہڑتال کرنے کی بجائے پیشگی مذاکرات کا نوٹس کیوں کر دیا ہے اور اس کے اصل مقاصد کیا ہیں؟ سوبھو صاحب نے اس سوال کے جواب میں مدلل تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اسٹرائک تو محنت کشوں کا آخری حربہ ہوتا ہے اور یہ قطعی ضروری نہیں کہ مزدوروں کی بھلائی اور صنعت کی ترقی کے نام پر ہڑتال ہی کا ذریعہ اختیار کیا جائے بلکہ اس نوٹس کے ذریعے ہم انتظامیہ کی توجہ ان چند نکات کی طرف دلانا چاہتے ہیں جن پر غور و غوض کر کے ایسی صورتِ حال پیدا کی جاسکتی ہے جس میں محنت کشوں کی بھلائی اور بہتری کا راستہ بھی نکل سکتا ہے اور کارخانے کی پروڈکشن میں بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کام کے لیے اگر آپ ایڈجوڈیکیٹر (adjudecator) کونسلر مقرر کر دیں تو اس کے سامنے تجاویز پیش کی جاسکتی ہیں اور اس کی سفارش پر عمل درآمد کیا جاسکتا ہے۔ مسٹر ہولٹ کو سوبھو صاحب کی تجویز بہت معقول معلوم ہوئی اور انھوں نے مزدور رہنماؤں سے مذاکرات کے لیے باقاعدہ نمائندہ مقرر کر دیا جس کی سفارشات پر نہ صرف یونین کے وجود کو باقاعدہ اور قانونی طور پر تسلیم کیا گیا بلکہ مزدوروں سے نئی شرائط پر معاہدے بھی کیے گئے — اسی طرح ایک اور یونین کی جانب سے ان کے مطالبات کے حق میں جسٹس چارلس لوبو کے روبرو پیروی کرتے ہوئے انھوں نے ایسی مدلل بحث کی کہ عدالت مذکورہ کے جج کو یہ کہنا پڑا:

''مسٹر سوبھو! آپ تو ٹریڈ یونین ورکرز سے زیادہ ایک کامیاب وکیل ثابت ہوئے ہیں۔ کیا آپ اپنے پروفیشن کی بنیاد مضبوط کر رہے ہیں۔''

Mr. Sobho you are making your profession, you could become a good lawyer.

سوبھو صاحب نے جواب دیا:

''سر میں قانون کی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کا ارادہ ضرور رکھتا ہوں۔''

کراچی سٹی ورکرز یونین میں کام کرنے کے لیے اس وقت سوبھو صاحب کو صرف بیس روپے ماہانہ ملتے تھے جس میں زیادہ تر رقم آمد و رفت کے کرائے میں صرف ہو جاتی تھی۔ اس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کے ہول ٹائمر کا ماہانہ وظیفہ تیس روپے ہوا کرتا تھا۔ مزدور تحریک میں عملی سرگرمی ہی کے زمانے سے ان کے نام کے ساتھ ''کامریڈ'' کا لاحقہ ایسا لگا کہ اب ان کے نام کا لازمی جز بن گیا ہے اور سندھ بلکہ بیرونِ

سندھ بھی وہ کامریڈ سوبھو گیان چندانی ہی کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان پر جو تحقیقی اور تحریری کام ہوا ہے، اس میں بھی ان کا نام کامریڈ سوبھو گیان چندانی ہی لکھا گیا ہے۔

مزدور تحریک میں سوبھو گیان چندانی کی اسٹریٹیجی یہ تھی کہ محنت کشوں کو ان کے اپنے مسائل کے ساتھ ساتھ سماجی صورتِ حال اور سیاسی و معاشی مسائل سے مکمل آگاہی فراہم کی جانی چاہیے۔ چنانچہ اپنے زیرِ اہتمام ٹریڈ یونین تنظیم میں اسٹڈی سرکلز کے قیام کا اہتمام بھی لازمی طور پر کیا کرتے تھے، مزید برآں وہ ہڑتال اور دوسرے احتجاجی طریقوں کو محنت کشوں کے آخری حربے کے طور پر استعمال کرنے کے قائل تھے اور مل مالکان اور آجروں سے مذاکرات اور باہمی افہام وتفہیم کو اولیت دیتے تھے جس کے لیے مزدوروں سے متعلق قوانین کا جاننا اور تنظیم سازی وغیرہ کی بابت رولز اور ریگولیشنز سے آگہی ضروری سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے رفقائے کار کو ان امور میں خصوصی توجہ دینے اور مزدوروں کے چارٹر آف ڈیمانڈ کی ترتیب میں حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کی تربیت دی تھی، ان کے نزدیک ملک میں صنعتی ترقی بجائے خود محنت کشوں کی بہبود کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ لہٰذا مزدور رہنماؤں کو ایسی فضا پیدا کرنے کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے جو پیداواری قوت میں اضافے کا باعث بن سکے۔ اس سلسلے میں وہ اپنا ایک قصہ سناتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ کیمیکل بیرل کے سروے آفیسر نے انھیں ایک میٹنگ میں بتایا کہ ان لوگوں نے کمیونسٹوں کے دباؤ سے نجات پانے کے لیے طے کرلیا ہے۔ کراچی کے پلانٹ کو بند کر کے سنگاپور منتقل کر دیا جائے۔ اس پر میں نے ان سے کہا:

> ''یہاں تو ہم اپنی سرگرمیوں کو قانون کے اندر ہی رکھتے ہیں اور ان قانون کی پاس داری کا مطالبہ فیکٹری کی انتظامیہ سے کرتے ہیں۔ آپ یہاں سے جانے کی بجائے اپنے پلانٹ کو مزید ترقی دینے کی سوچیں، کیوں کہ اگر آپ کمیونسٹوں کے خوف سے یہاں سے راہِ فرار اختیار کریں گے تو کیا آپ وہاں کمیونسٹوں سے محفوظ رہ پائیں گے، کیوں کہ ظلم کی کارروائی کے خلاف مدافعت خود بہ خود پیدا ہو جایا کرتی ہے۔''

ان کی اس گفتگو کے نتیجے میں بیرل پلانٹ کی منتقلی کا معاملہ ٹل گیا۔

ایسا ہی ایک اور تجربہ انھیں ''برٹش اوورسیز یونین'' کے سلسلے میں انگریز افسروں سے پیش آیا تھا۔ کراچی کے ساحل سمندر پر ایک بحری اور ہوائی اڈہ قائم تھا جہاں سمندری اور ہوائی جہازوں کی فوری مرمت کے لیے ورک شاپ موجود تھے جن میں ہندوستانی خلاصیوں، مزدوروں اور کلرکوں وغیرہ کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ یہ خلاصی اور مزدور بندرگاہ سے کشتیوں کے ذریعہ سامان لاد کر جہازوں پر چڑھاتے اور اسی طرح ان لوڈنگ کا کام کیا کرتے تھے جو خاصا محنت طلب اور مشکل کام تھا اور انھیں بھی آئے دن

مسائل کا سامنا رہا کرتا تھا۔ چنانچہ سوبھو صاحب نے یہاں بھی یونین کی داغ بیل ڈال دی، جس کا حکومت نے فوری نوٹس لیا اور ایک خط کے ذریعے بندرگاہ کے علاقے میں یونین بنانے کا جواز طلب کیا۔ سوبھو صاحب نے اس نوٹس کا جواب دیا اور سرکاری عمال پر ثابت کر دیا کہ گودی مزدور یونین بنانے کا حق رکھتے ہیں اور ان کی یونین محنت کشوں کے تحفظات کے ساتھ ساتھ خود انتظامیہ کے لیے بھی آسانیاں پیدا کرتی ہیں کیوں کہ اس کے ذریعے اجتماعی طور پر ڈسپلن اور قواعد پر عمل درآمد ممکن ہو سکتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جہاں ملک میں صنعت و حرفت نے ترقی کی، وہیں ٹریڈ یونین میں بھی وسعت اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی گئیں، ملک کی سیاست پر عوام دشمن مفادات کا شکنجہ تنگ ہوتا گیا اور بندۂ مزدور کے حالات تلخ سے تلخ تر ہوتے چلے گئے اور ایسے قوانین وجود میں آتے چلے گئے جو مزدوروں کے حقوق کو سلب کرنے میں مددگار تھے جس کے خلاف طویل قانونی جنگ بھی لڑنی پڑی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں میں ٹریڈ یونین رہنماؤں اور ورکرز کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ یہ لوگ ہندوستان کے صنعتی علاقوں سے آئے تھے اور محنت کشوں میں کام کرنے کا خاصا تجربہ رکھتے تھے۔ ان میں حسن ناصر، سلام بخاری، محمد اشرف، ڈاکٹر اعزاز نذیر وغیرہم شامل تھے۔

ہاری تحریک — الائی مووومنٹ

تاریخی اعتبار سے سندھ ہمیشہ ہی جاگیرداری کے شکنجے میں پھنسا رہا ہے۔ مغلوں کے دور میں جاگیرداری نظام کو بہت تقویت حاصل ہوئی تھی اور انگریزوں نے مغلیہ دور کی باقیات کو نہ صرف برقرار رکھا تھا بلکہ مزید تقویت اور تحفظ فراہم کیا تھا اور بااثر قبائلی سرداروں، مذہبی گدی نشینوں اور خانقاہوں کو بھی جاگیریں بخشی گئی تھیں۔ مقامی سرداروں، جاگیرداروں، پیروں، مذہبی اثر و رسوخ رکھنے والے افراد کو جن کی مدد اور تعاون کمپنی بہادر کی حکومت کے قیام اور استحکام میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ ان افراد اور اداروں کے حق میں ''اسنادِ وفاداری'' اور ''آفرین نامے'' تقسیم کیے گئے اور انھیں نئے نئے خطابات اور انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ اس طرح تاجِ برطانیہ کے وفادار حلیفوں پر مشتمل ایک ایسے مؤثر اور طاقت ور طبقے کو سندھ کے عوام پر مسلط کر دیا گیا جو دن بہ دن زیادہ سے زیادہ معاشی وسائل پر قابض ہوتا چلا گیا اور زمینوں پر کاشت کرنے والا غریب کسان اور ہاری آئے دن مفلوک الحال اور فاقہ کش ہوتا چلا گیا۔ صوبے کی اسی فی صد قابلِ کاشت زمینوں پر جاگیردار اور بڑے زمیں دار متصرف تھے جو ہاریوں اور کھیت مزدوروں سے بٹائی پر زمین کاشت کرواتے تھے اور بٹائی کا نرخ بھی نہایت معمولی تھا یعنی ہاری فصل تیار کرنے کے بعد صرف ایک چوتھائی فصل کا حق دار ٹھہرتا تھا اور ساری فصل زمیں دار اور اس کے

کارندے اٹھا لے جاتے تھے۔ اس ایک چوتھائی فصل میں سے بھی جاگیرداروں اور زمیں داروں کے طاقت ور کارندے، دلال، مقدم، نمبردار اور محکمۂ آب پاشی و زراعت کے عمال اپنا اپنا حصہ بٹایا کرتے تھے۔ زمیں دار اور جاگیردار زرعی پیداوار میں نہ تو حصہ لیتے تھے اور نہ وہ ہاری کو دوسری ضروری سہولتیں فراہم کیا کرتے تھے۔ غیر حاضر زمیں داری (absentee landlordism) کا سب سے مضبوط نظام سندھ ہی میں قائم ہے جسے حکومتی، سیاسی، مذہبی اور اخلاقی اداروں کی مکمل اعانت بھی حاصل رہی ہے۔ چنانچہ برطانوی راج سے قبل تو حکمرانوں اور عام لوگوں میں وہی رشتہ رہا تھا جو مطلق العنان حکمرانوں اور بے کس اور بے سہارا رعیت کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ برطانوی راج میں بھی بعض قانونی اصلاحات کے باوجود جہاں تک سندھ کے کاشت کاروں اور ہاریوں کا تعلق ہے، کوئی خاص تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی اور نہ صرف ریاست کے انتظامی محکموں (عدلیہ، پولیس اور ریونیوڈپارٹمنٹ) کی سرپرستی جاگیرداروں اور زمیں داروں ہی کو حاصل تھی اور جملہ معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی اقدار، اصول اور ضابطے ان ہی طاقت ور طبقات کے مفادات کو پیشِ نظر رکھ کر بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی ہی سے ہاریوں کی زبوں حالی کا احساس پیدا ہو چلا تھا اور ہاری حق دار تحریک کی بنیاد ڈالی جا چکی تھی۔ بائیں بازو کے بڑھتے ہوئے اثرات نے اس تحریک کو مزید تقویت پہنچائی تھی۔ اس ضمن میں کامریڈ عبدالقادر، جیٹھ مل پرس رام، حیدر بخش جتوئی، جمال الدین بخاری، شیخ عبدالمجید سندھی، کامریڈ نذیر لغاری، قاضی فیض محمد، عبدالقادر نظامانی، سائیں عزیز اللہ، غلام محمد لغاری، مولوی نذیر جتوئی، عزیز اللہ جردار، عبدالقادر کھوکھر وغیرہم شامل تھے۔ اس سلسلے میں کراچی میں صنعتی محنت کشوں اور کسان تنظیموں پر مشتمل ایک عظیم الشان کانفرنس ۱۹۴۵ء میں منعقد ہوئی تھی جس میں سندھ کے ہاریوں کی حالتِ زار پر غور و خوض کرنے کے بعد ہاری تحریک کو منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور ایک انتظامی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس میں متعدد ہاری رہنماؤں کے علاوہ سوبھوگیان چندانی بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے سندھ کے تمام اہم مراکز میں سندھ ہاری حق دار تحریک کی شاخیں قائم کیں اور ان کے درمیان فکری و عملی اتحاد اور ربط پیدا کرنے کے لیے نہایت اہم اور دور رس اقدام اٹھائے۔ ہاریوں کی تکالیف کا براہِ راست مشاہدہ کرنے کے لیے ہاری رہنماؤں نے تواتر کے ساتھ دورے کیے اور ضلعی مراکز میں ہاری پبلک پکار آفس قائم کیے گئے۔ کئی شہروں سے اخبارات بھی نکالے گئے تاکہ ہاریوں کے مطالبات کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کی جا سکے اور حکومتی حلقوں کی توجہ ان کے مسائل کی طرف دلوائی جا سکے۔ اسی سلسلے میں آل انڈیا کسان سبھا کا تعاون بھی حاصل کیا گیا جس کی وجہ سے سندھی ہاریوں کے مسائل سندھ کی سرحدوں سے نکل کر ملک گیر سطح پر متعارف ہوئے اور ہندوستان کی سیاسی جماعتوں سے بھی خاطر خواہ ہمدردی اور تقویت حاصل کرنے کے امکانات پیدا ہوئے۔ سوبھوگیان چندانی نے قیامِ پاکستان کے بعد "ہاری الائی تحریک" کے ذریعے

سندھ کی ہاری جدو جہد کو ایک نئی جہت اور تقویت فراہم کی تھی۔ اس اسکیم کے تحت انھوں نے حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا تھا کہ متروکہ اراضی کا ایک مخصوص حصہ بے زمین ہاریوں کو بھی الاٹ کیا جائے اور اس پر انھیں مالکانہ حقوق دیے جائیں تا کہ وہ صدیوں پرانی معاشی ناانصافیوں سے نجات حاصل کر سکیں اور اپنی محنت سے ملک کی زرعی خوش حالی میں بھی اضافہ کر سکیں۔ الاٹی اسکیم کو سندھ ہاری تحریک کی پوری مدد اور تقویت حاصل ہوئی۔ اسی طرح ہاری تحریک نے سندھ کے بیراج سے آباد ہونے والی اراضی میں ہاریوں کے لیے زمین مخصوص کرنے کی بھی مہم چلائی تھی جسے خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں

سوبھو گیان چندانی کا شمار جدید سندھی ادب کے ان معماروں میں سرِ فہرست ہوتا ہے جنھوں نے گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصے میں کئی نسلوں کی تربیت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ خاص طور پر سندھی ادب اور معاشرے میں ترقی پسند تصورات، خیالات، اور رویوں کو مقبول بنانے کے سلسلے میں ان کی کاوشیں نہایت اہم ہیں — وہ لڑکپن ہی سے قدیم و جدید ادب کے نہایت سنجیدہ قاری رہے ہیں اور ادب کے علاوہ مذہب و اخلاقیات، تاریخ و تمدن، فلسفہ و منطق، معاشیات و سیاسیات اور معلوماتِ عامہ میں غیر معمولی مطالعے نے ان کے ذہنی افق کو وسعت اور جذبہ و احساس میں گہرائی پیدا کیے، شانتی نکیتن کے قیام کے دوران انھیں نہ صرف مغربی زبانوں کے کلاسیکل ادب اور جدید ترین تخلیقات کی زیادہ بہتر تفہیم حاصل کرنے کے مواقع ملے تھے بلکہ مغرب و مشرق میں جاری مختلف و متنوع فکری، تہذیبی اور ادبی رویوں اور تحریکوں کو بھی سمجھنے کی ترغیب ہوئی تھی۔ شانتی نکیتن جانے سے پہلے ہی وہ ٹیگور کی شاعری اور فکشن کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ سندھی، بنگالی، ہندی، فارسی اور اردو زبان کے کلاسیکل اور جدید ادب پر انھیں خاصی دسترس حاصل تھی، اسی طرح روسی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبان کے شہ پارے بھی ان کی نگاہ میں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انقلابِ فرانس کے بعد جدید مغربی تصورات اور سائنسی فکری رویوں کا کماحقہٗ استدراک کیے بغیر عہدِ حاضر کے کسی سوال کا خاطر خواہ جواب نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ گزشتہ تین چار سو سال میں پیش آنے والی جملہ فکری و نظری تحریکیں اور ان کے اثرات سوبھو گیان چندانی کے زیرِ مطالعہ رہے ہیں۔ سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نکتہ ہائے نگاہ اور دونوں مکاتیبِ فکر کے بنیادی شارحین کو جس زیرکی کے ساتھ انھوں نے اپنے علم و آگہی کا حصہ بنایا ہے، اس نے ان دونوں نظاموں سے متعلق موضوعات پر انھیں غیر معمولی تصرف اور دسترس دے دی ہے۔ اور ان سب باتوں پر مستزاد یہ بات ہے کہ سوبھو صاحب صرف کتابی کیڑے اور محض ذوقِ مطالعہ کے اسیر نہیں رہے ہیں بلکہ روزمرہ زندگی کی کشاکش میں عملاً پل پل شریک رہے ہیں۔ وہ وادیٔ سندھ کے جمود آشنا معاشرے میں زندگی آموز تحرک پیدا کرنے اور عوام کو صدیوں سے جاری ظلم، ناانصافی، جہالت، غربت اور تنگ نظر عصبیتوں

سے نجات دلا کر روشن خیالی، جمہوری اور خوش حالی کی دولتِ بے بہا سے ہم کنار کرنے کا خواب دیکھتے رہے ہیں۔ یہی وہ آدرش ہے جس نے انھیں عمر بھر سرگرمِ عمل رکھا اور جس کی ضرورت اور توانائی سے وہ اب بھی یک گونہ سرشار رہتے ہیں۔

سندھ کی ادبی فضا

سوبھو گیان چندانی جب ۱۹۴۲ء میں شانتی نکیتن سے واپس لوٹے ہیں تو وہ اکیس برس کے کشیدہ قامت مردانہ وجاہت ہی کا پیکر نہ تھے بلکہ فکری طور پر سوشلسٹ خیالات اور تحریکوں کی جانب ان کا جھکاؤ بھی واضح ہو چکا تھا۔ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں ان کی دلچسپی نے انھیں ہندوستان گیر شہرت بخشی تھی اور وہ ایک طالب علم رہنما کی حیثیت سے جانے پہچانے جانے لگے تھے۔ ہندوستان کے منظرنامے میں جو سیاسی، سماجی اور فکری تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں، وہ ان تبدیلیوں سے نہ صرف آگہی رکھتے تھے بلکہ کسی نہ کسی سطح پر ان کے نقیب اور ہمدرد بھی تھے۔ سندھی معاشرے کی فرسودگی اور نکبت تو ان کے سامنے تھی لیکن شانتی نکیتن کے سفر نے انھیں ہندوستان کے دوسرے خطوں کی تاریک و نیم تاریک تصویریں بھی دکھا دی تھیں اور وہ اس بات کو اپنا مقصود بنا چکے تھے کہ ہر باشعور اور تعلیم یافتہ فرد کو انسانوں کے درمیان بغیر کسی تخصیص و تفریق کے علم و شعور کی روشنی پھیلانے کے لیے مسلسل کام کرنا چاہیے۔ چنانچہ عملی زندگی کے آغاز ہی سے انھوں نے اس مقصد کو ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھا۔ اس وقت سندھ اور بالخصوص کراچی سیاسی اور سماجی گہما گہمی کا مرکز بنا ہوا تھا اور ان کے دوستوں کا اچھا خاصا حلقہ موجود تھا جو کسی نہ کسی سطح پر سرگرمِ عمل تھا۔ حشو کیول رامانی نے جو ایک پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ایک طرف طلبا تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے تو دوسری طرف علم و ادب کے محاذ پر ہم ذوق ساتھیوں کا ایک فعال گروپ بنا رکھا تھا۔ سوبھو گیان چندانی کے ذاتی دوستوں میں لیکھو تلسانی، کیول تلسانی، گوبند مالھی وغیرہم تھے۔ اُدھر ڈی جے سائنس کالج میں ڈاکٹر ایچ ایم گربخشانی نے ایک تنظیم سندھی ادبی سرکل کے نام سے قائم کر لی تھی جس میں تمام روشن خیال ادیب، شاعر طالب علم اور پروفیسر صاحبان شریک ہوا کرتے تھے۔ ان میں ڈاکٹر گربخشانی، پروفیسر رام پنجوانی، کاکو بھیرو مل، لال چند امر ڈنومل، عثمان علی انصاری اور ڈاکٹر گلی سدارنگانی وغیرہ جیسے سینئر ادیب و شاعر بھی تھے اور گوبند مالھی، نارائن شیام، حشو کیول رامانی، لیکھو تلسانی، سوبھو گیان چندانی، شیخ ایاز اور عبدالرزاق راز جیسے روشن خیال اور ترقی پسند ادیب اور نئے لکھنے والے بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ سوبھو صاحب نے دورانِ گفتگو بتایا کہ سندھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین (PWA) کی کوئی باقاعدہ تنظیم تو قائم نہیں ہوئی تھی لیکن جب جولائی ۱۹۴۴ء،

میں وہ جیل سے باہر آئے تو ایک ہفتے کے اندر اندر ''سندھی ادبی سنگت'' کی داغ بیل ڈال دی گئی تھی۔ یہ تنظیم دراصل انجمن ترقی پسند مصنفین کی نعم البدل تھی کیوں کہ مقامی حالات کا تقاضا تھا کہ ترقی پسند خیالات اور مقاصد کو بروے کار لانے کے لیے یہاں ذرا زیادہ وسیع البنیاد طریقۂ کار اختیار کیا جائے، سندھی ادبی سنگت کے پہلے ہی جلسے میں شیخ ایاز نے اپنی مشہور انقلابی نظم ''باغی'' پیش کی تھی۔ وہ تحریکِ آزادیِ ہند کے عروج کا زمانہ تھا۔ چنانچہ شیخ ایاز کی نظم دیکھتے دیکھتے سندھ کے طول و عرض میں مشہور ہوگئی۔ ہر چند سندھ میں ترقی پسند ادب کی تنظیم یعنی سندھی ادبی سنگت ۱۹۴۴ء میں قائم ہوئی تھی لیکن سوبھو گیان چندانی نے یہ بات صراحت کے ساتھ بتائی ہے کہ ترقی پسندیت کے بنیادی عناصر یعنی حقیقت پسندیت، جمہور کے دکھ درد کا احساس، انسان دوستی، مذہبی و تہذیبی رواداری، حب الوطنیت اور امن پسندی وغیرہ شروع ہی سے سندھی معاشرے، ادب اور شاعری میں داخل رہے ہیں جس کی بیّن مثالیں شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست اور چین رائے سامی جیسے کلاسیکل شعرا کے ہاں سے پیش کی جاسکتی ہے اور جدید دور میں جس کا آغاز بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں ہی میں ہوگیا تھا اور مرزا قلیچ بیگ اور ان کے ہم عصروں نے انگریزی، اردو، ہندی، فارسی، بنگالی، گجراتی اور روسی زبان کے تراجم سے سندھی زبان و ادب کو مالا مال کر دیا تھا۔ اس زمانے میں خالص تراجم سے زیادہ تلخیص adoptation کا طریقِ کار رائج تھا یعنی دوسری زبان کے فن پاروں میں کرداروں کے نام تبدیل کر دیے جاتے تھے تاکہ سندھی ماحول کا تاثر پیدا ہو سکے۔ طبع زاد کہانیاں بہت کم لکھی جا رہی تھیں، منگھا رام ملکانی کی روایت کے مطابق بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک موپساں، چیخوف، گورکی، پرل ایس بک، ہیمنگ وے، تالستائی، خلیل جبران، بنکم چندر چٹرجی، شرت چندر چٹرجی، پریم چند، سدرشن، نیاز فتح پوری، رتن ناتھ سرشار، اوپندر ناتھ اشک، مجنوں گورکھ پوری وغیرہ اور بعد کے عشروں میں خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کے شاہکار بھی سندھی زبان میں منتقل ہو چکے تھے لیکن طبع زاد افسانے کہانیاں لکھنے والوں میں امر لعل ہنگورانی، آسانند مامتورا، عثمان علی انصاری اور مرزا قلیچ بیگ کے فرزند مرزا نادر بیگ کے نام شامل ہیں۔ سوبھو گیان چندانی نے مزید بتایا کہ ہم نے لکھنے والوں کو ترغیب دی کہ وہ طبع زاد افسانے لکھیں جن میں سندھی کی معروضی صورتِ حال کی عکاسی کی جا سکے۔

۱۹۴۲ء ''**نئین دنیا**'' (نئیں دنیا) کتاب گھر شکار پور سے گوبند پنجابی نے ''**سرد آهون**'' (سرد آہوں) کے نام سے کہانیوں کا مجموعہ شائع کیا تھا جسے ترقی پسند افسانوں کا پہلا مجموعہ سمجھنا چاہیے۔ دو سال بعد (۱۹۴۴ء) میں گوبند مالھی نے ایک کتاب مرتب کی جس کا نام ''ریگستانی پھول'' تھا جس میں نئے لکھنے والے ادیبوں نے نہایت محنت اور خلوص سے سندھی معاشرے کے سماجی و سیاسی، معاشی و

اخلاقی مسائل پر طبع زاد کہانیاں لکھی تھیں۔ ان عالی شان کہانیوں میں بھگوان لعلوانی کی ''**ساڑھي**''، شیخ عبدالستار کی ''**رحيمان**''، آنند گولانی کی ''**سک**'' (کوہان)، نارائن دیوانی کی ''**ڈاڑيل**'' (دھاڑیل) (ڈاکو)، جیوت تریانی کی ''مونچھو والی دادی''، رام لعل کی ''جعفر بیل دار'' اور سوبھوگیان چندانی کی ''**آکيري جونتي**'' (آکھیری جوٹنی) (آشیاں برباد) اس عہد کی منتخب کہانیاں تھیں جنھوں نے طبع زاد حقیقت نگاری کی روایت کو مستحکم بنیادیں فراہم کیں۔

اس زمانے میں ادارہ ''**نئين دنيا**'' (نئیں دنیا) نے کہانیوں کا ایک مجموعہ ''**پرھ ڦٽي**'' (پرھ پھٹی) (طلوع صبح) کے نام سے شائع کیا جس میں گوبند پنجابی، گوبند مالھی، رام لعل، کرشن کھٹونی وغیرہ کی کہانیاں شامل تھیں۔ آنند گولانی کی مرتب کردہ کتاب ''پھڑک'' (پھندہ) اور شیخ ایاز کی کہانیوں کا مجموعہ ''سفید وحشی'' (۱۹۴۶ء) بھی شائع ہوئے، چونکہ ان کہانیوں میں آزادی کی تحریک کے حق میں اور برطانوی سامراج کے خلاف عوامی جذبات واحساسات کا اظہار ہوا تھا، اس لیے حکومت نے اسے باغیانہ مواد کے زمرے میں رکھا اور اس مجموعے کو بحق سرکار ضبط کرلیا۔ چنانچہ شیخ ایاز کی کہانیوں کا مجموعہ ''سفید وحشی'' سندھی افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جسے باغیانہ قرار دے کر بحق سرکار ضبط کیا گیا۔

۱۹۴۶ء میں ڈی جے کالج سے پروفیسر رام پنجوانی کے زیراہتمام ایک رسالہ ''**لھرون**'' (لہروں) بھی جاری کیا گیا جس میں حقیقت پسندانہ کہانیوں کی اشاعت عمل میں لائی جاتی تھیں جن میں سندھی معاشرے کی معروضی صورت گری کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔

سندھی ادبی سنگت

سندھی ادبی سنگت نے قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں بھی پورے سندھ میں نئے شعور اور احساس کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، قیام پاکستان سے قبل زیادہ تر ہندو ادیب، شاعر اور دانشور اس کے سرگرم رکن تھے، ہر بڑے اور چھوڑے شہر میں اس کی شاخیں قائم کی گئی تھیں جن کی وجہ کراچی، حیدرآباد، شکارپور، سکھر وغیرہ میں ادبی سرگرمیاں تیز تر تھیں اور شعر وادب میں نئے نئے خیالات اور تصورات نئے پیرایۂ اظہار میں ہونے لگا تھا۔ اس زمانے میں کراچی، حیدرآباد اور شکارپور وغیرہ سے ادبی وسماجی رسالوں کی ایک زنجیر قائم تھی۔ کتابی سلسلے بھی شائع ہورہے تھے اور نثری ومنظوم تخلیقات پر مشتمل انتھالوجیز بھی مرتب ہونے لگی تھیں جو لوگ براہ راست سندھی ادبی سنگت میں شامل نہ تھے۔ وہ بھی جانتے تھے کہ معاشرے میں تبدیلی کے عمل کو روکنا ممکن نہیں رہا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ہندو ادیبوں اور شاعروں نے پاکستان سے ہندوستان نقل مکانی کی تھی۔ ان میں

وہ بزرگ صاحبانِ علم و دانش اور اہلِ قلم بھی شامل تھے جنھوں نے گزشتہ نصف صدی کے دوران سندھی زبان و ادب کو بہر عنوان ثروت مند بنایا تھا اور وہ نوعمر لکھنے والے بھی جو سندھی نثر اور شاعری میں نئے خیالات و تصورات کی پیوند کاری کر رہے تھے۔ بزرگوں میں جیٹھمل پرس رام، کاکو بھیرومل، لعل چند امر ڈنومل، ڈاکٹر گوربخشانی، پروفیسر رام پنجوانی، پروفیسر ایل ایچ اجوانی، کشن چند لیکھ راج عزیز اور کھیمل داس فانی وغیرہم شامل تھے اور نوجوان لکھنے والوں میں، کیرت بابانی، گوبند مالھی، گوبند پنجابی، آنند گولانی، اتم چندانی، نارائن شیام، گوبند بھاٹیہ، سندری اتم چندانی، آسانند ماموترا، کیول رام کیسوانی، سکھن آہوجا وغیرہ شامل تھے۔ ان لوگوں کی ہجرت کے ساتھ ہی وہ تمام ادبی ادارے جو ہجرت کر جانے والوں کے دم سے قائم تھے، منتشر ہو کر رہ گئے تھے اور وہ سب رسائل و جرائد اور کتابی سلسلے جن سے نئے ادب کی اشاعت ہو رہی تھی۔ ایک ایک کر کے بند ہوتے چلے گئے۔ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت کا پیٹرن دوسرے صوبوں سے مختلف رہا ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت سندھ میں ہندوؤں کی آبادی بارہ لاکھ تیرہ لاکھ رہی ہوگی جن میں سے گیارہ لاکھ ہندوؤں نے وقفے وقفے سے سرحد پار کی تھی۔ ابتداً بہت کم ہندوؤں نے ترکِ سکونت کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب سوبھو گیان چندانی اور ان کے رفقا نے سندھ کی ہندو آبادی کو حوصلہ دینے اور ترکِ سکونت سے باز رکھنے کی نہایت تیز مہم شروع کی تھی اور گاؤں گاؤں اور شہر شہر جا کر ہندو گھرانوں کو حوصلہ دینے کی کوشش کی تھی۔ انھیں بتایا تھا کہ اگر وہ اپنی زمین چھوڑ کر ہندوستان جائیں گے تو وہاں ان کی حیثیت پنجاب اور بنگال سے آنے والے شرنارتھیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ابتر ہوگی کیوں کہ انھیں بے زمینی کی ایسی اذیت سہنی پڑے گی جس میں ان کا وجود اور شناخت بھی شاید باقی نہ رہ سکے۔ یہی وجہ تھی کہ پہلے ریلے یعنی ۱۹۴۸ء تک صرف دو ڈھائی لاکھ ہندو سرحد کے اُس پار گئے تھے لیکن جیسے جیسے ہندوستان سے مہاجروں کے قافلے سندھ میں داخل ہوتے رہے، ویسے ویسے یہاں بھی کشیدگی پیدا ہوتی چلی گئی اور اگلے دو برسوں میں کراچی، حیدرآباد، نواب شاہ، سکھر اور لاڑکانہ میں فسادات کی ایسی آگ بھڑکی جس میں سندھ کا امن خاکستر ہو کر رہ گیا اور جمے جمائے قدم بھی ایک دم اکھڑ کر رہ گئے۔ اس قیامت خیز گھڑی میں صرف سوبھو گیان چندانی کی عظیم شخصیت تھی جنھوں نے شعوری طور پر سندھ سے ترکِ سکونت کے خیال کو ہی رد کر دیا اور سندھ میں رہ کر عوام، معاشرے اور ادب کی خدمت کرتے رہنے ہی کو اپنا مقصد بنائے رکھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا تھا:

> ''میرا ماضی، میرا حال اور میرا مستقبل اسی دھرتی سے وابستہ ہے اور یہی دھرتی اور اس دھرتی پہ آباد لوگوں کی بہبود ہی میرا آدرش ہے جسے ترک کرنے کا خیال بھی اذیت ناک ہے۔''

یہ بھی حقیقت ہے کہ سوبھو صاحب کی پیروی میں بعض ہندو گھرانے جو بہت قلیل تعداد ہی میں سہی،

یہیں رک گئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جواب بھی اس سرزمین سے رشتہ و پیوند ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔
قیامِ پاکستان کے فوری بعد ادبی محاذ پر ایک سناٹا سا پیدا ہو گیا تھا بیشتر سرگرم عمل ہندو ادیب، شاعر اور دانشور ترکِ سکونت اختیار کر چکے تھے، یوں بھی سندھ میں مسلمان اہلِ قلم اپنی آبادی کی نسبت سے بہت کم تھے، جو تھے وہ بھی ایک طرح سسکتے کی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی کو صوبے سے کاٹ کر فیڈرل حکومت کا دارالخلافہ بنا دیا گیا تھا جسے اہلیانِ سندھ نے اپنے خوابوں کی شکستگی قرار دیا تھا، ساتھ ہی وزارتوں، سفارتوں کی بندر بانٹ اور عوامی سطح پر حق تلفیوں اور ناانصافیوں کی ایک غیر مختتم کہانی شروع ہو چکی تھی اور جمہوریت پسند اور عوام دوست حلقے مایوسی کے ایسے طرزِ احساس سے دوچار تھے جس کو فیض احمد فیض نے ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' کہا ہے۔ اس صورتِ حال میں سوبھو گیان چندانی اور محمد ابراہیم جویو اور جی ایم سیّد جیسے لوگوں نے نہایت اہم اور فعال کردار ادا کیا اور نئے لکھنے والوں کو نیا حوصلہ دیا۔ ابراہیم جویو نے اس صورتِ حال کو یاد کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس سناٹے کو توڑنے والی آواز شیخ ایاز کی تھی جس نے بدلتے ہوئے حالات میں سندھی زبان و ادب کو نئے اندازِ سخن دیئے۔ جس میں غم و غصہ بھی تھا اور احتجاج کی آنچ بھی۔''

دیکھتے دیکھتے کئی اہم شاعر، شیخ ایاز کے ہم آواز ہوتے گئے تھے۔ ان میں عبدالکریم گدائی اور نیاز ہمایونی وغیرہم بھی شامل تھے۔ گدائی کی شہرت کا عالم تو یہ تھا کہ ان کے سندھی گیتوں کے گراموفون ریکارڈ ان دنوں بازاروں میں فروخت ہوتے تھے اور نیاز ہمایونی بھی اپنی شعلہ بیانی کی وجہ سے قبولِ عام رکھتے تھے۔ شیخ ایاز نے بار بار اور برملا یہ بات کہی ہے سوبھوان کے بہت قریبی دوست ہی نہیں بلکہ فکری طور پر ان کے ''گرو'' بھی رہے ہیں اور کئی علمی و فکری مسائل پر تبادلہ خیال نے انھیں ذہنی طمانیت اور جذباتی تشفی بخشی ہے۔

اور سچی بات ہے کہ سوبھو گیان چندانی نے قیامِ پاکستان کے بعد ابھرنے والی نسل کی ذہنی تربیت میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے جس کا ثبوت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے دورِ حکومت میں قائم ہونے والے وحدتِ مغربی پاکستان کے خلاف جو مزاحمتی تحریک ابھری تھی اس کی رہنمائی سندھی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے ہی کی تھی جنھیں سندھی ادبی سنگت کے پرچم تلے مجتمع کرنے میں نورالدین سرکی، رشید بھٹی، ایاز قادری، شمشیر الحیدری اور تنویر عباسی وغیرہم نے نہایت گراں قدر خدمات انجام دی ہیں لیکن دیکھا جائے تو اس دور میں محمد ابراہیم جویو اور سوبھو گیان چندانی کے رہنمایانہ کردار نے ادب کی تحریکِ مزاحمت کو ہر قسم کی شدت پسندیت، تنگ نظری اور جذباتی ابال سے محفوظ رکھا اور اسے صحت مند حب الوطنیت، عوام دوستی اور جمہوریت پسندی کے دھارے میں رواں رکھا۔

وادی صحافت

۱۹۵۶ء میں روزنامہ ''نئین سنڌ'' (نئیں سندھ) کو جی ایم سید نے رئیس غلام مصطفیٰ بھرگڑی اور حسین بخش شاہ کے تعاون سے خرید لیا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ اسے نیشنل عوامی پارٹی کی پالیسی کے تحت ایک نئے انداز سے نکالا جائے۔ ان دنوں سوبھوگیان چندانی کسی سیاسی مسئلے ہی پر مشاورت کے لیے جی ایم سید کے گاؤں ''سن'' گئے ہوئے تھے جہاں سید صاحب نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا اور ان پر زور دیا کہ یا تو خود وہ ''نئیں سندھ'' کی ادارت سنبھالیں یا کوئی دوسرا ایسا باصلاحیت اور تجربہ کار شخص فراہم کریں جو نہ صرف سندھ کی سیاست اور حالات سے مکمل واقفیت رکھتا ہو بلکہ بائیں بازو کے قومی سیاسی پروگرام سے ہمدردانہ دلچسپی بھی رکھتا ہو اور جس کی تحریر میں اتنا تاثر ہو کہ پڑھنے والوں کے دائرۂ کار کی توسیع بھی کر سکے۔ چونکہ سوبھو صاحب سندھ کی سیاست کے خمیر میں اترے ہوئے تھے اور صوبے میں متحرک ہر سیاسی پارٹی، گروہ اور افراد کے بارے میں وسیع تر معلومات بھی رکھتے تھے، اس کے علاوہ چونکہ وہ پاکستان میں بائیں بازو کی سیاست کو منظم کرنے کی جدوجہد میں بھی شروع ہی سے فعال کردار ادا کرتے رہے ہیں اور ان کا شمار نیشنل عوامی پارٹی (NAP) کے بانیوں میں بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کے دوسرے دوستوں نے انھیں مجبور کیا کہ وہ جی ایم سید کی آفر کو قبول کرلیں۔ خود سوبھو صاحب کے لیے یہ تجویز دراصل ان کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے فی الفور اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ جنوری ۱۹۵۷ء سے اخبار کا چارج لینے کے لیے تیار ہیں بشرطے کہ جی ایم سید اپنے اثر ورسوخ سے کام لیتے ہوئے سوامی نارائن مندر کے رہائشی حصے میں ایک فلیٹ انھیں دلوادیں تاکہ وہ اپنی فیملی کو مستقل بنیاد پر کراچی لے آئیں اور پوری دل جمعی کے ساتھ نئين سنڌ'' کے لیے کام کرسکیں۔ چنانچہ جنوری ۱۹۵۷ء سے ستمبر ۱۹۵۸ء تک روزنامہ ''نئين سنڌ' بائیں بازو کی قومی سیاست کے نقیب کے طور پر نکلتا رہا۔ یہ زمانہ پاکستان کی سیاست میں نہایت رست وخیز کا دور تھا اور سیاسی طور پر آئے دن پاکستان کسی نہ کسی خطرناک مسئلے سے دوچار تھا۔ ہر چند ۱۹۵۶ء کا دستور نافذ العمل ہو چکا تھا لیکن صوبائی اور مرکزی حکومتیں مسلسل ریشہ دوانیوں اور مفاد پرست گروہوں کی سازشوں کے رحم و کرم پر تھیں، عوام کے جمہوری حقوق اور شہری آزادیوں پر کسی نہ کسی عنوان پابندیاں عائد چلی آتی تھیں۔ ٹریڈ یونین تحریکوں پر قدغنیں عائد تھیں، اسٹوڈنٹ تنظیموں کو آزادی سے کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ صوبائی اور مرکزی سطح پر جس تواتر کے ساتھ حکومتیں تبدیل ہوئی تھیں، اس کی مثال کسی بھی دستوری اور جمہوری سلطنت میں ملنی مشکل تھی۔ اس پُر ہنگام دور میں ایک صحافی کی ذمہ داری عام سیاست دان سے کہیں

زیادہ تھی۔ چنانچہ سوبھو صاحب نے اس مدت میں مسلسل اہم موضوعات پر نہایت وقیع، دل پذیر اور جامع ایڈیٹوریل لکھے، خواہ وہ صوبائی سیاست کا معاملہ ہو کہ وفاقی سطح کا قضیہ، انھوں نے ہر مسئلے پر اس کے سیاق و سباق میں اور منطقی استدلال کے ساتھ ایسے جائزے لکھے ہیں، جو عوام و خواص میں یکساں طور پر پسند کیے گئے۔ اخبار کے ظاہری ایڈیٹر تو یار محمد ٹانوری صاحب ہی تھے لیکن ایڈیٹوریل اور بعض دوسرے اہم شذرات سوبھو صاحب کی کاوش فکر کا نتیجہ ہوا کرتے تھے۔

''نئین سند'' (نئیں سندھ) کو ان کے زمانۂ ادارت میں سندھ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی تھی اور اس کی ریڈرشپ میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ نئی نسل کے ترقی پسند ادیبوں نے بھی ان میں کالم نگاری کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ہفتے میں ایک مرتبہ ادبی صفحہ بھی ترتیب دیا جاتا تھا جسے غالباً عبدالرزاق راز مرتب کیا کرتے تھے۔ افسوس اس دور کی لکھی ہوئی تحریریں ابھی تک کسی کتاب یا مجموعے میں شامل نہیں ہو سکی ہیں۔ اور نہ کسی تعلیمی ادارے کے شعبۂ صحافت میں ان پر توجہ دی گئی ہے۔

آخرش ۱۹۵۸ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا مارشل لا نافذ ہو گیا اور سوبھو گیان چند دوسرے ترقی پسند عناصر کے ساتھ ایک مرتبہ پھر پابندِ سلاسل کر دیے گئے۔

زمیں دار سوبھو

سوبھو گیان چندانی کا آبائی پیشہ کھیتی باڑی اور باغبانی تھی۔ شروع شروع میں ان کے چاچا اور بابا وغیرہ کے رہن سہن، کھانا پینا اور کاروبار ایک جگہ تھا۔ ان کا گھرانا ابتدا ہی سے بھرا پُرا تھا، ہر وقت کٹم اور برادری کے ایک دو خاندان بطور مہمان براجمان رہتے تھے۔ کھیتی باڑی اور لین دین کے کام کاج بابا اور چاچا مل جل کر کرتے تھے۔ گھر کے اندروں ''امڑ'' (امڑ) (ماں) کی حکمرانی تھی اور کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے معاملات میں مداخلت کر سکے۔ سوبھو نے ہوش سنبھالا تو خوب چند گھرانے کی دوسری شاخیں آس پاس کے علاقوں میں پھیل چکی تھیں اور وقت کے ساتھ ساتھ جائیدادیں بھی تقسیم در تقسیم ہوتی چلی گئی تھیں۔ سوبھو صاحب کے گھرانے کی زرعی اراضی سو سوا سو ایکڑ سے زائد نہ رہ گئی تھی۔ اس میں بھی کچھ زمین زیرِ کاشت تھی اور بعض ٹکڑے سیم وتھور کے شکار، زیرِ کاشت زمینات، زرخیزی اور پیداواری یافت میں بہت عمدہ تھی۔ بیشتر زمین 'بندی' کے آس پاس ہی واقع تھی جہاں آب پاشی کا قدرتی نظام موجود تھا۔ باغات کے فروغ کے لیے انھوں نے کھجور، امرود اور آم کی نئی نئی قسمیں لگانے کے تجربے کیے تھے جو کامیاب بھی ہوئے۔ ان کے بابا ٹانورمل نے کچھ زمین ''گیریلو'' کے علاقے میں بھی حاصل کر لی تھی اور وہ اکثر وہیں رہا کرتے تھے۔ سوبھو صاحب نے کبھی کھیتی باڑی اور زمین داری کے معاملات میں دلچسپی لی

ہی نہیں تھی، بابا کے بعد سارا کام کاج بڑے بھائی کیول رام اور چھوٹا بھائی خوب چند عرف 'بھائی جی' دیکھا کرتے تھے۔ اگر اتفاق سے کبھی سوبھو صاحب کو کسی گاؤں بستی میں کھیتی باڑی کا حساب کتاب کرنے بھیجا جاتا تو یہ ہاریوں کو الٹا اپنے پلّے سے کچھ دے دلا کر واپس آ جاتے تھے۔ جب ۱۹۶۰ء میں انھیں پانچ سال کے لیے 'بند ی' میں نظر بند کیا گیا تو اس وقت مسلسل پانچ چھ سال اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنے کا موقع ملا اور انھوں نے اس پورے سسٹم کے عملی پہلوؤں کو سمجھا۔ اس زمانے میں انھوں نے کھیتی باڑی میں بھی دلچسپی لی اور ڈوکری کے ایگری کلچر تجرباتی فارم کو دعوت دی کہ وہ ان کی زمینوں پر چاول کے نئے بیج کی کاشت کا تجربہ کریں تاکہ چاول کی فی ایکڑ کاشت میں اضافہ ہو سکے۔ اور اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنی زمین کا ایک بہت وسیع رقبہ ڈوکری ایگری کلچر ترقیاتی فارم کو گفٹ کر دیا تھا جس پر اب بھی ایک تجرباتی فارم قائم ہے۔

سن ساٹھ کے بعد کا بیشتر حصہ سوبھو صاحب نے 'بند ی' ہی میں گزارا لیکن اب ان کی اپنی اولادیں بڑی ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ ان کی تعلیم کے لیے بھی رقم کی ضرورت تھی۔ انگریزوں کے زمانے میں مفت تعلیم کی ضمانت ہوا کرتی تھی۔ آزادی کے زمانے میں سرکاری تعلیمی اداروں کے معیار رو بہ زوال تھے۔ چنانچہ بچوں کی تعلیم کے لیے بھی گاؤں یا اس کے آس پاس کے علاقے میں اب کوئی دلچسپی باقی نہ رہ گئی تھی۔ لہٰذا گھر والوں نے 'بند ی' کی جائیدادیں بیچ کر لاڑکانہ شہر میں جائیدادیں خرید لیں اور بندر روڈ کے آس پاس ایک نیا مکان بنا کر وہاں منتقل ہو گئے۔ اسی طرح وہ زمیں داری جو ان کے باپ دادا نے بنائی تھی، آہستہ آہستہ بکتی چلی گئی اور خاندان میں شریک افراد میں ان کے حصے کے مطابق تقسیم ہوتی چلی گئی اور شاید اب زمیں داری کے نام پر ان کی کوئی جائیداد باقی نہیں رہی ہے۔

وکالت

شانتی نکیتن سے واپسی کے فوراً بعد وہ کراچی کے معروف ایس ای شاہانی لا کالج میں داخلہ حاصل کر چکے تھے کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ وکالت کے پیشے میں آدمی کو زیادہ خود مختیاری اور آزادی حاصل ہوتی ہے اور وہ وکیل رہتے ہوئے بھی اپنی سیاسی، سماجی اور ادبی مصروفیات کو جاری رکھ سکتا ہے۔ اس کے برخلاف گھر والوں کی خواہش تھی کہ وہ انڈین سول سروس کا امتحان دے کر کسی بڑے سرکاری عہدے پر فائز ہو جائیں کہ سندھ کے زمیں دارانہ نظام میں سرکار کا چھوٹا موٹا افسر بھی اپنے علاقے کا حاکم ہوتا ہے۔

وکالت میں ان کے پرانے دوست لیکھو تلسانی جو این جے وی ہائی اسکول میں میٹرک تک اور ڈی جے آرٹس کالج میں انٹر تک ہم جماعت رہ چکے تھے، یہاں بھی ان کے ساتھ تھے۔ گوبند مالھی نے بھی

اسی سال ایل ایل بی (فرسٹ ایئر) میں داخلہ لیا تھا۔ ابھی وکالت کا پہلا سال بھی ختم نہ ہو پایا تھا کہ سوبھو صاحب طلبا تحریک اور دوسری سیاسی و سماجی تحریکوں میں مصروف ہوتے چلے گئے۔ قید و بند کے معاملات جدا رہے۔ غرض ۱۹۷۰ء تک انھیں اس بات کی مہلت ہی نہ مل سکی کہ وہ وکالت کی ادھوری تعلیم کو مکمل کر سکیں۔ مشترکہ جائیداد کے فروخت ہو جانے کے بعد کوئی مستقل ذریعۂ آمدنی بھی باقی نہ رہ گیا تھا۔ اس صورتِ حال میں معاشی تنگ دستی کا احساس بھی ہونے لگا۔ چنانچہ انھوں نے احباب کی مشاورت کو قبول کرتے ہوئے لاڑکانہ لا کالج میں دوبارہ داخلہ لے لیا اور دو سال بعد لاڑکانہ ہی میں عبدالرزاق سومرو کے ساتھ وکالت کا آغاز کیا۔ ہر چند سوبھو صاحب کو وکالت کا امتحان پاس کرنے میں کافی وقت لگ گیا تھا اور اگر ملکی حالات کا دباؤ نہ ہوتا تو پچیس تیس برس پہلے ہی تک اس شعبے میں اپنا آغاز کر سکتے تھے اور اس وقت تک انھیں ملک کے سینئر وکلا میں امتیازی مقام حاصل ہو جاتا لیکن اگر وہ یہ سب کچھ حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جاتے تو سندھ کی سیاسی، سماجی اور فکری سطح پر نوجوان نسل کی ذہنی تربیت کے فرائض کون انجام دیتا؟ چنانچہ دیر آید درست آید کے مصداق سوبھو صاحب کا شمار جلد ہی لاڑکانہ کے صفِ اوّل کے وکلا میں ہونے لگا۔ قانون کی موشگافیوں اور عدالتوں کے طریق کار سے وہ اس حد تک مانوس ہو گئے تھے کہ قانون کی ڈگری کا حصول ان کے لیے محض رسمی کارروائی تھی۔ جس کالج سے انھوں نے لا کی ڈگری حاصل کی تھی، اسی کالج میں چند برس لا پڑھانے پر مامور کیے گئے اور بعد میں پروائس پرنسپل اور پھر پرنسپل کے فرائض بھی انجام دیے۔ وکالت کے پیشے میں بھی انھوں نے ان اصولوں ہی کو پیشِ نظر رکھا تھا جو عام زندگی میں عزیز تھے۔ انھوں نے وکالت کے پیشے کو دولت آفرینی کا ذریعہ نہ بننے دیا، بلکہ عام دکھی اور ستائے ہوئے لوگوں کی خدمت گزاری اور دادرسی کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ سیاسی نوعیت کے مقدمات لامحالہ ان ہی کے پاس آتے تھے کہ شہر میں سوبھو گیان چندانی ہی واحد وکیل تھے جو فیس کے بغیر بھی مقدمہ قبول کر لیتے تھے۔ پولیس کی زیادتیوں اور دفتری کارروائیوں میں پھنسے ہوئے غریب ہاریوں، محنت کشوں اور عام شہریوں کی دست رسی کے لیے بھی ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

سوبھو صاحب ابھی چند برسوں تک وکالت کے شعبے میں بھی خاصے متحرک تھے لیکن ان کی تیزی سے گرتی ہوئی صحت کے پیشِ نظر ڈاکٹروں نے انھیں آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ حالانکہ وکالت کا دفتر اب بھی قائم ہے جہاں ان کی مرحوم بیٹے کی بیوہ بہو جرأت مندی کے ساتھ سوبھو صاحب کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھنے کی تگ و دو میں لگی ہوئی ہے۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

سوبھو گیان چندانی اس وقت عمر کی چھیاسی ستاسی منزلیں طے کر چکے ہیں اور عمر عزیز کا بہترین حصہ ''ضمیر کے قیدی'' کی حیثیت سے جیل خانوں ہی میں گزارا ہے۔ انھیں کم و بیش چھ مرتبہ جیل یاترائیں نصیب ہوئیں اور سب کی سب محض اس جرم میں کہ انھوں نے ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام کی لگن میں مصروف پیکار قوتوں کا ساتھ دیا تھا یا معاشرے میں عوامی فلاح، جمہوری قدروں اور اجتماعی خیر کی کوششوں کو بارآور کرنے میں کسی نہ کسی طور پر عملی حصہ لیا تھا، انھوں نے ''اسیری'' کی افتاد کو بھی ایسے ہی حوصلے اور عزم کے ساتھ جھیلا ہے کہ قید خانوں میں گزارے ہوئے ایک ایک لمحے کو اپنے آدرش کی توسیع اور استحکام کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ عرصۂ قید و بند میں پیش آنے والے اکثر تجربوں کی جھلکیاں ہمیں ان کی کہانیوں، مضامین اور شخصی خاکوں میں نظر آتی ہیں، سوبھو صاحب کی اسیری کا مختصر احوال حسبِ ذیل ہے۔

اسیری

''پہلی مرتبہ صرف بائیس برس کی عمر میں ۲۵/ جنوری ۱۹۴۲ء کے دوران اس وقت گرفتار کیے گئے جب طلبا تحریک اپنے عروج پر تھی۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد تو طلبا برداری کے لیے بہتر تعلیمی سہولتوں کا حصول تھا، لیکن اس تحریک کی شدت نے برطانوی حکومت کے خلاف چلنے والی "Quit India Movement" کو تیز تر کر دیا تھا جس سے ہراساں ہو کر حکومت نے وسیع پیمانے پر طلبا و طالبات کی گرفتاری کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور کم و بیش چھ ہزار طلبا و طالبات کراچی، حیدرآباد، سکھر کی جیلوں میں بند کر دیے گئے تھے، اس زمانے میں دوسرے سیاسی اور انقلابی قیدی بھی ان ہی جیلوں میں بند تھے جن کی مدد سے سوبھو گیان چندانی نے قید خانوں میں مختلف سیاسی، علمی اور سماجی مسائل پر

نہ صرف بحث مباحثے شروع کروائے بلکہ اسٹڈی سرکل بھی چلائے۔ گرفتاری کے وقت سوبھو صاحب روپوش رہ کر تحریک کی قیادت کر رہے تھے اور چونکہ پولیس ان کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی، اس لیے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق انھوں نے میٹھارام ہوسٹل میں تقریر کرتے ہوئے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردیا۔ اس قید سے ان کی رہائی جولائی ۱۹۴۴ء یعنی ڈھائی سال کے بعد عمل میں آئی تھی۔''

''دوسری بار وہ ۲۱ رفروری ۱۹۴۶ء کو ''رائل انڈین نیوی'' کی بغاوت کے موقع پر ہونے والی جنرل اسٹرائک اور جلوس کے دوران گرفتار ہوئے۔ ان کے ساتھ گرفتار ہونے والے ہزاروں مظاہرین میں مشہور مارکسی رہنما جمال الدین بخاری، نامور فلم ایکٹر و ڈائریکٹر ای کے ہنگل، پروفیسر کا پاروانی، گوبند مالھی، کیرت بابانی بھی شامل تھے۔ حکومت نے شروع میں ان پر بغاوت، فسادات اور ہنگامہ آرائی کے مقدمات قائم کیے تھے لیکن تین ماہ بعد یہ مقدمات واپس لے لیے گئے۔''

''تیسری بار پاکستان بننے کے فوری بعد ۱۷ راپریل ۱۹۴۸ء کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کیے گئے۔ اس دفعہ ان پر مملکت سے غداری کا الزام لگایا گیا تھا۔ یہ دراصل بائیں بازو کے سیاست دانوں، رہنماؤں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، دانشوروں اور فن کاروں کے خلاف ایک ملک گیر مہم کا حصہ تھی جس کے دوران کراچی سے لنڈی کوتل تک ہزاروں لوگ گرفتار کر لیے گئے تھے۔ اس سے قبل اتنے وسیع پیمانے پر حکومتی کارروائی کسی ایک ہی سیاسی و سماجی گروہ کے خلاف عمل میں نہیں آئی تھی۔ سندھ سے سوبھو گیان چندانی کے ساتھ گرفتار ہونے والوں میں شرف علی، عزیز سلام بخاری، حسن ناصر، جمال الدین بخاری، پرچو ودھیارتی، مشہور فلم ایکٹر اور ڈائریکٹر ای کے ہنگل، کیرت بابانی، ابراہیم جلیس، اشوک کیول رامانی، عبدالرحمن مٹھا، اے کے حیات، غلام محمد خان لنڈ، عبدالغنی خان، قاضی عطاء اللہ اور ڈاکٹر اشرف وغیرہم شامل تھے، بغاوت کا مقدمہ قائم کیا گیا تھا جس کی سماعت چار سال بعد مکمل ہوسکی اور عدالتِ عالیہ نے سرکار کے قائم کردہ مقدماتِ بغاوت کو بے بنیاد اور غیر قانونی قرار دے کر خارج کردیا اور اس طرح سوبھو صاحب اور ان کے رفیقوں کو چار سالہ اسیری

سے مارچ ۱۹۵۴ء میں نجات ملی۔ اس اسیری کے دوران حکومت کی جانب سے سوبھو صاحب کو ترغیب دی گئی کہ اگر وہ ترکِ سکونت اختیار کر کے ہندوستان جانا چاہیں تو انھیں حکومتی سطح پر ہر قسم کی سہولت فراہم کی جاسکتی ہے۔ ایسے ہی مشورے بعض دوسرے دوستوں نے بھی دیئے تھے جن میں جی ایم سیّد بھی شامل تھے لیکن سوبھو گیان چندانی نے ترکِ وطنیت کے امکان کو ایک مرتبہ پھر مسترد کردیا تھا۔''

''چوتھی مرتبہ ۱۲ر جولائی ۱۹۵۴ء (یعنی ماقبل اسیری سے صرف ساڑھے تین ماہ بعد) اس وقت گرفتار کیے گئے جب حکومتِ پاکستان نے کمیونسٹ پارٹی اور ان کی حلیف جماعتوں کو کالعدم قرار دے دیا اور مغربی و مشرقی پاکستان کے طول و عرض میں وسیع پیمانے پر کمیونسٹ رہنماؤں اور کارکنوں کے علاوہ بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھنے والی تمام انجمنوں اور اداروں کو بھی غیر قانونی قرار دے کر ان پر پابندی عائد کردی گئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین بھی کالعدم قرار دے دی گئی تھی۔ چنانچہ اس دفعہ سیاست دانوں، مزدور رہنماؤں، ٹریڈ یونین ورکرز اور طالب علم رہنماؤں کے علاوہ ملک کے سب ہی قابلِ ذکر ترقی پسند ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں، فن کاروں کو پابندِ سلاسل ہونا پڑا تھا۔ اس اسیری کے دوران علالت کی بنیاد پر تین چار ماہ آبائی گوٹھ 'بندی' میں نظر بندی بھی شامل تھی جس سے مارچ ۱۹۵۶ء کو رہائی نصیب ہوئی۔''

''پانچویں مرتبہ ایوب خان کے مارشل لا کے نفاذ کے نتیجے میں انھیں ان کے آبائی گوٹھ بندی سے اکتوبر ۱۹۵۹ء میں گرفتار کیا گیا اور شروع میں حیدرآباد جیل میں قید رکھا گیا لیکن چند ماہ بعد شاہی قلعہ لاہور میں منتقل کردیئے گئے جہاں حسن ناصر کی شہادت واقع ہوئی تھی۔ آخر جون ۱۹۶۰ء میں اس قید سے آزاد کیے گئے۔

ابھی وہ لاہور ہائی کورٹ کے احکامات کے نتیجے میں جیل سے آزاد ہی ہوئے تھے کہ کراچی پولیس ان کے نئے وارنٹ گرفتاری لے کر تعاقب میں پہنچ چکی تھی لیکن ہائی کورٹ کے جج کی مداخلت پر وہ انھیں لاہور میں گرفتار نہ کرسکے۔ ابھی سوبھو صاحب اپنے گاؤں پہنچے ہی تھے کہ ان پر آبائی گاؤں میں پانچ سالہ نظر بندی کے احکامات کی تعمیل کروائی گئی جس کے نتیجے میں انھیں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۵ء تک اپنے گاؤں میں نظر بند رہنا پڑا۔ یہی وہ سب سے طویل عرصہ تھا

جب سوبھو صاحب کو اپنے خاندان کے ساتھ اکٹھے رہنے کا موقع ملا تھا۔''

ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان و پاکستان کی جنگ کے دوران انھیں ایک مرتبہ پھر ڈیفنس رولز آف پاکستان کے تحت پابندِ سلاسل کیا گیا۔ اس دفعہ شیخ ایاز اور رشید بھٹی کے علاوہ بلوچستان کے نوروز خاں بھی ان کے ساتھ شریکِ زنداں رہے تھے۔

اپنی فعال زندگی میں زیادہ تر وقت سوبھو صاحب نے یا تو قید و بند میں گزارا ہے یا روپوشی میں، کیوں کہ وہ جیل میں جا کر بند ہو جانے کو ناپسند کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آدمی کو اپنے آدرش کی تکمیل کے لیے ہر ممکن سعی اور جدو جہد کرتے رہنا چاہیے۔ اس اسلوبِ حیات نے ان کی علمی، ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں کو غیر معمولی نقصان پہنچایا ہے اور سندھی زبان وادب ان کی تخلیقی صلاحیتوں سے اتنا استفادہ نہیں کر سکی ہے جتنا کہ عام صورتِ حال میں ممکن ہو سکتا تھا۔

انتخابی سیاست اور آدرشی آدمی

جیسا کہ عرض کیا گیا، سوبھو گیان چندانی انیس بیس برس کی عمر ہی سے سندھ کی سیاسی، سماجی، معاشی، علمی، ادبی اور تہذیبی منظرنامے پر کسی نہ کسی طور پر موجود رہے ہیں۔ شانتی نکیتن کے دورانِ قیام ہی وہ بائیں بازو کی تحریکوں سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ہر چند وہاں سے واپسی کے بعد انھوں نے فوراً ہی وکالت میں داخلہ لے لیا تھا لیکن ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تیز و تند لہروں نے انھیں حصولِ تعلیم کے دھارے سے نکال کر عملی جدو جہد کے میدان میں لا کھڑا کیا تھا اور اس کے بعد مسلسل وہ ایک کے بعد ایک سیاسی تحریک میں ملوث ہوتے چلے گئے تھے۔ بائیں بازو کی سیاست ہو کہ سندھی زبان، ادب ار ثقافت کی مہم، وہ ہر جگہ مستعد و متحرک پائے جاتے تھے۔ پورا سندھ ہی نہیں بلکہ پورا پاکستان ان کے نام اور کام سے بخوبی آگاہ رہا ہے۔ وہ بنیادی طور پر نان کنفرمسٹ شخص ہیں، چنانچہ کسی بات کو بھی جو عقلی اور منطقی استدلال پر پوری نہ اترتی ہو، قبول کرنے سے گریزاں رہتے ہیں اور ان کی شخصیت کے اسی پہلو کی بنا پر وہ ہم عصروں میں ہمیشہ ممتاز مقام کے حامل رہے ہیں۔

سندھ میں بائیں باز و اور عوامی جدو جہد کی ہر تحریک میں وہ صفِ اوّل میں شامل رہے ہیں۔ ٹریڈ یونین اور ہاری تحریک کے توسط سے سندھ کے شہروں اور دیہاتوں کی سطح پر وہ نہایت مضبوط عوامی رابطے رکھتے ہیں اور سندھ میں ان کی ذات کسی قسم کے تعارف کی محتاج نہیں رہی تھی۔ سندھ کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی میدان میں شاید ہی کوئی ایسا قابلِ ذکر شخص ہو جو سوبھو گیان چندانی کے نام اور کام سے واقف نہ رہا ہو۔

علمی وادبی سطح پر بھی سوبھو صاحب شروع ہی سے سندھی ادب میں ترقی پسندانہ خیالات و تصورات کی

توسیع میں مصروف عمل رہے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر نئے لکھنے والوں کی ذہنی تربیت کا نہایت اہم فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ سندھی ادب کے کم و بیش سب ترقی پسند ادیب شاعر اور دانشوران کے حلقۂ اثر میں داخل رہے ہیں۔ صحافت کے میدان میں ''نئین دنیا'' (نئی دنیا) اور دوسرے اخبارات، رسائل اور جرائد کے ذریعے سندھی معاشرے کو درپیش سیاسی، معاشی، سماجی، ادبی اور اخلاقی مسائل کے تجزیات کے ذریعے علم و آگہی اور روشن خیالی کے رویوں کو عام کرتے رہے ہیں۔ غرض قیامِ پاکستان کے بعد ان کی سیاسی اور ادبی خدمات کا گراف بلند سے بلند تر ہوتا رہا ہے۔ اور سندھی قوم پرستی کی تحریک کو انھوں نے جذباتی اُبال اور غیر منطقی رویوں سے محفوظ رکھنے میں بھی غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ اپنی زندگی کا بیش بہا حصہ اذیت ناک قید و بند، نظر بندیوں اور روپوشیوں کی نذر کر دیا تا کہ اپنے عوام دوست آدرش کو کامیاب و سرفراز دیکھ سکیں۔ سوبھو گیان چندانی وسیع المشرب آدمی ہیں اور انھیں سندھ میں ہندو مسلم اتحاد کے روشن خیال استعارے کی اہمیت حاصل تھی۔ جس طرح وہ غیر منطقی اور غیر جمہوری قوم پرستی کو فاشزم کے مترادف خیال کرتے ہیں، اسی طرح انھوں نے باہر سے آنے والے مہاجروں کی ترقی پسندیت اور روشن خیالی کا بھی ہمیشہ خیر مقدم کیا ہے۔ لہٰذا سوبھو صاحب کے چاہنے والوں میں قدیم سندھیوں کے ساتھ نئے سندھیوں کی بھی کثیر تعداد شامل ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ان کی سیاسی سرگرمیوں کا محور اس ملک میں جمہوری اور سیکولر اقدار کی بحالی کے ذریعے ایک ایسے منصفانہ نظام کا قیام تھا جس میں محروم طبقات کی معاشی خوش حالی اور سماجی فلاح و بہبود ممکن ہو سکے، اس مقصد کے لیے پاکستان کے پانچوں صوبوں پر مشتمل عوامی اور جمہوری طاقتوں کو منظم کر کے ایک وسیع تر سیاسی متحدہ محاذ قائم کیا گیا تھا جس میں ملک کے قوم پرستوں اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے عناصر شانہ بہ شانہ شریک تھے۔ پاکستان میں جمہوری اقدار پر قائم وفاقی نظام کے فروغ اور استحکام کے لیے جو عظیم الشان تحریکیں چلائی گئی ہیں، ان کی کامیابیوں میں سوبھو گیان چندانی کا کردار قابلِ صد افتخار رہا ہے اور ملک کے جمہوری حلقوں میں انھیں ایک بہترین سیاسی نظریہ ساز اور پالیسی گر شخصیت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

وکالت کے دور میں بھی ان کا حلقۂ اثر مزید وسیع ہوتا رہا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے اس پیشے کو جلب زر کا ذریعہ بنانے کے بجائے خدمتِ خلق کا ذریعہ بنایا تھا۔ ان تمام شخصی خوبیوں، سیاسی و سماجی اعتبارات اور بے مثال ایثار اور قربانیوں کے باوجود جب انھوں نے پاکستان میں رائج سیاسی نظام میں انتخابات کے ذریعے داخل ہونا چاہا تو اس غیر منصفانہ نظام کے نگہبانوں نے انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ سوبھو گیان چندانی پہلی مرتبہ ۱۹۵۲ء میں صوبائی اسمبلی کے لیے ہاری تحریک کے نمائندے کی حیثیت سے الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے۔ یہ انتخابات جداگانہ نظامِ نیابت کے تحت منعقد ہوئے تھے

جس میں ہندو اور مسلم امیدواروں کے حلقہ ہائے انتخابات جدا جدا تھے۔ سوبھو صاحب کو جس اقلیتی نشست کے لیے کھڑا کیا گیا تھا، اس کے حلقۂ انتخاب میں نواب شاہ، خیر پور، دادو اور لاڑکانہ کے اضلاع شامل تھے، جہاں سوبھو گیان چندانی نہ صرف عوامی سطح پر معروف امیدوار تھے بلکہ ہاری تحریک نے ان اضلاع میں گزشتہ کئی عشروں میں غیر معمولی کام بھی کیا تھا۔ نئے دستور کے تحت یہ پہلے الیکشن تھے جو سندھ میں منعقد ہو رہے تھے اور جن میں سندھ ہاری کمیٹی اور جی ایم سیّد کے ''عوامی اتحاد'' کے درمیان انتخابی اشتراکِ عمل ہوا تھا۔ جی ایم سیّد کے کل آٹھ امیدوار شریک تھے جب کہ ہاری کمیٹی نے سندھ کے مختلف مقامات سے بیالیس امیدوار کھڑے کیے تھے۔ سوبھو گیان چندانی کے مقابل اقلیتی امیدوار کو پیر صاحب پگاڑا کی حمایت حاصل تھی۔ پہلے تو ہر طرف سے یہ کوشش کی جاتی رہی کہ سوبھو صاحب پیر صاحب کے نامزد کردہ امیدوار کے حق میں دستبردار ہو جائیں، لیکن جب سوبھو صاحب نے کسی دباؤ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پھر ریاستی مشینری کو استعمال کیا گیا اور اُن کے نمائندوں، کارکنوں اور حمایت کرنے والوں کو طرح طرح ہراساں کیا گیا اور جبر و دھاندلی کی ایسی فضا پیدا کی گئی جس کا تصور کسی جمہوری معاشرے میں ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف سوبھو گیان چندانی انتخاب میں ناکام رہے بلکہ سندھ میں ہاری کمیٹی کے تمام بیالیس امیدواروں کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا جب کہ جی ایم سیّد کے آٹھوں امیدوار کامیاب قرار دیے گئے جو دراصل سندھ میں وڈیرہ شاہی اور مضبوط جاگیرداری نظام کی کامیابی تھی۔

دوسری مرتبہ سوبھو گیان چندانی کو ۱۹۸۸ء میں الیکشن میں کھڑا کیا گیا۔ کیوں کہ ان کے احباب کا خیال تھا کہ انتخابات میں حصہ لیے بغیر سنجیدہ، جمہوریت پسند اور باشعور افراد ملک کے سیاسی نظام میں کوئی مثبت عملی کردار ادا نہیں کر سکتے، جس کی وجہ سے سماجی تبدیلی کے خواب تشنۂ تعبیر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ سوبھو صاحب کو ایک مرتبہ پھر اقلیت کی نشست پر الیکشن میں حصہ لینا چاہیے۔ چند احباب اس کے برخلاف یہ بھی سوچتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ آمریت کے تحت انتخابات میں شرکت کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ہم اس سسٹم کو سپورٹ کر رہے ہیں، لیکن سوبھو صاحب بھی جمہوریت کی بقا و ضمانت اس بات میں دیکھتے تھے کہ محدود ترین جمہوری طرزِ عمل بھی مکمل آمریت سے بہتر ہے۔ اور تاریکی کو کسی چھوٹی سی کرن سے بھی دور کیا جا سکتا ہے اور محض آنکھیں موند کر بیٹھ جانے سے اندھیرے کبھی نہیں چھٹتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مجلس شوریٰ کے انتخاب میں شرکت کی تھی۔ اس کا حلقۂ انتخاب پورے پاکستان پر مشتمل تھا اور سندھ سے اقلیت کی صرف چار نشستیں تھیں۔ اور ایک نو دولتیے سیٹھ اور سرکاری ٹھیکے دار سے مقابلہ درپیش تھا، جسے سول اور فوجی اسٹیبلشمنٹ کی مکمل اعانت بھی حاصل تھی۔ دوسری طرف یہ بائیں بازو کی سیاست سے ہمدردی اور دلچسپی رکھنے والے حلقوں کے لیے بھی ایک لمحۂ فکریہ تھا۔ اس لیے وسائل

کی کمی کے باوجود سوبھو گیان چندانی کے حق میں کام کرنے والے بھی کسی نہ کسی انداز میں سرگرم ہو گئے اور جب نتائج کے غیر سرکاری اعلان کے مطابق سوبھو صاحب تیرہ ہزار ووٹ لے کر چوتھے نمبر پر آئے جب کہ فریقِ مخالف کو صرف آٹھ ہزار ووٹ ملے، سندھ ہائی کورٹ نے بھی سوبھو گیان چندانی کے حق میں فیصلہ دیا جب کہ سپریم کورٹ نے ووٹوں کی دوبارہ گنتی کے احکامات دیئے اور نتیجے میں چھٹے نمبر پر آنے والے فریق کو کامیاب قرار دیا گیا اور سوبھو صاحب ناکام قرار پائے لیکن اس کے باوجود جمہوری عمل میں ان کا اعتماد بحال رہا اور ۱۹۹۰ء میں ایک مرتبہ پھر انھوں نے اس عمل کو آزمایا، لیکن اس بار بھی انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ صورتِ حال جمہوریت پسندیت اور بائیں بازو کی سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک لحۂ فکر ہے۔ سوبھو گیان چندانی اس سلسلے میں مثبت اندازِ فکر رکھتے ہیں۔

دور تک یادیں تعاقب میں چلی آتی ہیں

''یادیں انسان کی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ ہوتی ہیں جن سے آدمی کسی خاص لمحے، واردات، احساس اور تجربے کی خوش بو سے مہک مہک جاتا ہے۔ کبھی کوئی یاد کسی پُرلطف لمحے کو سیاق وسباق کے ساتھ سامنے لا کھڑا کرتی ہے اور ہم اس کی بازیافت سے ایک مرتبہ پھر سرشار ہو جاتے ہیں اور کبھی کوئی یاد ایسی بھی ہوتی ہے جوان تلخیوں اور ناآسودگیوں کو ابھار دیتی ہے جو کسی خاص واردات اور تجربے کا حصہ رہ چکی تھی، آدمی تلخ وشیریں یادوں کے ان ہی بندھنوں سے ایامِ گزشتہ کے ساتھ رشتہ وپیوند ہوتا ہے۔ اور گاہے بہ گاہے فراموش گاری کے طاقچے میں پڑی یادوں کی سوغات کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔''

سوبھو گیان چندانی کے نگارخانے میں محفوظ یادوں میں سے چند ایک جھلکیاں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

بالعموم آدمی کے بچپن کی یادیں زندگی بھر اس کے حافظے میں محفوظ رہتی ہیں۔ بعض یادیں تو ایسی ہوتی ہیں جو رہ رہ کر اپنی جھلکیاں دکھاتی ہیں۔ سوبھو صاحب کو بھی اپنے بچپن کی یادیں بہت عزیز ہیں، انھیں اپنے گوٹھ 'بندی' کی مہکتی فضائیں خوب اچھی طرح یاد ہیں۔

''انھیں یاد ہے کہ بارش کے دنوں میں تھکے ہارے لوگ گلیوں کوچوں میں نکل آتے تھے اور کیچڑ پانی میں ''بھیج قلندر''، ''بھیج مولا'' کے نعرے لگاتے پھرتے۔ گھر گھر میں تلہن ہوتا، پاپڑ پکوڑے تلے جانے لگتے اور شور مچاتے

لڑکوں بالوں میں تقسیم کیے جاتے تھے۔ایسا لگتا گاؤں کا ذرہ ذرہ خوشی اور مسرت سے بھر گیا ہو اور لوگ بلا کسی تفریق کے مل جل کر موسم کا لطف اٹھا رہے ہوں۔
ساون کے دنوں میں اوطاقوں (بیٹھک) سے باہر تخت اور چار پائیاں بچھا دی جاتی تھیں اور بے فکروں کی ٹولیاں تاش اور گنجفے کی محفلیں جماتیں۔لیکن جوئے کا دور دور تک شائبہ نہ ہوتا تھا۔بس ایک طرح کی تفریح اور دل لگی رہتی تھی۔حقے اور چلم کا دور چلتا، جوان سینہ پھلا پھلا کر دم لگایا کرتے تھے، چھوٹے بچے چلم کے دھوئیں اور بُو سے ناکیں سکیڑتے ہوئے دوڑ دوڑ کر چلم تازہ کرتے اور اس کی گردش میں شوق سے ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔بارش کے بعد زمین گویا جی اٹھتی تھی۔ہر طرف ہریالی لہلہاتی اور فضا مہک اٹھتی، نم آلود زمین میں جگہ جگہ کھمبیاں اور 'ڈنگریاں' اُگ آتی تھیں اور بچے بالے زیادہ سے زیادہ ان کو توڑ توڑ کر اپنے دامنوں میں جمع کرتے اور گھروں میں لا کر دیتے تھے۔یہ ایک طرح کے مشروم تھے جن کا سالن گوشت کے سالن سے بھی زیادہ مزے دار بنتا ہے۔
گاؤں کے آس پاس جوار اور گنے کے کھیت بھی کافی تھے۔بچے ان جوار کے موٹے نے کا رس چوستے اور گنے چھیل چھیل کر کھاتے تھے۔کہیں مٹر، تھوہر کی پھلیاں لگی ہوتی تھیں تو انھیں بھی خوب رج رج کر کھاتے تھے۔اور کوئی روکتا ٹوکتا نہیں تھا کہ کس کا کھیت ہے اور کس نے خراب کیا ہے۔بھائی چارے اور سلوک کے وہ زمانے جانے کہاں گئے؟!"
سکھر بیراج سے نکلنے والی نہروں نے اس علاقے کی زرخیزی میں بہت اضافہ کیا ہے۔ایک سال دریا میں ایسا سیلابی ریلہ آیا کہ نہ صرف بڑی نہر کے کناروں پر آباد نشیبی بستیاں اور گوٹھوں میں تین تین فٹ پانی کھڑا ہو گیا تھا بلکہ گاؤں کے مغربی سمت بہنے والے نالے اور نشیبی گڑھوں میں بھی لبالب پانی بھر گیا تھا۔جن میں باقاعدہ کشتیاں اور ڈونگے چلنے لگے تھے۔ہلکی پھلکی کشتیاں پانی میں ڈال دی جاتی تھیں اور انھیں دو مضبوط رسوں سے باندھ دیا جاتا تھا۔ایک رسے کو پانی کے اس کنارے پر اور دوسرے کو دوسرے کنارے پر ایک ایک آدمی کھینچے لیے جاتا تھا اور پانی کی کم گہرائی کے باوجود کشتی رانی کا مزہ آجاتا تھا۔چھوٹی چھوٹی ہلکی پھلکی رنگ برنگی کشتیاں، ساون کے دنوں میں پانی کے دھارے پہ تیزی سے بہتی چلی جاتی تھیں۔بچے بالے رنگ برنگی کاغذ کی ناؤ بنا کر کنارے کنارے تیرایا کرتے تھے اور جس کی کشتی پہلے ڈوب جاتی اس کی خوب ہنسی اڑتی تھی۔گاؤں کی لڑکیوں بالیوں کے اپنے مشغلے ہوتے تھے۔وہ آٹے کے دیئے بناتی تھیں، ان میں تیل یا گھی ڈال کر جلاتیں اور کسی گلی چوک یا ڈیوڑھی کے کنارے

قطاروں میں سجاتی تھیں اور بعد میں کسی کنویں میں اچھال کرالٹے قدموں لوٹتیں اور بزرگوں سے خوش بختی کی دعائیں لیتی تھیں۔

ایک مرتبہ جب سوبھو قمبر اسکول میں زیرِ تعلیم تھے تو وہاں کسی دوست نے ان سے ذکر کر دیا تھا:

"'گیریلی' میں کوئی مہنت بابا ہیں جو آدمی کو دیکھتے ہی اس کے من کا راز بھانپ لیتے ہیں اور ان کے گرد عقیدت مندوں کے ٹھٹ لگے رہتے ہیں اور لوگ حاضر ہو ہو کر اپنی مرادیں پاتے ہیں۔ بچپن میں ان کے مزاج میں مذہبی عقیدت مندی کا عنصر تو موجود تھا ہی، چنانچہ ایک دن دوپہر کو کھانا وغیرہ کھا کر چپکے سے 'ہوسٹل' سے نکل کر گیریلی کی راہ لی۔ گیریلی کا فاصلہ وہاں سے کوئی چار پانچ میل دور تھا۔ یہ پا پیادہ روانہ ہو گئے، نہ راستے کی خبر اور نہ کوئی زادِ راہ، بس پا پیادہ اندازے سے چلتے رہے، آخر شام ہوتے ہوتے گیریلی پہنچ گئے۔ وہاں گاؤں کے باہر ہی ان کے ماموں کی دکان تھی۔ اتفاقاً انھوں نے ان کو دیکھ لیا اور پیار سے پوچھا، تم "گیریلی" کس کے ساتھ آئے ہو؟ انھوں نے جواب دیا میں مہنت بابا کی زیارت کرنے خود ہی پیدل چل کر آیا ہوں۔ والد کو پتا چلا تو انھیں بھی حیرت ہوئی، اِدھر جب ہاسٹل میں ڈھونڈیا پڑی تو ان کے ایک ہم راز کلاس فیلو نے ہاسٹل کے انچارج ہیمن داس کو ان کے "گیریلی" جانے کی خبر سنائی۔ جب سامنا ہوا تو مہنت بابا نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ بچے تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ انھیں بتایا گیا تھا کہ مہنت بابا دیکھتے ہی آپ کے بارے میں سب کچھ خود بہ خود جان لیتے اور دل میں چھپی باتیں بھی بے دھڑک بیان دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سوال کو سن کر انھیں سخت مایوسی ہوئی اور وہ جان گئے یہ مہنت بابا بھی محض پاکھنڈی ہے۔ اور اس کی شہرت میں سچائی کا عنصر نہیں ہے۔ خیر، گیریلی سے ان کے ابا ان کو گاؤں لے گئے اور دو تین دن کے بعد قمبر لا کر چھوڑا جہاں ان کی سخت فہمائش کی گئی تھی۔"

این جے وی ہائی اسکول کراچی میں قیام کی یادوں میں سب سے زیادہ باتیں انھیں اپنے استاد دیوان کرم چند ہنگورانی اور ان کے گھر میں تین مہینے قیام کے بارے میں یاد ہیں۔ دیوان کرم چند ہنگورانی جب لاڑکانہ سے تبدیل ہو کر کراچی آئے تو انھوں نے سوبھو صاحب کے بزرگوں کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ ان کو این جے وی ہائی اسکول کراچی میں داخل کرائیں اور انھیں لاڑکانہ کی بجائے کراچی

سے میٹرک کرنا چاہیے۔ ان کے داخلے کا بندوبست بھی ہنگورانی صاحب نے اپنے ذمے لے لیا تھا بلکہ ابتدائی تین چار ماہ اپنے گھر ہی میں رکھا تھا، اور اسکول میں بھی خوب سرپرستی کی تھی۔ کرم چند ہنگورانی کے ساتھ ساتھ ان کی بیگم کی شفقت اور محبت بھی انھیں یاد آتی ہے۔ وہ جب چھٹی گزار کر گوٹھ سے واپس آتے تو ان کی بیگم انھیں محبت سے ڈانٹتی تھیں کہ تم گرمیوں میں گاؤں کیوں جاتے ہو، وہاں دھوپ میں گھومنے سے تمھارا اُجلا رنگ جھلس جاتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو این جے وی ہائی اسکول میں تعلیم کے دوران ہی اُن کے جوہر کھلے تھے۔ کرم چند ہنگورانی صاحب کی دو تین بھتیجیاں بھانجیاں بھی تھیں جو بہت شوخ وچنچل اور شریر تھیں اور اکثر سوبھو صاحب کو اپنی شرارتوں سے تختۂ مشق بنایا کرتی تھیں۔ ان لڑکیوں سے ان کی جان اس وقت چھوٹی جب سوبھو صاحب کرم چند ہنگورانی کی سفارش پر چندر کاشی مندر میں (جو قائد اعظم کے مقبرے سے قریب ہی واقع ہوا کرتا تھا اور شاید اب بھی اس کے آثار موجود ہوں) منتقل ہوئے۔

این جے وی اسکول کے زمانے کی یادداشتوں میں لیکھو تلسیانی اور ان کے بھائی تلوک تلسیانی جیسے دوستوں کے ساتھ گزاری ہوئی صحبتیں بھی ان کی یادوں میں محفوظ ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہی وہ زمانہ تھا جب ان میں ذہنی بلوغت پیدا ہوئی اور ان کے خیالات میں ٹھہراؤ اور گہرائی پیدا ہونا شروع ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں آزادیِ ہند کی تحریک سے یک گونہ دلچسپی اور لگاؤ پیدا ہونا شروع ہوا اور آزادی کے ہیرو ان کے بھی ہیرو قرار پانے لگے۔ اسی دور میں گرودیو ٹیگور کی گیتا نجلی کو پڑھنے کا موقع ملا جس نے گرودیو اور شانتی نکیتن کے بارے میں ایک طرح کی دلچسپی پیدا کردی تھی۔ اسی دور میں انھیں انگریزی، اردو بنگلہ اور سنسکرت کا بہترین ادب اور ان کی کتابیں پڑھنے کے مواقع نصیب ہوئے۔ اس وقت تک انھوں نے کسی تحریک میں عملی حصہ نہ لیا تھا، چنانچہ ان کے مطالعے کی عادت کو پھلنے پھولنے کے خوب خوب مواقع نصیب ہوئے۔

۱۹۴۱ء کے موسم سرما میں سوبھو صاحب سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک اہم وفد کے ساتھ پٹنہ میں منعقد آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے روانہ ہوگئے۔ ابھی لاہور پہنچے ہی تھے کہ اندر کمار گجرال نے جو اس وقت پنجاب اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکریٹری تھے، بتایا کہ ہندوستان کی طلبا تحریک کی پالیسی لائن میں زبردست تبدیلی متوقع ہے، اس لیے پٹنہ کانفرنس کی تاریخ دس دن آگے بڑھادی گئی ہے۔ ایسی ہی بات شانتی نکیتن کے پرانے دوست بلدیو سنگھ نے بھی بتائی کہ وہ یوپی کی کمیونسٹ پارٹی سے بہت قریب تھا۔ چنانچہ انھیں اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا کہ پٹنہ کانفرنس میں خاصی گرما گرمی کا امکان ہے۔ بہرحال دس دن کی مہلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان لوگوں نے طے کیا کہ دلّی، لکھنؤ اور کان پور گھومتے ہوئے پٹنہ پہنچا جائے۔ سوبھو صاحب خود تو شانتی نکیتن میں پرانے استادوں اور دوستوں سے ملنے چلے گئے جہاں پرنسپل انیل چندا اور کشنو کرپلانی کے علاوہ کرشن کھٹوانی

سے بھی ملاقات ہوئی اور نہ صرف ہندوستان بلکہ بین الاقوامی سیاسی صورت حال پر بھی تفصیلی گفتگو ہوئی۔
حسب توقع پٹنہ کانفرنس خاصی ہنگامہ خیز تھی جس میں تازہ ترین بین الاقوامی صورتِ حال کے پیش نظر اور سوشلسٹ روس پر فاشسٹ جرمنی کے حملہ آور ہونے کے بعد دوسری جنگ میں فاشسٹ قوتوں کے خلاف عوامی قوت کو یک جا مجتمع کرنا ضروری ہو گیا تھا اور جس کے نتیجے میں برطانوی حکومت سے جنگی حکمتِ عملی میں فوری تعاون وقت کی اہم ضرورت بن گئی تھی۔ چنانچہ نئی حکمتِ عملی کے تحت جنگ عظیم دوم جو کل تک فاشسٹوں اور سامراجیوں کے درمیان جنگ تھی، اب ''عوامی جنگ'' کا روپ دھار چکی تھی۔ کیوں کہ دنیا میں سوشلسٹ ممالک کا دفاع عالم انسانیت کے دفاع کے مترادف تھا۔ اس نئی صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ ہندوستان کی نہ صرف طلبا تحریک بلکہ بائیں بازو سے ہمدردانہ تعلق رکھنے والی تمام تنظیموں کو اپنے لائحہ عمل میں فوری طور پر زبردست پالیسی شفٹ لانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں سجاد ظہیر اور دہلی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکریٹری نکتۂ نظر کی کھلے طور پر وکالت کر رہے تھے، جب کہ میاں افتخار الدین جو پنجاب اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی نمائندگی کر رہے تھے، کی تقریر سے بعض فکری اور عملی تحفظات کا احساس ہوتا تھا۔ اس موقعے پر سوبھو گیان چندانی اور ان کے رفقا کا استدلال یہ تھا کہ وہ سندھ واپس جا کر اجتماعی طور پر ہی کوئی فیصلہ کر سکیں گے اور سندھ میں اچانک انگریز حکومت سے سمجھوتے کی پالیسی شاید مقبول نہ ہو سکے اور ایسا کرنا اس لیے بھی غلط اور غیر اخلاقی بات ہوگی کہ اس وقت سیکڑوں طالب علم قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ اس اصولی مؤقف کے باوجود سوبھو صاحب نے لکھا ہے:

> ''جب ہم پٹنہ کانفرنس سے واپس کراچی لوٹے ہیں تو ہم لوگوں کا سواگت خاصی برہمی کے ساتھ کیا گیا۔ کیوں کہ اسٹوڈنٹس کمیونٹی کے بعض حلقوں کو شبہ تھا کہ کہیں ہم نے بائیں بازو کے نقشِ قدم پر چل کر مصلحت کا راستہ اختیار نہ کر لیا ہو، ہم لوگوں پر اس وقت تک ہوٹنگ ہوتی رہی، جب تک ہم نے جنرل باڈی کو پوری تفصیل سے آگاہ نہ کر دیا۔''

اپنی پہلی جیل یاترا کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

> ''انھیں مٹھا رام ہوسٹل کے لان سے تقریر کرتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا۔ گرفتاری کے بعد لگ بھگ تیرہ چودہ دن بولٹن مارکیٹ کے پولیس لاک اپ میں رکھا گیا تھا۔ اس چھوٹی سے کوٹھری میں ہر قسم کے قیدی ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے جس میں اکثر اخلاقی قیدی اور جرائم پیشہ لوگ بھی تھے۔ یہاں نہ تو صاف ہوا کا انتظام تھا اور نہ صفائی ستھرائی کا کوئی بندوست۔ چودہ پندرہ دنوں کی لاک اپ کے بعد جب انھیں کراچی جیل منتقل کیا گیا تھا تو ان کی حالت ناگفتہ

بہ تھی، بدن پر میل کی تہیں جم چکی تھیں، کپڑے غلاظت اور پسینے کی بدبو کی سڑاند سے بسے ہوئے تھے اور اُن میں جوئیں تک پڑ گئی تھیں۔ ان کی حالتِ زار دیکھ کر جیل میں موجود ساتھیوں نے فوری طور پر لاک اَپ کے گندے کپڑے اتروائے اور انھیں خوب گرم پانی سے نہلایا۔ پھر بھی کئی ہفتوں تک لاک اَپ کا خیال آتے ہی جھرجھری سی آجاتی تھی۔''

یہاں سب ہی دوست احباب موجود تھے اور کانگریس کے رہنما اور کارکنوں کی بھی کثیر تعداد بند تھی۔ سوبھو صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہاں سیاسی کارکنوں کی تربیت کے لیے بحث مباحثہ اور اسٹڈی سرکلز کا انتظام کیا اور طلبا ساتھیوں کے مورال کو بلند رکھنے کے مختلف طریقے اختیار کیے اور فرصت کے لمحات میں منتخب کتابوں کے مطالعے سے اپنے ذوقِ مطالعہ کو سیراب کیا۔

شادی کا قصہ — برات حاضر دولہا غائب

سوبھو صاحب کی شادی کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ جس کا احوال قلم بند کرتے ہوئے انھوں نے اپنی خود نوشت سوانحی حالات میں لکھا ہے، ''ہم ابھی شانتی نکیتن سے فارغ التحصیل ہوئے ہی تھے اور وطن واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ بڑے بھائی کیول رام کا خط ملا:

''گھر والوں نے تمھاری شادی کی تاریخ چوبیس طے کر دی ہے، تمھیں چوبیس تاریخ سے پہلے گوٹھ پہنچنا ہوگا۔ یہ خط اپریل کے شروع دنوں میں ملا تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر میں نے اس سے یہی خیال کیا کہ چوبیس تاریخ اپریل ہی کی ہے جس دن گھر والوں نے میری شادی طے کی ہوئی ہے۔ میری منگنی شانتی نکیتن جانے سے قبل ہی طے کر دی گئی تھی بلکہ شانتی نکیتن جانے کی اجازت میں منگنی کی شرط شامل تھی۔ چنانچہ میں پروگرام کے مطابق کراچی کے دوستوں کو شادی کا نیوتہ دیتے ہوئے جب بندی پہنچا ہوں تو وہاں گھر بھر میں ایک کہرام مچا ہوا تھا کیوں کہ میری شادی کی مہورت اصل میں چاند کی چوبیس تاریخ کو تھی جسے گزرے ہوئے کم و بیش ایک ہفتہ ہوگیا تھا۔ گھر بھر میں سب کو یہی فکر تھی اور خاص طور پر میری سسرال والے کہتے پھرتے کہ وہ شادی سے ڈر کر بھاگ گیا ہے۔ لیکن وہ بھی اب اپنی بیٹی کو لے کر آگئے ہیں تو شادی بنا لوٹ کر نہ جائیں گے۔ مجھے بھائی کیول رام نے بعد میں بتایا کہ جب تم چاند کی چوبیس ۔

پہلے گاؤں میں نہیں پہنچے تو ہم سب کو بہت فکر ہوئی تھی اور ہم نے تمھارے سب جاننے والوں سے تمھارے پروگرام کی بابت پوچھا تھا، یہاں تک کہ 'سندری' سے بھی پوچھ گچھ ہوئی تھی اور اس نے سب کو بتا دیا تھا کہ سوبھو کا پروگرام ۲۴ر اپریل تک پہنچنے کا ہے۔ خیر میرے گاؤں پہنچ جانے سے سب کی جان میں جان آئی۔ میں نے کہا چلو اب میں پہنچ گیا ہوں تو آپ لوگوں کو کیا فکر ہے۔ میں نے اپنے سسر سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں جہیز کے نام سے ایک پائی یا کوئی قیمتی چیز قبول نہیں کروں گا بلکہ میں شادی صرف اسی شرط پر کروں گا۔ اس بات پر میرے سسر ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور بولے: '' بیٹے، تم ہم سے زیادہ بدھی مان ہو لیکن کوئی ایسی شرط نہ لگاؤ جس کی تعمیل نہ ہو سکتی ہو۔ ہم تمھیں کوئی جہیز نہیں دے رہے ہیں بلکہ جو کچھ بھی دیں گے اپنی بیٹی کو دیں گے جس پر تمھیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں خاندان، برادری میں بھی منھ دکھانا ہے، رسم و رواج تو نبھانے ہی پڑتے ہیں۔''

خیر گاؤں پہنچنے کے دوسرے تیسرے دن سوبھو صاحب کی شادی خانہ آبادی ہو گئی۔ کراچی سے ان کے دوست لیکھو تلسانی اور ٹلوک تلسانی اور موتی چند میرانی شادی میں شریک ہونے آئے تھے۔ ان کی دلھن کا نام 'لیلان'' (لیلاں) تھا اور شادی کے وقت ان کی عمر صرف چودہ برس تھی جب کہ سوبھو صاحب کی عمر اکیس برس تھی۔ عمر کا یہ تفاوت رواج کے مطابق تھا۔ ان کی بیوی کل چوتھی جماعت تک پڑھی ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں سوبھو صاحب کی توجہ اور اصرار کی بنا پر ان کی معلومات خاصی وسیع ہو گئی تھی۔ سوبھو صاحب نے ہمیشہ اپنی بیگم کے ایثار کا تذکرہ محبت اور احترام سے کیا ہے کہ انھوں نے زندگی کے ہر مرحلے میں پوری تن دہی کے ساتھ ان کا ساتھ دیا اور مشکل سے مشکل گھڑی میں بھی ہمت نہیں ہاری۔ سوبھو صاحب کی تو پوری زندگی ہی مسلسل جد و جہد، کٹھن حالات اور مالی طور پر عسرت میں گزری ہے۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد انھوں نے خاندان سے مالی اعانت کم ہی قبول کی تھی اور کل وقتی سیاسی کارکن کی حیثیت سے برائے نام گزارہ الاؤنس پر گزر بسر کرنے کو ترجیح دی ہے۔ ان کے گھر پر ہر وقت سیاسی و سماجی ورکرز، ادبی دوستوں اور ملاقاتیوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اور وہ بے چاری بغیر کسی نوٹس کے سب کی حتی المقدور خدمت کیا کرتی تھیں۔ بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھی انھیں کے ذمے تھی۔ انھیں زندگی کے اس مرحلے میں یہ احساس شدت سے ہونے لگا ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو زندگی کی وہ راحتیں اور آسائشیں فراہم نہیں کر سکے جن کے وہ حق دار تھے۔

جہانِ فکر و دانش

(مضامین، اداریوں، تقاریر اور انٹرویوز کی روشنی میں)

سوبھو گیان چندانی کا تعلق اس پیش رونسل سے ہے جو تحصیلِ علم اور تفہیمِ حیات کو زندگی کی بنیادی اقدار میں شامل سمجھتی ہے اور زندگی کو تقویمِ مہ و سال سے کہیں زیادہ معنویت کی حامل سمجھتی ہے۔ ان کے نزدیک ایک باشعور اور حساس آدمی صبح و شام اور شب و روز کی میکانیکی یکسانیت سے ماورا زندگی کی اُسی معنویت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے، اور کارگہِ حیات کو نوعِ انسانی کے لیے زیادہ سے زیادہ باعثِ رحمت، کارآمد اور مفید سے مفید تر بنانے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ بزرگوں کی یہ نسل اس بات کی شدت سے قائل رہی ہے کہ کائنات کی سب سے اہم حقیقت اور فعال کردار خود انسان ہی ہے اور اس کے چہار جانب پھیلے ہوئے اَن گنت فطری عناصر، قدرتی مظہر اور نامیاتی و غیر نامیاتی اسباب و عوامل کو خلاقِ ازل نے مخصوص ضابطوں اور قاعدوں کے تحت انسان کی انفرادی اور اجتماعی خدمت گزاری کے لیے ہی پیدا فرمایا ہے اور یہ انسان کا فرض ہے کہ وہ تمام فطری و قدرتی وسائل کو اجتماعی معاشرے کے لیے خیرِ کثیر کشید کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ بتاتی ہے کہ ازل سے تا امروز ظہور پانے والے مذاہب، علوم، فلسفے، نظریئے، خیالات، تصورات، قاعدے، قوانین، انکشافات اور ضابطے اپنی سرشت میں انسان دوست رہے ہیں اور ان میں سے ہر اک نے اپنے عہد اور بساط کے مطابق انسان کو انفرادی، گروہی اور اجتماعی طور پر زندگی کرنے کے کچھ نہ کچھ ایسے اصول ضرور سکھائے ہیں جن کے ذریعے ایک خاص معاشرتی صورتِ حال اور عہد میں رہنے والے انسانوں کے درمیان صرف عملی اشتراک کا اظہار ہوتا ہے بلکہ ان ہی کے توسط سے معاشرے کے اجتماعی خواب، خواہشیں، تصورات و خیالات، یقین و آگہی، توہمات و عقائد، خوف اور اندیشوں اور پسند و ناپسند کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ کسی خاص تہذیب اور تمدن کی تاریخ دراصل وابستگانِ تہذیب کے جہد و عمل کی کہانی ہوا کرتی ہے اور جہد و عمل کی سمت و رفتار ہی کسی تہذیب کے تغیر اور ارتقا کے مدارج متعین کرتی ہے۔ اس لیے اجتماعی

خیر کی دائمی ضرورت کو تقویت فراہم کرنے کے لیے ہر مہذب معاشرے میں ارتقائی سمت و رفتار کو باقی رکھنا باشعور افراد کا بنیادی فریضہ ہوا کرتا ہے۔

سوبھوگیان چندانی کے سوانحی حالات کا بالاستیعاب مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان کے کردار کی تکمیل میں سنجیدہ فکر و عمل کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے اور فکر و عمل کا دائرہ مطالعے، تجربے اور مشاہدے کے تناسب سے توسیع پاتا رہتا ہے۔ ان کی شخصیت کی تعمیر میں شعوری بالیدگی اور فکری پختگی کا سفر ارتقائی منازل طے کرتا دکھائی دیتا ہے اور خیالات، تصورات اور عملی کارکردگی میں کسی مرحلے پر ایک ہی دائرے میں محیط ہو جانے کا احساس نہیں ابھرتا۔

مطالعے کے تنوع، وسعت، ہمہ جہتی اور رنگا رنگی نے ان کے فکر و احساس، شعور و ادراک اور خیالات و تصورات کو ہر قسم کی عصبیت، عینیت پسندی اور رومانیت کے تاریک جنگل سے نکال کر حقیقت اور مادّی منطقیت کے روشن اجالوں میں پہنچا دیا تھا۔ وہ جہاں جدید علوم، فلسفے، تاریخ، سیاسیات، سماجیات، معاشیات، اخلاقیات اور تہذیبی مسائل کی جدلیات پر عالمانہ دسترس رکھتے ہیں، وہیں عالمی سطح پر چلنے والی ہر سیاسی، سماجی اور ثقافتی تحریکوں اور رویوں کو تمام تر سیاق و سباق اور ان سے پیدا ہونے والے اثرات کا اندازہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ دنیا اصل میں ایک کارگہِ اسباب و عمل ہے اور انسان کے اردگرد پھیلی کائنات ہر لمحہ تبدیلی سے دوچار ہوتی ہے۔ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے اور وہ نہ صرف خونی رشتوں کے دھاگوں سے بلکہ معاشی، معاشرتی اور اخلاقی بندھنوں سے باہم دیگر بندھا ہوا ہے۔ ان رشتوں کے نتیجے میں انسانی معاشرہ وجود پاتا ہے جس میں وقت کے ساتھ ساتھ تغیرات اور تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے اسباب اور عوامل کو تجزیاتی کسوٹی پر پرکھے بنا نہ تو تغیرات کو صحیح طور سمجھا جاسکتا ہے اور نہ اس تبدیلی کو سمجھے بغیر انسان مجموعی اعتبار سے اپنے تخلیقی سفر کو درست سمت میں جاری رکھ سکتا ہے۔ انھوں نے اوائل عمری ہی سے مارکسزم اور جدلیاتی منطقیت کا عالمانہ مطالعہ حاصل کیا ہے اور ان کا شمار سندھ کے نظریہ ساز دانشوروں میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ محض ایک کتابی عالم اور خلا میں گم فکری دانشور نہیں ہیں بلکہ عملی زندگی میں نچلی سطح پر سانس لیتی ہوئی زندگی کے ساتھ ہم نفسی کا حق بھی ادا کرتے رہے ہیں۔ وہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے ایک ایسے پُر جوش اور سرگرم عمل کارکن رہے ہیں جنھوں نے اپنے آدرش کی تکمیل اور حصول کی خاطر دنیا بھر کی سختیاں اور کٹھنائیاں جھیلی ہیں۔ لہٰذا ان کے جہانِ فکر و دانش میں علم و فلسفے اور فہم و ادراک کے ساتھ زندگی کے عملی تجربوں کی کہکشائیں بھی روشن ہیں۔ ان کے تفکر اور تصور میں نہ تو عالمانہ بقراطیت پیدا ہوتی ہے اور نہ بے لچک کج بحثی۔ وہ قدیم ہندوستانی ادبیات، ہندو دیومالائی تناظر، سندھی تہذیب و ثقافت اور اردگرد کی معروضیت کا بھی نہایت گہرا شعور رکھتے ہیں اور سائنسی و فلسفیانہ اصولوں کے ساتھ ساتھ عام آدمی کی

صدیوں پرانی سوجھ بوجھ کو بھی نہایت اہمیت دیتے ہیں کہ یہ عوامی سوجھ بوجھ صدیوں کے تجربوں پر محیط ہوا کرتی ہے۔

سوبھو گیان چندانی تخلیقی کہانی کار ہونے کے ساتھ بہت اچھے مضمون نگار بھی ہیں۔ انھوں نے متعدد مضامین، اداریوں، شذرات، تقاریر، لیکچرز اور یادداشتوں میں اپنے خیالات کا بہت تواتر کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ افسوس یہ تمام فکری اثاثہ ہنوز ترتیب واشاعت کے مراحل سے نہیں گزر سکا ہے۔

یہاں ہم ان تمام مضامین سے نہ تو اقتباس پیش کر سکتے ہیں اور نہ زیرِ نظر صفحات کی محدودات، ان کی تلخیص ہی پیش کرنے کی اجازت دیتی ہیں۔ لیکن سوبھو گیان چندانی کے فکر و دانش کے تناظر کو سمجھنے کے لیے ان کے بعض چیدہ چیدہ مضامین، تحریروں، تقریروں اور لیکچروں کے خلاصوں کی مدد سے سوبھو گیان چندانی کے جہان فکر و دانش کے بنیادی خطوط کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

عالم گیر شہریت

بے شک شانتی نکیتن کا تجربہ ان کی زندگی کا ایک اہم تجربہ ثابت ہوا ہے۔ وہ بندی جیسے دور افتادہ چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے جس کو اٹلس کے نقشے پر تلاش کرنا بھی ممکن نہیں۔ ابتدائی تعلیم بگھی، قمبر اور لاڑکانہ میں حاصل کرنے کے بعد کراچی آ گئے تھے اور یہیں سے انٹر پاس کرنے کے بعد شانتی نکیتن جانا ہوا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی زندگی کا سفر ایک چھوٹے دائرے سے بڑے دائرے کی طرف جاری رہا، جہاں ان کے تجربات کا حصار بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا ہے۔ نئے ماحول، نئے لوگ، نئی صورت حال نے ان کے علم، مشاہدے، فہم، ادراک، احساس اور خیالات میں بھی نت نئی تبدیلیاں پیدا کی تھیں اور اب تک وہ جو اپنی ذات کے آئینہ خانے میں عکسِ کائنات کی جھلکیاں دیکھنے کے عادی تھے اور اپنی زبان وثقافت اور تہذیب وتمدن ہی کو دنیا کی بہترین زبان وثقافت، تہذیب وتمدن سمجھنے کے خوگر تھے، جب انھیں ایک وسیع تر پلیٹ فارم پر متعدد ایسی قوموں کے لوگوں سے ملنے کے مواقع ملے جن کے بارے میں پہلے ان کا علم محدود تر تھا اور نہ صرف ان لوگوں سے ملنے کے مواقع ملے بلکہ عملی زندگی میں ان سے اکتسابِ فہم اور تحصیلِ علم وثقافت بھی کیا تو خود سوبھو صاحب کی زبان میں پہلی مرتبہ اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوا اور خیال آیا کہ انسان اپنی تمام تر انفرادیت اور اولوالعزمی کے باوجود تنِ تنہا محض ایک اکائی ہے جس کی اصل اہمیت اور کارپردازی ہی اجتماعیت سے ظہور پاتی ہے اور یہ معاشرہ ہی ہے جو اس کی انفرادیت شرفِ قبولیت اور توقیر سے نوازتا ہے لیکن جب آپ مختلف قوموں اور نسلوں کے درمیان سانس لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آپ کی سب سے پیاری اور میٹھی بولی سے کہیں زیادہ شیریں زبانیں اور بھی ہیں

جو عالم و اکناف میں معنی کے گوہر بکھیر رہی ہیں اور جن میں علوم کے ایسے ایسے خزانے موجود ہیں کہ باید و شاید۔ جب افریقا کے سیاہ فام اور بظاہر ناتراشیدہ بدن بہترین تہذیب اور عمدہ ثقافتی مظاہر کا نمونہ پیش کرتے ہیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے اور جب یورپ کے باشندوں کی سادگی اور انسان دوستی آپ کو گرویدہ کر لیتی ہے اور جہاں ہندوستان میں بولے جانے والی آٹھ ہزار زبانوں میں سے بعض زبانوں کے قدیم کلاسیکل ادب اور لوک ورثے ہیں اور ہزاروں میل دور دریافت ہونے والے تہذیبی مظاہر اور لوک ورثوں میں اور مختلف زبانوں کے عوامی ادب میں غیر معمولی شباہت اور ایک جیسی جذباتی وحسیاتی لہریں آپ کو شرابور کرتی ہیں۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ زبانیں نہ صرف دائیں سے بائیں جانب اور بائیں سے دائیں طرف لکھی جاتی ہیں بلکہ نیچے سے اوپر بھی لکھی جا سکتی ہے اور شعر و نغمہ کو صوتیات کے علاوہ تصویروں اور علامتوں میں بھی منتقل کیا جا سکتا ہے تو انھیں احساس ہوا ہے کہ ایک باشعور فرد اور قوم اپنی انفرادیت کے باوجود وسیع تر تناظر میں نوعِ انسانی کے رشتۂ ناپیدا کنار میں محض زنجیری سلسلے کے حلقے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کی اہمیت صرف اسی وقت اجاگر ہوتی ہے جب وہ اپنے وجود کو اس قابل بنائے کہ عالمی تہذیب کے سلسلے کی توسیع و توقیر کا سامان فراہم کر سکے اور انسانی تہذیب کی جلوہ سامانیوں میں اپنی علیحدہ شناخت قائم کرے۔ ان تصورات کے ساتھ ہی آپ اپنی چھوٹی سی دنیا سے نکل کر خود کو نسبتاً زیادہ وسیع دنیا کے درمیان گھرا پاتے ہیں اور خود کو ایشیائی، افریقی، یوروپی، امریکی اور آسٹریلوی شہریت کی بجائے عالمی شہریت کا حامل فرد سمجھنے لگتے ہیں۔

سوبھو صاحب نے اپنی خودنوشت سوانحی یادداشتوں میں بار بار اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ کرۂ ارض پہ بسنے والی خلقِ خدا اَن گنت اور متنوع، رنگوں، نسلوں، زبانوں اور تہذیبوں میں منقسم ہونے کے باوجود بے شمار مشترک خصائل، ضروریات، مقاصد اور احساسات کے رشتے میں بندھی ہوئی ہے اور اس گنگا جمنی اشتراک ہی سے وہ رنگ برنگی تہذیب، ثقافت اور نظام کار وجود میں آتا ہے جس کے شریک ہم سب ہیں۔ عالمی شہریت کا خواب اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے جب اس نظام میں شامل ہر اکائی اپنی جگہ مکمل اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہو، لہٰذا قوموں، نسلوں اور تہذیبوں کی خوش حالی، ترقی و توسیع ان کے درمیان باہمی روابط کو بھی زیادہ بامعنی اور ہمہ جہت بناتی ہے۔ ویسے تو کوئی فرد، قوم یا گروہ اس تہذیب، تمدن، علوم و فنون اور نظام اقدار سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرتا جو بزرگوں سے وراثت میں نسل در نسل منتقل ہوتی چلی جاتی ہے لیکن یہ بھی قانونِ فطرت ہے کہ انسانوں کی معاشرت ان کے عقائد، تصورات، اصول، ضابطے اور رہن سہن کے طور طریقے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی یہ تبدیلیاں تیز رفتار ہوتی ہیں اور ظاہری طور پر دیکھی جا سکتی ہیں اور کبھی نہایت آہستہ قدم اور سبک رو جنھیں محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن واضح نشان دہی نہیں کی جا سکتی کہ کون سا رواج، کون سا خیال اور کون سا

قاعدہ کب بدل گیا ہے۔ یہی وہ ارتقائی عمل ہے جس سے زندگی کے تمام مظاہر خاص طور پر انسانی معاشرہ گزرتا رہتا ہے جس کا اظہار اس کے تہذیبی ارتقا میں ہوتا ہے۔ معاشرتی ترقی کے وسائل پر قابض گروہ کی ہمیشہ یہ خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان وسائل کو زیادہ سے زیادہ اپنے شخصی، گروہی اور طبقاتی مفاد میں استعمال کرے اور محروم لوگوں، گروہوں اور طبقوں کو مزید محدود کرتا چلا جائے۔ چنانچہ وہ ہر اُس تبدیلی کے خلاف ایک زبردست رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے جو اس کے مقبوضات اور تصرفات میں کمی کا باعث بن سکے۔ چنانچہ کوئی نیا خیال، جدید تصور اور حکمتِ عملی قدامت پسندوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ نئے اور پرانے کی اسی کش مکش سے تبدیلی کا عمل ظہور پاتا ہے۔ لیکن انسان ترقی کی یہ راہ آسانی سے اور سیدھے سبھاؤ طے نہیں کرتے، ترقی نئے اور پرانے تصورات و خیالات، نئے اور پرانے معاشرتی اداروں اور نئی اور پرانی حکمتِ عملیوں کے مابین مسلسل پیکار اور جدوجہد ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے اور قدیم و جدید کے درمیان تصادم ہی کے نتیجے میں انقلاب وجود میں آتے ہیں۔ انقلاب کی کامیابی اور کامرانی اس بات میں مضمر ہوتی ہے کہ انسانی فلاح و بہبود کے بارے میں نئے خیالات اور تصورات کو پرانے اور فرسودہ خیالات و تصورات پر مکمل فتح حاصل ہو جائے۔ یہ تبدیلی صرف ظاہری سطح پر روبہ عمل نہیں آتی اور صرف معاشی و سیاسی رویے ہی تبدیل نہیں ہوتے بلکہ فلسفے، اخلاقی نظریے اور مذہبی عقائد تک میں تغیرات کا احساس ہوتا ہے۔ رہن سہن کے طور طریقے اور ادب و فنون کے بابت خیالات بھی بدل جاتے ہیں۔ زندہ معاشرے میں ہمیشہ مختلف اور متضاد قوتیں جو مختلف مفادات کی نمائندہ ہوتی ہیں، ایک دوسرے سے متصادم چلی آتی ہیں اور ہر قوت دوسری پر اپنی برتری ثابت کرنے کے درپہ ہوتی ہے، ترقی پسند قوتیں اس پوری صورتِ حال کا شعور حاصل کرتی ہیں اور اپنی پوری صلاحیتوں کو محروم، مجبور اور کمزور طبقات کے حق میں استعمال کرتی ہیں تاکہ انھیں بھی معاشرتی ترقی کی دوڑ میں شامل ہونے کا حق مل سکے اور ترقی کے فیوض و برکات سے مستفید ہو سکے۔

عوام کی آواز، خدا کی آواز ہے

بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی کا زمانہ عالمی اُتھل پتھل اور بے چینی کا زمانہ تھا۔ روس کے سوشلسٹ انقلاب نے دنیا بھر میں کمیونسٹ تحریکوں کو مقبول اور مضبوط بنا دیا تھا اور سوشلزم کو عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام کے متبادل نظام تصور کیا جانے لگا تھا۔ مارکسسٹ فلسفے، تاریخ کے جدلیاتی تصورات، عالمی معاشیات، سیاسیات اور سماجیات کے اشتمالی نظریات اب دنیا بھر کی علمی درس گاہوں میں پڑھائے جانے لگے تھے اور محنت کش عوام کی عالمی تحریکوں، انقلابی سرگرمیوں نے سرمایہ دار

اور صنعتی دنیا کے اہم مراکز کو نفسیاتی بحران اور دباؤ کا شکار بنا دیا تھا۔ گزشتہ تین ساڑھے تین سو برسوں کے دوران مغربی استعمار کی قوتوں نے (جن میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی اور پرتگال شامل تھے) اپنی طاقت اور مکار سیاست کے طفیل دنیا کے کمزور ممالک کے گرد نوآبادیاتی استعماریت اور لوٹ کھسوٹ کا جو جال پھیلایا تھا، اس کی طنابیں اب ڈھیلی پڑ چکی تھیں۔ ہندوستان جو برطانیہ کی سب سے بڑی اور سب سے قیمتی نوآبادی تھا، کم و بیش ایک سو سال سے سیاسی آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا اور اب حکمراں طبقوں میں بھی یہ باور کیا جا رہا تھا کہ ہندوستان کو مزید غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنا، شاید ممکن نہ ہو۔ مشرق بعید میں انڈونیشیا، ملائیشیا اور کئی دوسرے ممالک اپنے آزاد وجود پر اصرار کر رہے تھے اور افریقا کے متعدد ممالک میں نوآبادکاروں کے تسلط سے چھٹکارا پانے کی لگن تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد انگریزوں، فرانسیسیوں اور جرمنوں نے بندر بانٹ کے ذریعے عرب ممالک کی سرحدیں تک بدل کر رکھ دی تھیں تا کہ ان میں موجود تیل کے ذخائر پر غاصبانہ قبضہ جاری رکھ سکیں۔ امریکا ان معروف معنوں میں نوآبادیاتی نظام کا حصہ نہ تھا لیکن پہلی جنگِ عظیم کی برکات و ثمرات سے سب سے زیادہ مستفید امریکا ہی ہوا تھا کہ اس نے جنگ کے دوران ہر فریق کو ہلاکت خیز جنگی اسلحے کی فراہمی کے ذریعے اپنے خزانے پُر کیے تھے اور اب بھی وہ کسی ایسے خطرے کو قبول نہ کر سکتا تھا جو مہلک ہتھیاروں کی سوداگری، سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں محنت کش عوام کے استحصال اور عالمی بساط پر اس کی سیاسی برتری کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا ہو۔ چنانچہ دنیا واضح طور پر دو کیمپوں میں تقسیم ہو چکی تھی، ایک سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت اور سیاست کا کیمپ تھا جس کی نمائندگی اور سربراہی امریکہ کرتا تھا اور دوسرا دنیا بھر کے محنت کش عوام اور آزادی طلب کرنے والی قوتوں کا کیمپ تھا جس کی سربراہی سوشلسٹ روس کو حاصل تھی۔ سرد جنگ کے اس عالمی تناؤ اور کرۂ ارض کے دانشوروں، سیاست دانوں اور تخلیق کاروں کو بھی بالعموم فسطائیت، امپیریل ازم اور سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کے خلاف اور انسانی اقدار کی بالادستی، جمہوریت کی فتح مندی اور معاشی، سماجی اور سیاسی انصاف کی کامیابی کے حق میں سوشلسٹ کیمپ کا طرف دار بنا دیا تھا۔ کہیں یہ طرف داری پُر جوش پہل کاری کے ذریعے ہوتی رہی ہے جیسے ۱۹۳۵ء میں پیرس کے ادیبوں کی بین الاقوامی کانگریس برائے کلچر (World Congress of the Writers for Defence of Culture) اور کبھی خاموشی کے ساتھ عوامی سطح پر رائے عامہ کی ہمواری کے حوالے سے ہوتی تھی۔ اس پس منظر میں سوبھو گیان چندانی جیسے جمہوریت پسند، تحریکِ آزادیِ ہند کے پُر جوش حامی اور لبرل عالمی نظام کے ہم نوا شخص کو لازمی طور پر سوشلسٹ کیمپ کے سائے ہی میں بیٹھنا تھا۔ چنانچہ نوعمری کے زمانے ہی میں سوبھو صاحب کا ذہنی جھکاؤ سوشلزم کی طرف ہو چلا تھا۔ ہر چند ابھی وہ عملی سیاست کا حصہ نہ بنے تھے لیکن بنگال میں کمیونسٹ تنظیموں کے مختلف

سرگرمِ عمل گروہوں سے ان کے رابطے پیدا ہونا شروع ہو چکے تھے کیوں کہ اس وقت سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں پر قانونی طور پر پابندی لگی ہوئی تھی اور انھیں ہندوستان میں کھلے بندوں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت نہ تھی اور اس لیے وہ زیرِ زمین خفیہ طور پر انقلابی سرگرمیوں کو جاری رکھنے پر مجبورِ محض تھے۔

رومانیت اور ٹیگوریت کی جگہ سوشلسٹ تصورات اور خیالات کے لیے سوبھو صاحب کی پسندیدگی میں تیزی سے اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ مارکسزم و سوشلزم کے اساسی فلسفے کے مطالعے اور سرمایہ دارانہ و سوشلسٹ نظاموں میں ان کی دلچسپی روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور اب وہ اس بات کا شعور حاصل کرنے لگے تھے کہ انسانوں کے درمیان مقبول خیالات و نظریات اور عقائد خود بخود پیدا نہیں ہوا کرتے ہیں اور نہ آسمانوں سے نازل ہوتے ہیں بلکہ مادّی وسائل، طریقے، آلاتِ پیداوار اور رسل و رسائل کے ذرائع میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں ہی انسانوں کی فکر اور احساس کو براہِ راست متاثر کرتی ہیں۔ انسانی معاشرے اور سماج کی ساخت اور انسانوں کے درمیان موجود پیداواری رشتوں کو سمجھے بغیر تہذیبی و تمدنی تاریخ کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ وہ جانتے تھے کہ انسانی سماج اور معاشرے مختلف طبقات پر مشتمل ہوا کرتے ہیں جن کے درمیان باہمی ارتباط اور تضادات کی آمیزش اور آویزش مسلسل جاری رہتی ہے، طاقت ور اور نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ طبقے پیداواری وسائل پر زیادہ سے زیادہ تصرف حاصل کرنے کے لیے استحصالی تدابیر اختیار کرتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں کمزور طبقے مزید پسماندگی کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وہ صورتِ حال ہوتی ہے جس میں طبقاتی جدوجہد اور کش مکش پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ عام سیاسی، مذہبی، تہذیبی، اخلاقی خیالات، تصورات، فلسفے، نظریے اور عقائد ان ہی تبدیلیوں کے نتیجے میں ظہور پاتے ہیں۔ یہ ان کی شخصیت و کردار میں فکری بالیدگی کا زمانہ تھا۔ اور یہی وہ دور تھا جس میں انھیں شدت سے احساس ہوا کہ حساس اور باضمیر شخص دنیا بھر کے انسانوں کے دکھ درد کا ساجھی ہوتا ہے اور اس اعتبار سے وہ سندھی اور ہندوستانی ہونے کے باوجود خود کو ''عالمی شہریت'' کا رکن یعنی ورلڈ سٹیزن سمجھنے لگے تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف اکیس برس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنا معرکہ آرا مضمون ''عوام کی آواز، خدا کی آواز'' لکھا تھا جو کالج میگزین میں شائع ہوا تھا اور جسے نہ صرف ان کے استادوں نے پسند کیا تھا بلکہ شانتی نکیتن کے باہر بھی مقبولیت ملی تھی۔ ہر چند مذکورہ مضمون کا متن ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن اس کا جو خلاصہ بیان ہوا ہے، اس کے مطابق انھوں نے تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ بات ثابت کی ہے کہ دنیا کا کوئی فلسفہ، کوئی مذہب، کوئی نظام مقتدر انسانوں کو اپنے سے کم تر، کم زور لوگوں پر ظلم، جبر اور استحصال کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اس کے برخلاف ہر نظام نے عوامی فلاح و بہبود کے فلسفے اور قدروں کو افضل قرار دیا تھا۔ انھوں نے مزید لکھا تھا کہ انسان ہی مرکزِ کائنات ہے اور ہر مظہرِ فطرت

اجتماعی طور پر انسان کی خدمت پر مامور ہے۔

روسی انقلاب اور تاریخ کے فیصلے

اپنی زندگی کے اس دور کی بابت انھوں نے ایک انٹرویو میں بتایا:
''میں مارکس، لینن اور روسی انقلاب کو عالمی نجات دہندہ تصور کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر روس میں سوشلسٹ انقلاب برپا نہ ہوتا تو سامراجیت دنیا کے مظلوم عوام کو وہ تھوڑی بہت سہولتیں اور مراعات بھی نہ دیتی جو انھیں سوشل ریفارم اور اجتماعی بہبود کے نام پر خود سرمایہ دار معاشروں میں حاصل ہوئی ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں فاشزم اور سامراجیت کو جو شکست فاش ہوئی اور کرۂ ارض پر انسانی تہذیب اور معاشرت جس طرح محفوظ ہوگئی۔ وہ روس کے دو کروڑ سے زائد شہیدوں کی قربانی کا نتیجہ ہے۔ جنگ بازوں کا جنوں اور قتل و غارت گری اور تباہی و بربادی ہی کا حاصل تھا کہ دنیا بھر کے مظلوم اور امن پسند عوام مارکسزم اور سوشلزم کو تاریخ کی آخری پناہ گاہ تصور کرنے لگے تھے۔ جس طرح انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء تا ۱۶۹۳ء) تمام یورپ سے مطلق العنان بادشاہت اور ظالمانہ جاگیردارانہ نظام کی بنیادی اکھاڑ پھینکی تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی امریکا کی جنگِ آزادی نے وہاں ایک جمہوری معاشرے کے قیام کے لیے راہ متعین کردی تھی۔ بالکل اسی طرح روس کے سوشلسٹ انقلاب (۱۹۱۷ء۔۱۹۱۴ء) نے دنیا بھر کے کروڑوں بے کس و بے سہارا عوام کو ایک نیا حوصلہ اور نئی ہمت بخشی تھی جس میں وہ اجتماعی فلاح اور بہبود کے حامل نظام قائم کرسکتے تھے۔ انقلاب سے قبل روس کی معاشی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی حالت بھی قعرِ مذلت میں گھری ہوئی تھی اور روسی عوام مایوسی کی تاریکی اور بے یقینی کے دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اور ان کے سامنے روشنی کی کوئی کرن نہ تھی جو ان کی تاریک ہوتی نگاہوں میں امید کی جوت جلا پاتی۔ عین اس وقت لینن ٹراٹسکی اور ان کے انقلابی ساتھیوں نے عوام کو انقلابی جدوجہد کے لیے منظم کیا اور مایوسی میں گرفتار لوگوں کے ہاتھوں میں امید اور حوصلے کی مشعلیں تھمادیں۔ چنانچہ روس کے انقلاب نے دنیا کی محنت کش تنظیموں کو یک نیا حوصلہ بخشا اور استحصال کے خلاف

جدو جہد کی راہ دکھلائی۔ چنانچہ روسی انقلاب چین اور کیوبا کے انقلاب کے لیے
پیش خیمہ ثابت ہوا اور دنیا میں صدیوں سے قائم نوآبادیاتی نظام کی جڑیں اکھاڑ
پھینکنے کے لیے جو عوامی اور جمہوری تحریکیں چلی ہیں، انھوں نے بھی انقلاب روس
سے روشنی اور تقویت حاصل کی تھی۔''

ہر چند سوبھو صاحب مارکسزم کی تاریخ اور فلسفے پر عالمانہ دسترس رکھتے ہیں لیکن وہ مارکسزم کے روسی یا چینی ماڈل کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے۔ انھوں نے اسٹالن کی حکمت عملیوں اور انتظامی صلاحیتوں کو بھی معتبر نہیں جانا اور اسٹالن کی ظالمانہ کارروائیوں کو مجرمانہ کارروائیوں ہی سے تعبیر کیا ہے۔ اسٹالن کے مقابلے میں ٹراٹسکی کو وہ ایک سنجیدہ مارکسی مدبر اور قائد سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک طویل سلسلہ ہائے مضامین میں جو ''بعض لوگ تاریخ ہوتے ہیں'' کے عنوان سے ''سانجاھ'' نامی رسالے میں قسط وار شائع ہوا ہے، سوویت روس اور اس سے وابستہ بلاک کی شکست وریخت کا نہایت غیر جانب داری اور ٹھوس علمی انداز میں تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''اس موضوع پر جاری عمومی بحث مباحثے میں جذباتیت سے ہٹ کر تاریخی جدلیاتی طرزِ استدلال کو اختیار کرنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ ایک سوشلسٹ معاشرے کا خواب جس میں انسان ہر قسم کے استحصال اور استبداد سے آزاد ہو کر انسان کے لیے خیرِ کثیر کی خواہش کرتا ہے، کیا اس خواب کی تعبیر مارکسزم، لینن ازم کے علاوہ کسی اور ضابطۂ حیات میں بھی حاصل ہونے کے امکان ہو سکتے ہیں، کیوں کہ غیر طبقاتی اور غیر استحصالی معاشرے کا خواب تو انسان مارکسزم، لینن ازم، اسٹالن ازم اور ماؤ ازم سے پہلے بھی دیکھتا رہا ہے اور تاریخ کے ہر دور میں اپنے اس خواب کی تعبیر تلاش کرتا رہا ہے اور ہر تاریخی دور میں اپنی چھوٹی چھوٹی کامیابیوں سے خیالی بہشت آفرینی کی آس لگاتا رہا ہے۔ چنانچہ یورپ کے صنعتی انقلاب اور مشین کی طلسماتی کارکردگی سے بھی اس نے ایک خوش حال زندگی کی توقع باندھی تھی لیکن اسے جلد معلوم ہو گیا کہ مشین تو طاقتور طبقے کے ہاتھ میں ایک نئی پیداواری قوت ہے، جس نے معاشرتی نظام میں انسان کی قیمت اور اہمیت کم کر دی ہے۔ اس صورت حال میں صنعتی سرمایہ داری کا ایک پورا نظام وجود میں آیا اور اس نے نئی استحصالی اقدار کو جنم دیا لیکن انسان کی اجتماعی مدافعت کی سرشت نے بھی ہار نہ مانی اور کیپٹل ازم کے مقابل نئے نئے سوشلسٹ نظریے بھی وجود میں آتے رہے۔ چنانچہ مارکسزم انسان کی اسی

جدلیاتی جدوجہد کے اعلیٰ ترین سائنسی نظام کی صورت میں ظاہر ہوا ہے لیکن اس کو آخری عقیدے کی حیثیت حاصل نہیں ہے اور انسانی معاشرے کے اجتماعی تجربے اور اجتہاد کی روشنی میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں لازمی ہیں۔ چنانچہ مارکسزم اور سوشلزم کے روس اور چین میں جو تجربے کیے گئے ہیں اور نتیجے میں جو دو مختلف ماڈل وجود میں آئے ہیں، انھیں حتمی اور حرفِ آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیوں کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں سوشلزم کی مختلف اقدار مختلف معاشروں میں وہاں کی ضرورت اور حالات کے مطابق بروئے کار لائی جاتی رہی ہیں۔ سوویت روس میں سوشلزم کے تجربے اور اطلاق میں لیڈر شپ نے جو فاش غلطیاں کی ہیں، وہ اب انسانی علم و شعور کا حصہ بن چکی ہیں۔ بے شک لینن کی سرکردگی میں سوویت کمیونسٹ پارٹی نے روسی عوام کو صدیوں پہ محیط غیر معمولی غربت، نکبت اور افلاس سے صرف چند عشروں میں نجات دلا دی تھی اور انھیں زندگی کی بنیادی ضرورتیں فراہم کر کے ایک معجزاتی کرشمہ کر دکھایا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سوشلسٹ سماج کی بنیادی قدر جمہوریت اور آزادیِ اظہار کو سانس لینے کی اجازت نہیں دی گئی جس کی وجہ سے معاشرہ تاریک گلی (Blind street) میں بند ہو کر رہ گیا تھا لیکن ہمیں اس عالمی دباؤ کو بھی پیشِ نظر رکھنا پڑے گا جس کے تحت روسی بلاک کو ایک مضبوط فوجی مشین بننے پر مجبور کیا گیا۔ دو عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں اور ان کے اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ روسی لیڈر شپ کی اور بہت سی دوسری مجبوریوں کو بھی پیشِ نظر رکھا جانا ضروری ہے لیکن ان تمام مصائب، مشکلات اور چیلنجوں کا مقابلہ صرف عوامی شعور کی اجتماعیت ہی سے ممکن تھا، جو جمہوری طور طریقوں اور آزادیِ اظہار کے بغیر ممکن تھا۔ سوویت روس میں کمیونسٹ پارٹی ہی کے مختلف دھڑوں میں جو قتل و غارت گری ہوئی وہ کسی بھی طور پر سوشلسٹ نظریات کی تائید حاصل نہیں کر سکتی۔ بے شک اجتماعیت، سوشلسٹ معاشرے کی اساس ہوتی ہے لیکن اسے محنت کشوں کی نچلی سطح سے ابھرنا چاہیے تھا نہ کہ بالائی انتظامیہ کے زور پر۔ چنانچہ روس نے بیوروکریسی کا جو تجربہ کیا ہے، اسے کسی بھی طور پر سوشلسٹ تعلیمات کا حاصل قرار نہیں دیا جا سکتا۔''

غرض سوبھو گیان چندانی روس کے سوشلسٹ بلاک کے منہدم ہونے کو جہاں ایک تاریخی المیہ قرار دیا

ہے، وہیں اس توقع اور خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ آنے والے ادوار میں انسان سوشلزم کے تجربے میں روسی عوام کے تاریخی تجربے کو ضرور مشعلِ راہ بنائے گا۔

روشن خیال پاکستان آزادیِ ہند کا ثمر ہے

سوبھو گیان چندانی بنیادی طور پر آدرش وادی شخص ہیں اور ان کی عملی جدوجہد مکمل کمٹ منٹ، ایثار، اَن تھک محنت، غیر معمولی ایثار اور قربانی سے عبارت رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے فیصلے اندھی تقلید اور بنیاد پرستانہ عقیدت کی بجائے بے لاگ منطقی حقیقت پسندانہ عملی کارگزاریوں اور اسباب وعوامل کے جدلیاتی تجزیے سے عبارت رہی ہے اور اس سلسلے میں وہ گراس روٹ لیول یعنی بنیادی طور پر موجود کارکن تک کی رائے اور تجویز کو اہمیت دینے کے قائل رہے ہیں۔ عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد جیسے جیسے ان کی دلچسپی بائیں بازو کی سیاست میں بڑھتی گئی، وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے قریب تر ہوتے چلے گئے اور پارٹی لائن کے مطابق محنت کشوں، ہاریوں، طلبا تنظیموں اور ادبی وتہذیبی سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ متحرک ہوتے چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنی رہائش بھی پارٹی کے قائم کردہ کمیون میں اختیار کر لی تھی۔ اس زمانے میں کراچی بائیں بازو کی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور ہر محاذ پر اچھی خاصی ہماہمی اور چہل پہل کا احساس ہوتا تھا۔ اس زمانے میں گوبند پنجابی، کیرت بابانی، گوبند مالھی، لیکھو تلسانی، جشو کیول رامانی، اندر کمار گجرال، ای کے ہنگل، سیّد جمال الدین بخاری، قاضی مجتبیٰ وغیرہم مختلف محاذوں پر سرگرمِ عمل تھے۔ ان میں سے بعض لوگ سوشلزم سے ہمدردانہ دلچسپی رکھتے تھے لیکن ان کا جھکاؤ کانگریس کی جانب رہا تھا اور بعض اصحاب سندھ میں مسلم لیگ کی سیاست کو بائیں بازو کے زیرِ اثر لانے کے خواہاں تھے تاکہ ہندوستان کی آزادی کی اسکیم کے نتیجے میں ایک جمہوری اور روشن خیال پاکستان کا قیام عمل میں آسکے۔ اگرچہ سوبھو گیان چندانی مذکورہ پارٹی پالیسی کے بعض پہلوؤں سے کلی اتفاق نہ رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے پارٹی کے فیصلے کے مطابق مسلم لیگ سے اشتراکِ عمل کی فضا پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش جاری رکھی۔ اور قیامِ پاکستان سے دو سال قبل کراچی میں مسلم لیگ کے تعاون سے نہایت تزک واحتشام کے ساتھ یومِ پاکستان منایا۔ وہ روشن خیال پاکستان کو آزادیِ ہند کا ثمر سمجھتے ہیں۔ ایک جمہوری، روشن خیال، خوش حال پاکستان کے آدرش کا حصہ ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''پاکستان عوامی جدوجہد کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے اور ایک زندہ حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے قیام کا بنیادی مقصد یہاں رہنے والے عام لوگوں کو بلا تخصیص رنگ ونسل اور مذہب وسیاست زندگی کے ہر میدان میں یکساں اور

مساوی مواقع فراہم کیے جائیں۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ سندھ میں آباد ہندو جن کی اکثریت مڈل کلاس سے تعلق رکھتی تھی اور سرکاری مشینری کو چلانے کی اہل تھی، وہ فرقہ واریت کے ہاتھوں غیر محفوظ ہو جانے کی بنا پر ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے اور یہاں ایک ایسا خلا چھوڑ گئے جسے سندھی مسلمان پورا کرنے سے قاصر تھا۔ کیوں کہ سندھی مسلمانوں میں آبادی کے تناسب سے تعلیم کا فقدان تھا اور ان کا زیادہ تر انحصار زرعی معیشت پر تھا۔ غریب ہاریوں کو سندھی زمیں دار کے جبر کا سامنا رہا ہے لیکن اس کے باوجود سندھ میں سبز انقلاب برپا ہوا ہے اور زرعی اعتبار سے ہم نے نہ صرف اپنی فی کس پیداوار میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے بلکہ جدید زرعی تجربوں کے ذریعے نئی نئی اجناس بھی پیدا کیے ہیں۔ اگر چہ سندھ کو زرعی سہولتیں پنجاب کے مقابلے میں کم حاصل رہی ہیں لیکن سندھ کے محنتی ہاریوں نے ان محدودات کے باوجود کمال کر دکھائے ہیں۔

انھوں نے سندھ میں ترقی پذیر معاشرے کے فروغ کو نیک فال قرار دیتے ہوئے اس بات پر سخت تنبیہ بھی کی ہے کہ زرعی بینکوں سے قرض حاصل کر کے ٹریکٹر خریدنے اور آب پاشی کے نظام کو بہتر بنانے کا عمل تو قومی ترقی کا وسیلہ ہے اور سندھی ہاریوں اور چھوٹے زمیں داروں کو ان سہولتوں سے استفادہ کرنا چاہیے اور زمین کی پیداواری قوت کو بڑھانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنی چاہییں۔ لیکن اگر اس قرض سے آپ اپنے لیے جدید طرز کے بنگلے بنانا چاہتے ہیں اور قرض میں حاصل کی ہوئی رقم کو عیش وعشرت پر اڑانا چاہتے ہیں تو پھر آپ اپنی زمینوں سے ساتھ اور اپنی نسلوں کے ساتھ کوئی اچھائی نہیں کر رہے ہیں، ملک دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں اور ندی نالوں کا نام نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ عبارت ہے اس خطۂ زمین میں آباد لوگوں سے اور جب ہم اپنے ملک کی خوش حالی کی بات کرتے ہیں تو دراصل ہمارے پیشِ نظر اپنے ہم وطنوں اور عوامی طبقوں کی مجموعی بھلائی اور خوش حالی ہوتی ہے، جب ہم سندھ میں زرعی ترقی اور سبز انقلاب کا نعرہ لگاتے ہیں تو یہ نعرہ اس وقت تک حقیقت کا روپ نہیں دھار سکتا جب تک سندھ میں آب پاشی کے نظام کو بہتر نہ بنایا جائے۔ سندھ کی زرعی ترقی ہو کہ صنعتی ترقی ہو، شہری معاشرہ ہو کہ دیہی معیشت، سندھ کی ترقی اور بہبود کے لیے سب کو مل جل کر کام کرنا پڑے گا جو شخص بھی سندھ میں آباد ہے اور

سندھ کو اپنا سمجھ کر اس کی ترقی میں اپنا حصہ فرض سمجھ کر نبھاتا ہے، سندھ بھی اس کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیتا ہے کہ یہی ہماری روایت اور یہی ہمارا چلن ہے۔''

ادب وفن کی متنوع جہات

سوبھوگیان چندانی نے ''ادب وفن'' کی بابت اپنے فکری تصورات اور نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون ''ادب اور فن کا سماجی مقصد'' میں ادب وفن کے بنیادی کردار اور مقصدیت کی توضیح کی ہے اور یہ بتایا ہے:

''قدیم دیومالائی ادب، مذہبی صحیفوں اور لوک کہانیوں میں بھی اگر غور کیا جائے تو انسانی معاشرے کی فلاح و بہبود کی مقصدیت پر اصرار کیا گیا ہے۔ کہیں صاف اور براہِ راست تخاطب کی صورت میں اور کبھی علامتی و اشاراتی انداز میں۔ یہ سب قدیم تحریریں انسان کی اجتماعی یادداشت کا نہایت قیمتی ذخیرہ ہیں، جنھوں نے اپنے اپنے عہد میں انسانوں کی رہنمائی کرنے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ دراصل ادب وفن اپنے خیالات، تاثرات، تصورات، جذبات و احساسات کو نہ صرف نہایت مؤثر اور خوش کن انداز میں دوسروں تک پہنچانے سے عبارت ہے بلکہ ان کا بنیادی فریضہ یہ بھی ہے کہ اپنے قاری اور ناظر کے مزاج میں کم و بیش ویسی ہی جذباتی کیفیت پیدا کر سکے جس سے خود ادیب یا فن کار دوچار ہوا ہے۔ اگر کوئی فن پارہ اپنے قاری یا ناظر کے احساسات کو انگیخت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے اور اس میں کسی بھی مثبت یا منفی ردِ عمل پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ تو یہ ایک طرح سے فن کار کی فنی ناپختگی کی علامت ہوتی ہے لیکن ہر فن کا بنیادی مقصد انسان کے احساسِ جمال کی تسکین کے ساتھ ساتھ اس کے اندر تخلیقی صلاحیتوں کو جِلا بخشنا بھی ہوتا ہے۔''

دراصل قدیم تصورات کے مطابق فنونِ لطیفہ (رقص، موسیقی، شاعری، مصوری، سنگ تراشی) کی ابتدا انسانوں کے اپنے اجتماعی تخلیقی عمل کے اظہار کے لیے ہوئی تھی جس کے ذریعے وہ اپنے دیوتاؤں کو خوش کرتے ہیں جو اُن کی حفاظت کرتے ہیں، انھیں معاشی آسودگی دیتے ہیں اور ان کی زندگی میں محبت کا رس گھولتے ہیں۔ اس لیے دیومالائی تصورات میں ان فنون کے ساتھ مذہبی تقدس بھی منسلک رہا ہے۔ جیسے جیسے انسان کا سماجی شعور و ادراک واضح اور حقیقت پسندانہ ہوتا گیا ہے، ویسے ویسے فنونِ لطیفہ کے

مقاصد بھی زیادہ سے زیادہ واضح اور حقیقت پسند ہوتے گئے ہیں۔ معنی آفرینی تو ادب وفنون کی روح سے عبارت ہے۔ بے معنی اور بے مفہوم عبارت کو فن کے کسی بھی درجے میں رکھنا تو الگ ہے، اسے فن کا درجہ بھی نہیں دیا جاسکتا، اپنے خیالات کی ترسیل کیے بغیر اور اپنے تصورات کو دوسروں تک پہنچائے بغیر ایک شاعر اور ادیب کسی قسم کی داد طلب نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اعلیٰ ادب واعلیٰ فن ترسیل سے اگلی منزل پر گامزن ہوتا ہے اور اس میں اتنا تاثر اور قدرت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے خیالات کو تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ ادیب کی تحریر میں تاثر اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ اپنے پڑھنے والے کو فکری و جذباتی آسودگی فراہم کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ بے شک ادب کا اپنا ایک فعال سماجی کردار ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا جمالیاتی کردار بھی ہے۔ ادیب اور شاعر اپنے خیالات وتصورات میں جتنا کھرا اور سچا ہوگا، اس کی تخلیق بھی اپنی فعالیت میں اسی قدر بلند، خوب صورت، مؤثر اور دیرپا ہوگی۔

ادب برائے ادب کا فلسفہ غیر منطقی اور بے بنیاد ٹھہرتا ہے۔ ابتدا سے لے کر آج تک جو تحریریں لکھی گئی ہیں اور جو نقوش کندہ کیے گئے اور جو تصویریں بنائی گئی ہیں، ان سب کا بنیادی مقصد فن کار کے خیالات و جذبات اور تاثرت کا فن کارانہ اظہار، ترسیل اور کمیونی کیشن ہی رہا ہے۔ ادب کا بنیادی مسئلہ اور موضوع خود انسان کی ذات اور اس سے وابستہ عناصر ہوتے ہیں۔ انسانوں کے درمیان رشتے ناتے، باہمی ربط و تصادم اور گرد و پیش موجود ماحول اور ہمہ وقت بدلتی ہوئی صورتِ حال سب ادب کے دائرۂ کار میں آتے ہیں۔ شروع سے لے کر آج تک انسان معاشرتی بہبود کی جس جدوجہد میں مصروف رہا ہے، ادب اُس میں نہایت کارآمد ہتھیار ثابت ہوا ہے۔ لہٰذا قدیم زمانے سے ایسے کتنے ہی ادیب، شاعر، دانشور اور مفکر گزرے ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں اور خیالات سے تاریخ کی باگیں انقلاب کی طرف موڑ دی ہیں اور اپنی تخلیقی سرگرمیوں کا محور اس مقصد کو بنایا ہے جس کے تحت انسانی معاشرے کو بھوک، جنگ اور ظلم سے بچایا جاسکتا ہو اور محنت کش، نادار اور بے وسیلہ آدمی کو بہتر زندگی کی نوید سنائی جاسکتی ہو۔ اس طرح وقت کے ساتھ ادب وفن کی مقصدیت میں تنوع اور گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی ہے اور ایسا ادب وفن جو ابہام پسندیت، لایعنیت، بے مقصدیت، اوہام پرستی اور زندگی کے سفر میں آگے پیش رفت کرنے کی بجائے پیچھے کی طرف مراجعت کرنے کو اہمیت دیتا ہو، اب محض خیالِ خام ہوکر رہ گیا ہے۔

ترقی پسند اور قدامت پسند ادب کے درمیان خطِ فاصل بھی یہی نکتہ ہے کہ کون سا ادب زندگی کی قدروں کو وقت سے ہم آہنگ کر کے آگے کی سمت سفر اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے اور کون سا ادب انسان کو ماضی پرستی کی طرف لے جاتا ہے اور اس میں مذہبی کٹرپن، تعصب اور زوال آمادگی کے اثرات پیدا کرتا ہے۔ لیکن ابھی سندھی زبان میں ایسا ادب بہت زیادہ طاقت ور نہیں ہوسکا ہے جس میں نسل درنسل تک ذہنوں پر چھا جانے کی تاثیر ہو اور نہ ایسی ادبی قدریں مضبوط ہوسکی ہیں جو زوال آمادہ رویوں کا راستہ

روکنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ اس کے علاوہ ایک اور طرح کا رجحان دیکھنے میں آتا ہے جو دراصل ترقی پسند ادب اور قدامت پسند ادب کے درمیان نشو ونما پا رہا ہے جس کی ساری خوبی ابہام میں پنہاں ہے جس طرح جرمنی میں کافکا کی تحریریں ہیں اور امریکا میں بھی اس رجحان کی پذیرائی ہوئی ہے اور مشرقِ وسطیٰ میں خلیل جبران کے ہاں بھی اس رجحان کی نشان دہی کی جا سکتی ہے لیکن دیکھا جائے تو ان مصنفوں کو بھی اپنے اردگرد ماحول اور معروضی حقائق سے متاثر ہونا پڑا ہے، اور اپنے اپنے ملکوں کی ترقی پسند قوتوں اور طبقوں کا سہارا لینا اور جواب میں ترقی پسند قوتوں کی جدوجہد کو سہارا دینا پڑا ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر ان رویوں کے آگے بڑھنے کے امکانات پیدا ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ لوگ ایسے ادب کو پڑھنے کے روادار نہیں ہوتے جو ان کے دکھوں، سکھوں اور بہتر زندگی کی خواہش اور جدوجہد کی ترجمانی سے عاری ہو، جو ادب زندگی سے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دیتا ہے، وہ قطعی طور پر قابلِ مطالعہ نہیں ہوتا۔ انسانی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ اس نوع کا ادب زندہ نہیں رہ پاتا۔ اور صرف اسی ادب کو دوام حاصل ہوا کرتا ہے جو انسانوں کے وسیع تر احساسات، جذبات، امنگوں، خواہشوں اور مفادات سے وابستگی رکھتا ہو اور ان کی ترجمانی کرتا ہو۔

بے شک سندھ کا قدیم نثری ادب بجھارتوں، رمزیہ باتوں، کہاوتوں، ضرب الامثال اور مقولوں پر مشتمل تھا لیکن ان میں بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور پنہاں ہوتا تھا۔ ایسا ادب بھی کوئی نہ کوئی مقصدی کردار ادا کر رہا ہوتا ہے جسے لوگ محض وقت گزاری کی خاطر اختیار کرتے ہیں کہ ایسے معاشرے میں کتابیں پڑھنے کی مہلت اور سہولت صرف کھاتے پیتے اور خوش حال طبقوں ہی کو حاصل ہوا کرتی ہے لیکن عام لوگ جو سدا محنت و مشقت میں دبے رہتے ہیں اور جن کو محدود فرصت کے لمحات میں ایسے ہی ادب کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے جذبوں اور امنگوں سے ہم آہنگ ہو اور جو ان کی جہدِ حیات سے وابستگی رکھتا ہو۔ ترقی پسند ادب کے بنیادی نظریے، رویے اور نصب العین پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سوبھو صاحب نے لکھا ہے کہ ادب، شاعری، آرٹ، مصوری اور رقص دراصل ان ہی قوتوں کے مظہر اور عکاس ہیں جو انسان کے تخلیقی جوہر کو ابھارتے ہیں اور معاشرے میں جاری تخلیقی عمل میں موجود کش مکش اور شکست و ریخت کی آئینہ داری کرتے ہیں اور اس طرح ادب اور آرٹ معاشرتی قوتوں کے درمیان باہمی آویزش اور کش مکش کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انسان دوست ادبی رویہ صرف وہی ہے جس کی ترجمانی ترقی پسند ادب کرتا ہے کہ ترقی پسند ادب وہی ہے جو انسان کی تہذیبی تاریخ، عوامی فلاح و بہبود اور انسان کی دائمی اقدار کی توسیع اور فروغ میں معاون ہوتا ہے۔ مارکسی نظریۂ ادب کوئی علاحدہ اور جداگانہ نظریہ پیش نہیں کرتا ہے بلکہ ادب و فن کے بارے میں مارکسی ادیب بھی ان ہی بنیادی اقدار اور اصولوں کی ہم نوائی کرتا ہے جو پہلے ہی سے معاشرے میں رائج رہے ہیں اور جن کی عہدِ حاضر

میں ضرورت ہے۔ حکمراں طبقہ اور استحصالی قوتیں ترقی پسند ادب اور ادیبوں کے بارے میں جو شور و غوغا بلند کرتے ہیں، اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔

وہ کہتے ہیں:

''ترقی پسند مارکسی نظریے کا پروردہ ہے اور اسی لیے اس میں نعرے بازی ہی نعرے بازی کا وفور ہے۔''

اس میں تو کوئی کلام نہیں ہے کہ ادب اور آرٹ کو کسی خاص نعرے کے کھونٹے سے نہیں باندھا جاسکتا کہ نعرے بازی تو وقت کے ساتھ تبدیل ہو جاتی ہے، لیکن ادب اور آرٹ اپنی سرشت میں وسیع البنیاد تنوع کے متقاضی ہوتے ہیں اور فن کے اظہار میں فطرت سے ہم آہنگ، دیرپا اور دائمی جمالیاتی حسن، لطافت، مہک، کشش اور ندرت کی دائمی قدروں کی کارفرمائی لازمی ہوتی ہے۔ یہ وہ آفاقی قدریں ہیں جو معروضی تناظر کے تبدیل ہو جانے کے بعد بھی دیر تک باقی رہتی ہیں اور جن پر قابلِ اعتبار دسترس اور ماہرانہ استعمال سے ادب و فن میں کہیں زیادہ گہری معنویت اور تاثر پذیری پیدا ہو جاتی ہے۔

ادب میں نعرے بازی کی بابت اظہارِ خیال کرتے ہوئے سوبھو صاحب نے لکھا ہے:

''ادب وفن نعرے بازی کے متحمل نہیں ہو سکتے اور مقصدیت و نعرے بازی دو مختلف چیزیں ہیں جنھیں ایک دوسرے کے متبادل سمجھنا غلط ہوگا۔ مقصدیت کا اظہار فنی دروبست، ہنرمندی، مہارت، چابک دستی اور سلیقہ مندی سے کیا گیا ہو اور موضوع و اظہار کے درمیان حسین اور پُر تاثر اشتراک باہمی پیدا نہ کیا جاسکے تو پھر ادب، ادب نہیں رہتا اور اس پر نعرے بازی مسلط ہو جاتی ہے۔ ایسے ادب کی زندگی مختصر اور دائرۂ اثر محدود ہوتا ہے۔ مقصدیت ادبی تخلیق میں جاری روح اور خوش بو کی طرح گندھی ہوئی ہونی چاہیے نہ کہ اوپر سے ٹانگی ہوئی دکھائی دینی چاہیے۔ ایسے ادب کے مطالعے سے وہ شخص بھی جو زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے فرار اختیار کرنے کی سوچ رہا ہوتا ہے، دوبارہ زندگی کی جدوجہد میں شامل ہو جاتا ہے کہ ایسے ادب میں وہ اپنے دل کی دھڑکن محسوس کرتا ہے اور اس کے اندر نئے جوش، جذبے اور امنگوں کی توانا اور حیات بخش لہریں پیدا ہوتی ہیں اور وہ پُر جوش انداز میں معاشرے اور ملک کی خاطر لڑنے کو بھی تیار ہو جاتا ہے۔''

سوبھو صاحب نے سندھی ادب کے ترقی پسند رجحانات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''سندھی ادب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شروع ہی سے ترقی پسندانہ تصورات اور خیالات کا اظہار ہوتا رہا ہے اور جس کی اعلیٰ ترین مثال شاہ

عبداللطیف بھٹائی کی شاعری سے دی جاسکتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں جن اقدار کو ابھارا ہے، ان کا تعلق نفیِ ذات سے نہیں بلکہ زندگی کے اثرات اور ارتقا سے ہے۔ سچائی، خوب صورتی، محبت، انسان دوستی اور حب الوطنیت کے عناصر ایسے آفاقی آدرش سے عبارت ہیں جو ہر دور، ہر معاشرے اور ماحول میں یکساں طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کی تاثیر ہر نسل اور ہر عہد میں نہ صرف قائم چلی آتی ہے بلکہ اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ شاہ صاحب ہر زمانے کے مقبول ترین شاعر رہے ہیں۔ یہ بات بھی حقیقت ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنی شاعری میں جو تشبیہات اور استعارے استعمال کیے ہیں اور جن کرداروں کی تمثیل کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے، وہ سب کے سب انھوں نے اپنے عہد اور ماحول سے منتخب کیے تھے، لیکن ان کی پیش کش اور معنویت میں ایسی آفاقیت ہے کہ اسے ہم ہر زمانے اور عہد سے وابستہ پاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک طرف شاہ لطیف کی شاعری، ترقی پسند عناصر کا شاہ کار ہے، وہیں آفاقی اقدار کی امین بھی ہے۔ ہمارے بعض دوستوں کا خیال ہے کہ شاہ لطیف نے اسلام کی پرچار کی ہے اور وہ اس کی شاعری میں سے ایک ملاّ (مولوی) کو برآمد کرنے کی کاوش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ لیکن بہ غور دیکھیے تو یہ محض انتہا پسندانہ نکتۂ نظر کا نتیجہ اور شاخسانہ ہے کہ ایسے لوگ حقیقتِ حال تک پہنچنے کی بصیرت سے محروم ہوتے ہیں، وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ شاہ لطیف کسی ایک خاص مذہب کا مبلغ نہیں تھا اور نہ اس نے اپنی شاعری کو مذہبی تبلیغ کا ذریعہ بنایا ہے۔ بلکہ وہ تو زندگی کے وسیع تر مظاہر کا مصور تھا اور اس نے اپنے عہد اور اردگرد پھیلے ہوئے مظاہرِ حیات، انسانی جذبات اور واردات ہی کو اپنے ابیات میں سمویا ہے۔ لطیف کسی مسجد کے تنگ و تاریک حجرے میں پڑے رہنے کی بجائے کھلے عام ڈیروں اور سنیاسیوں کی صحبت میں پایا جاتا ہے۔ دراصل وہ زندگی میں بھلائی اور انسان دوستی کے جوہر کا متلاشی رہا ہے اور یہ چیز اُسے جہاں بھی نظر آئی ہے، اسی طرف وہ کشاں کشاں جاتا دکھائی دیتا ہے۔ چونکہ مذہب بھی زندگی کی ایک اہم حقیقت اور سچائی کا نمائندہ ہوتا ہے، اس لیے لطیف نے مذہب سے بھی ان بلند اور آفاقی قدروں اور سچائیوں کو اپنی شاعری میں سمولیا ہے جن سے عالم گیر محبت

کا اظہار ہوتا ہے، اسلام کا تصور وحدت الوجود جو لطیف کو مرغوب رہا ہے، کثیر الخدائی تصور کے مقابلے میں ایک ترقی پسند نظریہ ہے جو ایک ایسے اعلیٰ اور بلند آدرش سے عبارت ہے جس سے پیدا ہونے والی سچائی، حسن اور نغمگی نے شاہ کی شاعری کو لازوال بنا دیا ہے۔ یعنی ایک خدا کے ماننے والے سب انسانوں کے درمیان برابری اور مساوات کا تصور ایک ایسے معاشرے کی بشارت دیتا ہے جس میں کوئی ناہمواری نہ ہو، نہ کوئی بالاتر ہو اور نہ کوئی کم تر ہو۔ سب کے ساتھ یکساں معاشی و معاشرتی انصاف برتا جائے، کسی خاص فکر، مذہب، فلسفے اور طبقے کو کسی دوسرے فلسفے، مذہب، فکر اور طبقے پر اجارہ داری حاصل نہ ہو۔ ایسے اعلیٰ معاشرتی اقدار اور اصولوں کی طرف داری نہ کرنا بجائے خود تنگ نظری کی علامت ہے، جس کی شاہ لطیف کی شاعری میں یقیناً کوئی گنجائش نہیں کہ اس نے اپنی شاعری میں ہر قسم کی عصبیت اور تنگ نظری کی نہ صرف مخالفت کی ہے بلکہ ان عناصر کو جو اس طرح کی عصبیت و تنگ نظری کا پرچار کرتے ہیں، ننگِ انسانیت قرار دیا ہے۔

اسی طرح سچل سرمست بھی ترقی پسند فکر اور رویے کا اہم ترین نمائندہ اور علم بردار شاعر ہے بلکہ سچل سرمست نے کھل کر مذہبی کٹرپن، تنگ نظری اور تعصب کے خلاف اعلانِ جنگ کو عین مذہب قرار دیا ہے اور واشگاف انداز میں ثابت کیا ہے کہ "ملائیت کا اسلام" اور "صوفی کے اسلام" دو جداگانہ اسلوبِ حیات اور فلسفۂ زندگی ہیں کیوں کہ ملاّ کا مذہبی پرچار پیشہ ورانہ عمل کے مترادف ہے جو اسلام کے نام کو حاکمِ وقت کی خدمت گزاری کے لیے استعمال کرتا ہے اور ان ہی کی ضرورت کے مطابق اسلامی احکامات کی تاویل و تشریحات پیش کرتا ہے جن کا اسلام کی اصل روح کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ مولوی نے تاریخ کے ہر دور میں بادشاہوں کے مطابق اور حق میں کتابیں تو تصنیف کی ہیں اور ایسا ادب بھی پیدا کیا ہے جس پر درباداری اور سلطان پرستی کی چھاپ نمایاں رہی ہے۔ ملائیت مذہب کے نام پر معصوم انسانوں کے درمیان نفرتوں کے بیج بوتی اور فرقہ واریت کے زہر گھولتی ہے تا کہ ان کے باہمی نفاق سے حاکمِ وقت کی قوت مستحکم ہوتی رہے اور عام آدمی اپنی فلاح و بہبود کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ اس صورتِ حال کے برعکس صوفی کے اسلام کی بنیاد ہی انسانوں کے درمیان

محبت اور احترام پہ رکھی گئی ہے کہ مذہبی معاملات میں کسی بھی قسم کے جبر و زبردستی کی اسلام میں شدید طور پر نہ صرف مذمت کی گئی ہے بلکہ اسے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ صوفی اسلامی تعلیمات کے مطابق بلا تخصیص مذہب، رنگ اور فرقہ خدا کی مخلوق سے باہمی یگانگت پر اصرار کرتا ہے کہ اسے ہر انسان میں خدا کا عکس نظر آتا ہے، وہ انسان ہی نہیں بلکہ کائنات کے جملہ مظاہر میں خالق کائنات کی جھلک پاتا ہے۔

یہی وہ وسیع القلبی اور غیر مشروط رواداری ہے جو دوسرے مذاہب اور فرقوں سے وابستہ لوگوں تک کو فتح کرتی چلی جاتی ہے۔ ہندوستان میں بالخصوص مسلمانوں کی کامرانی کی اصل وجہ صوفیوں کا عوام دوستانہ رویہ رہا ہے کیوں کہ صوفی کے حلقے میں مسلمان، ہندو، سکھ اپنے اپنے جداگانہ مذہبی عقائد کے باوجود ہمدردی، عزت اور تکریم پاتا تھا، جب کہ ملاّ کے منبر و محراب فساد خلق اور دوسروں کی دل آزاری پیدا کرنے میں مصروف رہتے آئے ہیں۔ (اور اسی لیے اقبال نے کہا: دینِ ملاّ فی سبیل اللہ فساد۔ اور اردو شاعری میں ملاّ، واعظ اور ناصح کے کردار کو منفی روپ میں پیش کیا گیا ہے۔) مخلوط معاشرے میں انتشار اور فساد یا تو حکمرانوں کے جبر و تشدد کا نتیجہ ہوا کرتا ہے یا درباری ملاّؤں، اقتدار پرست ادیبوں اور بے ضمیر عالموں کی وجہ سے فروغ پاتا ہے۔"

ادب و فن کے سیکولر کردار کی وضاحت کرتے ہوئے سوبھو گیان چندانی نے لکھا ہے:

"آج ادب و آرٹ کے سیکولر کردار پر جو اصرار کیا جاتا ہے، اس کی وجہ اس تصور کی عالم گیریت تو ہے ہی لیکن ایک بنیادی وجہ وہ تاریخی جبر و تشدد بھی رہا ہے جو ماضی میں ہندوستان اور یورپ میں مذہب کے نام پر جاری رکھا گیا ہے۔ بے شک اسلام کے بنیادی مقاصد اور کردار کی تکمیل ہونی باقی ہے لیکن جس طرح یورپ نے عیسائیت کے بعض مفید اور وسیع البنیاد معاشرتی اصولوں کے ساتھ سیکولرازم اور ترقی پسند طرز حیات اختیار کیا ہے، اسی طرح اسلام کی مثبت تعلیمات کے ذریعے یہاں بھی ایسے معاشرے کی تعمیر و تشکیل کی طرف پیش قدمی کی جا سکتی ہے جو اسلام کی تعلیمات سے قریب تر ہو۔ یعنی اسلام میں مساوات کا جو تصور ہے اور سماجی فلاح و بہبود کے بارے میں جو نظریے ہیں، وہ سوشلسٹ اصولوں سے بہت مختلف نہیں۔ صحت مند اور ترقی پسند ادب کی ہمیشہ یہ ذمہ داری رہی

ہے کہ انسانی فلاحی معاشرے کے قیام اور وسیع البنیاد انسانی اقدار، مثلاً باہمی خیر سگالی، محبت، خلوص، بھائی چارے کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرے۔ یہی وہ عالم گیر اقدار تھیں جو شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست اور بھائی چیین رائے سامی کی شاعری میں نمایاں ہوئی ہیں اور یہی وہ زندہ روایات ہیں جو عہدِ جدید کے سندھی ادب تک سفر کرتی چلی آئی ہیں۔

سندھی زبان اور ادب میں ترقی پسند رجحانات کی پذیرائی کی بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ سندھی عوام اور معاشرے میں ان رجحانات کے برعکس خیالات و تصورات کو کبھی قبولیت حاصل نہ ہوسکی اور اُس رجعت پسند ادب اور شاعری کے لیے جس میں حاکموں کی ثناخوانی اور درباداری کی جھلک دکھائی دے، عوامی سطح پر بھی نامقبول ٹھہری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اوائلی دور میں بھی سندھ میں عروضی شاعری کو عروج حاصل نہ ہوا تھا اور عوامی فکر کا اظہار بھی عوامی طرز ہی میں ہوا ہے۔ وہ لوگ جو درباروں سے منسلک تھے، انھوں نے بھی اگر عوامی احساسات سے مختلف انداز میں شاعری کی تو ان کی اس نوع کی شاعری کو قبولِ عام حاصل نہیں ہوسکا ہے۔ ہر چند اس دور میں شاعری کو لکھنے لکھانے کا رواج عام نہ تھا۔ اور نہ عوامی شاعروں کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی جن کے ذریعے اس کے تحفظ کی ضمانت دی جاتی، لیکن عوامی قبولیت ایسی تھی کہ لوگ اپنی پسندیدہ ابیات اور شاعری کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیتے اور عوامی کچہریوں، بیٹھکوں اور روزمرہ چلتے پھرتے انھیں نغمہ و آہنگ کے ساتھ گاتے پھرتے تھے اور اسی طرح صدیوں پرانی شاعری بھی سینہ در سینہ سفر کرتی ہوئی ہمارے عہد تک پہنچی ہے اور آج بھی اسی چاہ کے ساتھ گائی جاتی اور اسی انہماک کے ساتھ سنی جاتی ہے۔ چونکہ عروضی شاعری عوامی جذبہ و احساس سے عاری تھی اور اپنی دھرتی، ماحول، معاشرے اور اردگرد سے بے گانگیت کا شکار تھی۔ لیکن اس کے برعکس ترقی پسند تصورات جو شاہ، سچل اور سامی کے عہد سے ہمارے دور تک پھلتے پھولتے چلے جاتے ہیں، آج بھی سندھی ادب کے سب سے زیادہ مضبوط، توانا اور مؤثر رجحانات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

انقلابی ادب، انقلابی اندازِ فکر کے مطابق ہر دور میں زندگی کے حالات، معاشرت اور مسائل کو سمجھتا ہے اور انھیں کے مطابقت سے بہتر اور ترقی پسندانہ

معاشرے کی تکمیل کی طرف پیش قدمی کرتا ہے کہ شاہ عبداللطیف کی شاعری اور ان میں پیش کی ہوئی داستانیں اور کردار ہمارے عہد میں ایک نئی معنویت اور علامت کے ساتھ ابھرتے ہیں اور ہم اپنی جہدِ بقا میں ان سے نئی طاقت، سچائی، دل کشی، جرأت مندی اور حوصلہ پاتے ہیں۔ اور آج بھی لطیف کے ابیات سندھی عوام کی رگوں میں لہو کو گرماتے ہیں اور ہمارے عہد کا ادیب اور شاعر مومل، سسئی اور سورٹھ جیسے کرداروں کے ذریعے جس پیغام کو عوام تک پہنچانا چاہتا ہے، اس میں ایسی تیز دھار اور کاٹ پیدا ہو جاتی ہے جس کا مقابلہ جدید تشبیہات نہیں کرسکتیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ رجعت پسند عناصر ہمارے ترقی پسند ادب پر غصہ اور جھلاہٹ کے ساتھ باغی، مفسد اور کافر ہونے کے گھناؤنے الزام اور فتوے لگاتے رہتے ہیں اور بار بار انھیں قید و بند کی صعوبتوں کا شکار بناتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہماری ادبی تحریک کا دائرہ ہے کہ دن بہ دن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلے جاتا ہے اور آئے دن نئے نئے نوجوان ادیب اور شاعر، نئی نئی فکر، نئے نئے انداز اور تازہ ترین تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور پرانے اور نئے لکھنے والوں کی ایک کہکشاں قائم ہوتی چلی جاتی ہے جنھیں عوامی سطح پر قبولِ عام اور شہرتِ دوام بھی حاصل ہوتی ہے۔ نئے لکھنے والوں کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کے ناموں کی فہرست سازی بھی مشکل امر دکھائی دیتا ہے۔''

سوبھو گیان چندانی، شیخ ایاز کو جدید عہد کا سرخیل بتاتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''قیامِ پاکستان کے بعد شیخ ایاز کی آواز پہلی آواز تھی جس نے سندھی ادب میں قائم ہوتے ہوئے سناٹے کو توڑا تھا، وہ قیامِ پاکستان سے قبل ہی سندھی شاعری اور افسانہ نگاری میں اپنے وجود کا احساس دلا چکا تھا۔ نوجوانی میں شیخ ایاز انقلابی جوش، جذبے اور للکار سے پُر تھا۔ وہ ایک وسیع المطالعہ، حساس اور بے پناہ تخلیقی جدت رکھنے والا نوجوان تھا۔ بلاشبہ اسے سندھی شاعری کے جدید دور کا رہنما ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ہر چند اس کی افتادِ طبع کی وجہ سے اس کے لکھنے لکھانے کے معاملے میں اتار چڑھاؤ آتے رہے ہیں اور ایک زمانہ تھا جب اس نے ادب اور شاعری سے کنارہ کش ہونے کا ارادہ بھی کر لیا تھا، لیکن اس کے تخلیقی بہاؤ کے سامنے اس طرح کے وقتی فیصلوں کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی اور وہ

مسلسل شاعری اور افسانے میں اپنے جوہر دکھاتا چلا گیا ہے۔ اور اپنی تخلیقات کے ذریعے دن بہ دن سندھی عوام کے دلوں میں جگہ بناتا چلے گیا ہے کیوں کہ اس کی شاعری میں سندھ کے لوگوں کے جذبوں اور امنگوں کی ترجمانی کی گئی ہے اور اس میں اپنے معاشرے، ماحول اور حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔

سندھ میں تخلیق ہونے والے ادب میں نہ صرف ہمارے معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے جس سے ہماری قومی امنگوں، جذبوں کی ترجمانی ہوتی اور قومی طرزِ احساس کی تسکین حاصل ہوتی ہے بلکہ ہمارا جدید سندھی ادب عالمی سطح پر قائم ادبی معیار اور ضرورتوں کو بھی پورا کرتا ہے۔ خاص طور پر عہدِ جدید میں لکھی جانے والی شاعری اور شارٹ اسٹوری، بین الاقوامی معیار اور تقاضوں پر پورا اترتی ہے۔ بے شک جدید سندھی ادب کو انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں منتقل کیے جانے کے مواقع کم کم ملے ہیں جن کی وجہ سے ہمارے لکھنے والوں کو عالمی سطح پر وہ تعارف اور اعتراف حاصل نہ ہوسکا ہے جس کے وہ حق دار تھے، لیکن یہ ایک غیر اہم بات ہے کیوں کہ لکھنے والے کی اصل پذیرائی اور مقبولیت اسی زبان میں ہوتی ہے جس میں کہ وہ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے اور وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے، بنیادی طور پر اپنی ہی قوم اور لوگوں کے لیے لکھتا ہے اور اس کے سامنے اپنے ہی لوگوں کے مسائل اور اجتماعی نفسیات ہوتی ہے جس کے زیرِ اثر وہ تخلیقِ ادب کا فریضہ سرانجام دے رہا ہوتا ہے۔''

سوبھو گیان چندانی کے افسانے

ادب میں سوبھو گیان چندانی کی بنیادی دلچسپی افسانہ نگاری سے رہی۔ ہر چند بچپن میں شاعری کا ذوق بھی رہا تھا اور جوانی میں چند انقلابی نظمیں بھی لکھی تھیں لیکن اپنی تحریروں سے طبعی اغماض اور لاپرواہی کی وجہ سے ان کی شاعری آج اپنے آثار و باقیات تک گم کر بیٹھی ہے۔ اس سلسلے میں سوبھو صاحب سے اصرار کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ لگ بھگ پچاس سال قبل ان کی شاعری کا ایک مختصر سا مجموعہ ترتیب تو ضرور دیا گیا تھا لیکن وہ اس زمانے میں خود دوسرے معاملات میں انتہائی مصروف رہے تھے اور دوستوں نے ادھر اُدھر سے ان کی چند نظموں کو یک جا کر کے کسی کے حوالے کر دیا تھا کہ وہ ان کی اشاعت کا بندوبست کرے لیکن ان کی جانب سے دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ شخص مذکور سے پلٹ کر بھی نہ پوچھا کہ بھائی جس کتاب کی اشاعت کا بندوبست آپ کے ذمے تھا، اس کا کیا بنا ہے؟! نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف سوبھو صاحب کی شاعری طباعت کی منزل سے نہ گزر سکی بلکہ اس کا کوئی حوالہ بھی محفوظ نہ رہا۔ یوں سوبھو صاحب کی شعر گوئی کا جوہر بار آور نہ ہو سکا۔

افسانہ نگاری کا معاملہ شعری اظہار سے مختلف رہا کہ ادبیات میں افسانہ نگاری اور فکشن سے انھیں خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ اور مغربی زبانوں میں لکھے گئے فکشن کی شاہکار تخلیقات کے علاوہ بنگالی، مراٹھی، اردو، ہندی اور گجراتی کے بہترین افسانے اور ناول ان کے مطالعے سے گزر چکے تھے۔ افسانہ نگاری کے علاوہ مضمون نگاری کا شعبہ بھی ان کی دلچسپی کا خاص مرکز رہا ہے کہ تاریخ و فلسفہ، سیاسیات و معاشیات اور تہذیب و ثقافت پر ان کے ہمہ گیر مطالعے اور فکری زاویوں کا اظہار مضمون نگاری ہی کے ذریعے ممکن ہو سکا ہے۔ اس باب میں ہم سوبھو صاحب کی افسانہ نگاری کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں۔

سندھ کی کلاسیکل شاعری کے بعد جدید سندھی فکشن اور افسانہ نگاری سے ان کی دلچسپی شروع ہی سے قائم رہی تھی اور وہ سندھی فکشن کی ترقی کے لیے عملاً کوشاں بھی رہے تھے۔ شانتی نکیتن سے واپسی کے بعد جب انھوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا تھا تو اس وقت زندگی کی رفتار خاصی تیز و تند تھی اور سوبھو گیان چندانی پہلے طلبا تحریک میں اور اس کے بعد مختلف سیاسی معرکوں میں مسلسل مصروف پیکار رہے۔ لیکن یہی

وہ زمانہ بھی تھا جب سندھی ادب میں ترقی پسند رجحانات کے فروغ اور ترقی کے لیے فضاسازی کی کوششیں جاری تھیں اور دوسری اصناف سخن کی طرح فکشن کے میدان میں بھی حقیقت نگاری کی روایت کو مستحکم بنایا جارہا تھا۔

سوبھو گیان چندانی کی افسانہ نگاری کا تفصیلی جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جدید سندھی افسانے کے اس پس منظر پر بھی ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں جوان کی افسانہ نگاری سے قبل موجود رہا ہے۔

سندھی زبان میں فکشن نگاری کا ابتدائی دور دراصل دوسری زبانوں کے افسانوی ادب سے اخذ و ماخوذ کا دور رہا ہے جس میں انگریزی، مرہٹی، بنگالی اور اردو زبانوں میں لکھے گئے شاہکار ناول اور قصے کہانیوں کو سندھی زبان میں منتقل کرنے کا کام نہایت منظم اور وسیع پیمانے پر کیا گیا تھا۔ یہ کارروائی محض سیدھے سادے تراجم تک محدود نہ تھی بلکہ عام قارئین کی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے تلخیص اور ایڈپٹیشن (adaptation) کی تکنیک استعمال کی جاتی تھی جس کے تحت قصے اور کہانی کی واقعیت اور ماجرائیت کو تو برقرار رکھا جاتا تھا لیکن کرداروں کے نام، مقام اور ماحول بالعموم تبدیل کر دیئے جاتے تھے۔ یہ صحافت کے آغاز کا دور بھی تھا۔ چنانچہ اخبار و جرائد نے اپنی مقبولیت میں اضافے کے لیے دلچسپ قصے کہانیوں کی قسط وار اشاعت شروع کر رکھی تھی۔ لہٰذا بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں ہی میں کئی درجن ناول اور طویل کہانیاں جن میں جونس ہوم کے ناول (Farrar)، بوکرٹی واشنگٹن کا ناول "Up from slavery"، ڈین سوئفٹ کا ناول "Travel of Glavier"، ڈی فو کا ناول ''رابنسن کروسو'' وغیرہ کے تراجم تو صرف مرزا قلیچ بیگ کر چکے تھے۔ ان کے علاوہ نانک رام، دھرم داس نے فرانسیسی ناول "Count of Monte Cristo dowa" کو ''حسد کی آگ'' کے نام سے اور "From log cabine to white house" کو ''لٹ ثان پٹ'' جس میں جارج واشنگٹن کے سوانحی حالات نہایت دلچسپ پیرائے میں لکھے گئے تھے، سندھی میں منتقل کیے۔ رینالڈس (Reynolds) کے ناول "Star of Mingrelia" کا ترجمہ جلبانی نے ''منگریلے کے ستارے'' کے نام سے کیا۔ رینالڈس کی ایک اور ناول "Young fisherman" کا ترجمہ منگھارام ملکانی نے سرانجام دیا تھا۔ وکٹر ہیوگو کے ناول "Les Mesirable" کا خلاصا ''دکھی انسان'' کے نام سے پروفیسر موتومل گڈوانی نے ترجمہ کیا۔ لیلارام ولایت رائے نے مسز ہینری ووڈ (Mrs Henry Wood) کی ناول ''ایسٹ لینڈ'' اور سر والٹر اسکاٹ کے ناول "The heart of Midlothian" کا خلاصا ''دلبر حبشی'' کے نام سے پیش کیا تھا۔ اسی طرح غلاموں کی زندگی پر محیط مشہور عالم امریکن ناول "The uncle Tom's cabin" کا ترجمہ ''گولن جا گوندر'' کے نام سے بھیرومل مہرچند اڈوانی نے کیا۔ ۱۹۳۰ء میں صاحب سنگھ شاہانی نے تھامس ہارڈی کے ناول "Mayor of Casterbrigde" کا ترجمہ ''بلو کھوکھر'' کے نام سے پیش

کیا، اور تھامس ہارڈی ہی کے ایک اور ناول "Two on a tower" کا ترجمہ صاحب سنگھ شاہانی نے ''ستاروں کی ابھیاس'' کے نام سے کیا تھا۔ اسی طرح ہندی، بنگالی، گجراتی اور اردو سے متعدد شاہکار ناول سندھی میں منتقل ہوئے۔ منشی پریم چند کے ناول ''گئو دان'' کو دولت رام ٹھل رامانی نے سندھی کا جامہ پہنایا۔ ۱۹۴۵ء میں پریم چند کے ایک اور ناول کا ترجمہ ''چندر پال'' کے نام سے میلا رام نے سرانجام دیا تھا۔ غرض یہ فہرست بہت طویل ہے لیکن مذکورہ بالا لکھنے والوں کے علاوہ خوشی رام ہیرانند، محمد صدیق مسافر، میلا رام منگت رائے واسوانی، ہری ہنگورامانی، گوبند مالھی، جگت آڈوانی اور بہت سے دوسرے اہم ادیب تھے جنھوں نے انگریزی، ہندی، اردو، بنگالی اور دوسری زبانوں کے شاہکار ناولوں کو سندھی زبان میں منتقل کر دیا تھا۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک طبع زاد ناول لکھنے کا رجحان بھی جڑ پکڑنے لگا تھا۔ پریم چند، سرت چندر چڑجی اور بنکم چندر چڑجی وغیرہ کے ناولوں کے ذریعے حقیقت نگاری کے ابتدائی نقوش بھی سندھی ناول میں ظاہر ہونے لگے تھے۔

مرزا قلیچ بیگ اپنی ناول ''دلارام'' اور ''زینت'' کے ذریعے حقیقت نگاری کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ انھوں نے دلارام کے دیباچے میں لکھا تھا:

> ''یہ ایک تصوراتی اور خیالی قصہ ہے جسے میں نے اپنے تخیل کے ذریعے مرتب کیا ہے لیکن اس میں کوئی ایسی بات نہیں جس پر حقیقت کا گمان نہ ہو اور جو خلاف فطرت سمجھی جائے۔ اس میں کسی دیو اور پری کا قصہ بیان نہیں ہوا ہے، روزمرہ زندگی کے واقعات ہیں جن سے میرا سابقہ پڑتا ہے اور اچھے برے کاموں کے جو انجام ہوا کرتے ہیں بس وہی اس ناول میں دکھائے گئے ہیں۔''

مرزا قلیچ بیگ نے ''زینت'' کے دیباچے میں مزید لکھا تھا:

> ''قارئینِ کرام کی خدمت میں عرض کرنا ہے کہ آج کل سندھ میں ناولوں کے مطالعے کے ذوق میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے لیکن سندھی زبان میں ایسی اچھی کتابوں کی تعداد بہت کم ہے جو لوگوں کے ذوق کی تسکین کر سکیں، لوگوں کے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے اس سے قبل ایک مختصر ناول ''دلارام'' پیش کیا جس میں زمانے کی گردش اور حال احوال، اصلاحی انداز میں بیان کیا گیا ہے، اگلے زمانے کی طرح اس ناول میں بھی نہ تو جادو وغیرہ کی طلسماتی فضا ہے اور نہ اس میں ایسے واقعات بیان ہوئے ہیں جن کا وقوع پذیر ہونا ناممکن نہ دکھائی دے اور جن سے عام انسان اپنی زندگی میں دوچار ہوتا رہتا ہے۔''

مذکورہ بالا اقتباس سے حقیقت نگاری کے بارے میں مرزا قلیچ بیگ کے جن تصورات کا پتا چلتا ہے وہ

پریم چند کے ابتدائی دنوں کے خیالات سے مختلف نہیں ہیں یعنی صورت حال کا ایسا اظہار جس میں نیکی بدی کے درمیان بپا کش مکش اور اس کے فیصلے ہوتے دکھائی دے سکیں۔ بدی پر نیکی کی فتح ہو، تاکہ لوگوں کو نیکی کرنے کی ترغیب مل سکے۔

تیسری دہائی کے نصف آخر یعنی ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ادب کی تحریک کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا جس کے اثرات ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادب پر پڑ رہے تھے۔ اردو افسانے میں تبدیلی کا اظہار مشہور عالم مجموعے ''انگارے'' سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان تبدیلیوں کے اثرات سندھی افسانہ نگاری پر مرتب ہونے شروع ہو گئے تھے اور موپساں، چیخوف، گورکی، او ہنری، پرل ایس بک، ہیمنگوے، ٹالسٹائی، خلیل جبران، ٹیگور، بنکم چندر چٹرجی، شرت چندر چٹرجی، پریم چند، سدرشن، رتن ناتھ سرشار، نیاز فتح پوری وغیرہ کے نام سندھی ادب میں ترجموں اور Adaptation کے ذریعے اجنبی نہ رہے تھے۔

طویل ناولوں اور ڈراموں کے ساتھ ساتھ مختصر کہانیاں لکھنے کا رواج عام ہونے لگا تھا لیکن ابھی حقیقت نگاری کی روایت مستحکم نہ ہو پائی تھی۔ سوبھو گیان چندانی کے مطابق سماجی حقیقت نگاری کا دور امر لعل ہنگورانی کے رسالے ''پھلواری'' سے شروع ہوتا ہے جو ۱۹۳۰ء میں شائع ہونے لگا تھا۔ لیکن امر لعل ہنگورانی کی دھماکہ خیز کہانی ''ادو عبدالرحمٰن'' ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ ایک سیدھے سادے صوفی منش بوڑھے آدمی کی کہانی ہے جس میں ایک دیہاتی کی سادگی کے ساتھ ساتھ سچائی اور بے خوفی کا جوہر بھی بھرا ہوا ہے، اسے ایک جھوٹے پھندے میں پھنسا دیا جاتا ہے اور وہ سادہ لوحی کے ساتھ اپنے اردگرد جاری دفتری کارروائی کو اس طرح دیکھ رہا ہوتا ہے جیسے کوئی تماشا دیکھتا ہے۔ اس کردار کی زبانی اور اس کے ردِ عمل کے ذریعے امر لعل ہنگورانی نے نام نہاد قانون اور انصاف کے دعوے دار سسٹم پر بہت چبھتا ہوا طنز کیا ہے جس میں ہلکی سی زہر خند (irony) بھی شامل ہے۔ کہانی نہ صرف اپنے زمانے کی شاہکار کہانیوں میں سرِ فہرست ہے بلکہ یونیسکو کے عالمی انتخاب مرتبہ ۱۹۵۳ء میں بھی ہندوستانی زبانوں کی منتخب کہانیوں کے حصے میں شامل ہوئی ہے۔

اس دور کے دوسرے اہم افسانہ نگار مرزا قلیچ بیگ کے فرزند مرزا نادر بیگ تھے جن کی ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء کے دوران ایک درجن سے زائد کہانیاں سندھی رسالوں میں شائع ہوئیں اور بعد میں ان کے افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہوا۔ مرزا نادر بیگ کی کہانیوں میں سماجی حقیقتوں کا اظہار تو ہوا ہے لیکن طنز و مزاح کے انداز نے ان کے تاثر کو کہیں زیادہ گہرا کر دیا ہے۔ سوشل ریلزم کا جو انداز آسانند مامتورا کے افسانوں میں دکھائی دیتا ہے، وہ مرزا نادر بیگ کے ہاں نہیں ہے۔ آسانند مامتورا نے انسانی زندگی کے ان گوشوں اور سماجی زندگی کے ان پہلوؤں کو موضوع بنایا جن پر ان سے قبل اظہارِ خیال نہیں کیا گیا تھا یعنی معاشرتی مسائل میں الجھے ہوئے آدمی کی نفسیاتی کیفیت اور آدمی کی جنسی جبلت کے تاریک گوشے

آسا نند مامتورا کے افسانوں کے موضوعات تھے۔ ان کے جونیئر مگر اہم ہم عصروں ہی میں عثمان علی انصاری کا نام بہت نمایاں ہے۔ عثمان علی انصاری ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''پنج'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں ان کی پانچ کہانیاں شامل تھیں۔ عثمان علی انصاری بہت باشعور کہانی کار تھے۔ چنانچہ ان کی کہانیوں میں معاشرتی صورتِ حال کا زیادہ بہتر اظہار ہوا ہے۔

سندھی افسانہ شروع سے سماجی واخلاقی مسائل کا آئینہ دار رہا ہے اور دوسرے رجحانات کے ساتھ ساتھ سماجی حقیقت نگاری بھی بتدریج افسانہ نگاروں میں مقبولِ عام رویہ بنتی چلی گئی ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ خیالی قصے کہانیوں اور ماورائی داستانوں میں پڑھنے والوں کے لیے ہمیشہ غیر معمولی کشش اور دلچسپی رہی ہے لیکن شعور کی پختگی کے ساتھ پروان چڑھنے والے ذوق، خیالی اور غیر منطقی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا کرتے اور وہ زیرِ مطالعہ تحریروں میں اپنے آس پاس کی دنیا کی پرچھائیاں اور اپنے اردگرد چلتے پھرتے انسانوں کی تصویریں دیکھنا پسند کرتا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہندوستانی معاشرہ زبردست رست وخیز کا شکار رہا ہے۔ تیز رفتار تبدیلی کے عمل نے سندھی معاشرے کو بھی (جو نسبتاً زیادہ قدامت پسند اور سست رفتار رہا تھا) ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اور یہاں کی جمی جمائی زندگی میں بھی اُتھل پتھل کی کیفیت پیدا ہونے لگی تھی۔ پورے ہندوستان میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات بھی پڑ رہے تھے۔ ان بدلتے ہوئے اثرات کو سب سے زیادہ سندھی افسانے نے جذب کیے ہیں۔ اور اب سندھی کہانی میں تھوڑا بہت سیاسی تیکھا پن بھی پیدا ہونے لگا تھا۔ یہ وہ دور تھا جس میں ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد اور برطانوی سامراج کے خلاف قومی تحریکیں عروج پہ تھیں۔ سیاسی ماحول گرم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ترقی پسند ادب کی تحریک نے ہندوستان کی سب زبانوں کے ادب کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور وہ لوگ بھی جو براہِ راست بائیں بازو کے خیالات کے حامل نہ تھے لیکن نسبتاً نئے خیالات کو پروان چڑھتے دیکھنا چاہتے تھے۔

ترقی پسندوں کے حلقۂ اثر میں داخل تھے اس پوری صورتِ حال کا سندھی افسانے اور شاعری پر براہِ راست اثر ہو رہا تھا۔

یہ تھا وہ پس منظر جب سوبھو گیان چندانی ۱۹۴۲ء میں شانتی نکیتن سے فارغ التحصیل ہو کر سندھ لوٹے ہیں اور یہاں کی سیاسی، سماجی اور ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی لینا شروع کیا تھا۔ اس دور پر روشنی ڈالتے ہوئے سوبھو گیان چندانی نے بتایا ہے:

> ''اس زمانے میں شائع ہونے والے رسائل و جرائد اور کتابی سلسلوں نے سندھی افسانے اور فکشن کی ترقی میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا کہ صحافت کے آغاز، ترویج، وسعت اور پھیلاؤ نے دلچسپ کہانیوں کو رسائل و جرائد کی اہم

ترین ضرورت بنا دیا تھا اور ان میں ناول، داستانیں، ڈرامے وغیرہ قسط وار شائع کیے جاتے تھے۔''

ابتدائی دور میں اردو ادب میں بھی یہی صورتِ حال تھی، اور راشد الخیری، پریم چند وغیرہم کی ناول یا طویل قصے اپنے عہد کے معروف پرچوں میں قسط وار شائع ہوتے تھے۔

اس وقت ترقی پسند ادب کے حامیوں کو زیادہ تر یہی فکر تھی کہ سندھی افسانے کو سماجی حقیقت نگاری کی طرف راغب کیا جائے اور افسانے کو خیالی اور تصورات کی دنیا سے نکال کر زمین سے پیوست زندگی سے مانوس کرا دیا جائے۔ افسانہ نگاری میں دلچسپی رکھنے والے بالعموم عالمی ادب میں رواں رجحانات سے کم کم آگاہی رکھتے تھے اور عالمی ادب کے شاہکاروں سے بھی چند ہی لوگ آشنا تھے۔ سوبھو صاحب نے بتایا ہے:

''اس ماحول میں ہم لوگ نئے لکھنے والوں کو عالمی ادب میں جاری تحریکوں اور رویوں سے روشناس کرا رہے تھے اور جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا انھیں عالمی ادب کی شاہکار تخلیقات پڑھنے پر اُکساتے تھے۔

''یہی وہ زمانہ تھا جب گوبند پنجابی نے شکار پور سے ''نئین دنیا'' (نئیں دنیا) کے نام سے کتابی سلسلہ شائع کرنا شروع کیا تھا جس کے تحت ۱۹۴۲ء میں گوبند پنجابی کی کہانیوں کا مجموعہ ''سرد آهون'' (سرد آہوں) کے نام سے شائع ہوا جسے سندھی زبان میں ترقی پسند افسانوں کا پہلا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس سے قبل سماجی حقیقت نگاری کا تصور مبہم اور غیر واضح تھا۔''

کہانیوں کے اس مجموعے میں شامل افسانے میں تلخ سماجی حقائق، معاشی ناہمواریوں، عوام کی غربت اور محنت کش طبقوں اور کسانوں کے ساتھ ہونے والی غیر انسانی زیادتیوں اور ان کے اثرات کو موضوع بنایا گیا تھا اور سرمایہ داروں، زمیں داروں وغیرہ کی جانب سے کیے جانے والے مظالم کی منظرکشی کی گئی تھی۔ ان افسانوں میں سوشل ریلزم کے ساتھ طبقاتی کش مکش اور سیاسی شعور کی جھلک بھی موجود تھی لیکن منگھا رام ملکانی کے مطابق:

''ان کہانیوں کی پیش کش میں انقلاب کے نعرے اور حقیقت نگاری تو بہت کی گئی تھی لیکن فنی چابک دستی کم کم تھی اور زبان اور اسلوب کی پختگی بھی موجود نہ تھی۔''

''سرد آهون'' (سرد آہوں) کی اشاعت کے دو ڈھائی برس بعد ''نئین دنیا'' (نئیں دنیا) پبلی کیشن کی جانب سے گوبند مالھی کی مرتبہ کتاب ''ریگستانی پھول'' شائع ہوئی ہے جس میں نسبتاً تازہ دم اور نوجوان لکھنے والے شامل تھے۔ ان میں گوبند مالھی، بھگوان لعلوانی کی کہانی ''ساڙهي'' (ساڑھی)،

شیخ عبدلستار کی ''رحيمان'' (رحیما)، آنند گولانی کی ''سڳ'' (سگ) (کوہان)، نارائن دیوانی کی ''ڌاڙيل'' (دھاڑیل) (ڈاکو)، رام لعل کی ''جعفر بيلدار'' (جعفر بیل دار) اور سوبھوگیان چندانی کی کہانی ''آکيري جوتني'' (آکھیری جوتنی) (آشیاں برباد) جیسی منتخب کہانیاں شامل تھیں۔

۱۹۴۳ء میں مائی داسانی کی کہانیوں کا مجموعہ ''مائی داسانی کی کہانیوں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اسی زمانے میں خوشی رام داسوانی کے طویل مختصر کہانی ''سچو ڏوهي ڪير'' (سچوڈوہی کیر) (اصل مجرم کون ہے) لکھی جس میں مہاتما گاندھی کی شخصیت کے پس منظر میں تحریکِ آزادی کی جھلک دکھائی گئی تھی۔

آزادی کی تحریک اور سیاسی جدوجہد ہی کے پس منظر میں اتم چندانی کی متعدد کہانیاں جن میں ''شکست''، ''ترقی کی راہ پر''، ''آخر کب تک''، ''جیون کلا'' وغیرہ شائع ہوئی تھیں اور اسی زمانے میں ایشوری جیوتوانی کی کہانی ''اٹھو بھارت کے بہادر سپوتو'' شائع ہوئی۔

۱۹۴۶ء میں ڈی جے کالج کراچی میں پروفیسر رام پنجوانی کی سرکردگی میں ادبی سرکل قائم ہوا تو اس کے زیرِ اہتمام ایک رسالہ ''لهرون'' (لہروں) بھی جاری کیا گیا تھا جس میں نئے اور پرانے افسانہ نگاروں کی متعدد عمدہ کہانیاں شائع ہوئیں، ان میں پروفیسر ڈی کے منشارامانی، ہرومل سدا رنگانی، جشو کیول رامانی، کرشنا کیول رامانی، سوبھوگیان چندانی، مرزا نادر بیگ وغیرہ شامل تھے۔ ۱۹۴۵ء میں جھامنداس بھاٹیہ کی منتخب کہانیوں کا مجموعہ ''شگفتہ کلیاں'' چھپا۔ منگھارام ملکانی کے مطابق یہ اخلاقی کہانیاں اتنی سجل اور پُر تاثر ہیں کہ انگریزی کہانیوں کا ترجمہ لگتی ہیں۔ ۱۹۴۶ء کے آس پاس ڈاکٹر ابراہیم خلیل شیخ کی نفسیاتی کہانیوں کا مجموعہ ''عبرت کدہ''، محمد حسین کروڑ پتی، نجم الدین عباسی اور سائیں داد سونگی کی کہانیاں بھی شائع ہوئی تھیں اور ان کی پیش کش سے سندھی فکشن میں سماجی حقیقت نگاری کے حق میں ایک خاص قسم کی فضا بننے لگی تھی لیکن اصل دھما کا شیخ ایاز کی کہانیوں کے مجموعے ''سفید وحشی'' نے پیدا کیا تھا۔ چونکہ اس مجموعے میں شامل کہانیوں میں آزادی کی تحریک کے حق میں اور برطانوی سامراج کے خلاف عوامی جذبات واحساسات کا اظہار ہوا تھا۔ اس لیے حکومت نے اسے باغیانہ مواد کے ذمرے میں رکھا اور اس مجموعے کو بحقِ سرکار ضبط کرلیا۔ چنانچہ شیخ ایاز کی کہانی کا مجموعہ ''سفید وحشی'' سندھی افسانوں کا پہلا مجموعہ تھا جسے باغیانہ قرار دے کر پابندی لگادی گئی تھی۔

اس منظر نامے میں جو رنگ سب سے زیادہ نمایاں ابھر کر آتا ہے وہ سوشل ریئلزم یعنی سماجی حقیقت نگاری ہی کا رنگ ہے۔ جس کو سندھی افسانہ نگاری میں استحکام بخشنے کے سلسلے میں جن لوگوں نے عملی کاوشیں کی ہیں، ان میں سوبھوگیان چندانی کا نام سرِفہرست دکھائی دیتا ہے۔

افسوس ناک امر یہ ہے کہ سوبھوگیان چندانی اپنی متنوع سیاسی وسماجی سرگرمیوں کی بنا پر ادبی دنیا کو

بہت کم وقت دے سکے ہیں اور تخلیقی سطح پر ان کی کہانیوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے جو کہانیاں آج دستیاب ہیں، ان کی تعداد ڈیڑھ درجن سے زائد نہیں۔ بالعموم خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی پہلی مطبوعہ کہانی ''آکري جوتنئ'' (آکھیری جوتنئ) (اجڑ گیا آشیاں) تھی جو گوبند مالھی کی مرتب کردہ انتھولوجی ''ریگستانی پھول'' میں شامل کی گئی تھی لیکن لیکھو تلسانی ''ڈھائی روپیہ کی کہانی'' کو ان کی پہلی کہانی بتاتے ہیں جو غالباً ۱۹۴۲ء میں لکھی گئی تھی اور کراچی کی ایک ادبی نشست میں پڑھی گئی تھی۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ مذکورہ کہانی اب کہیں دستیاب نہیں ہے۔ سوبھو صاحب نے اپنی یادداشت کی بنیاد پر اس کہانی کا خلاصا سناتے ہوئے بتایا:

''باڈرہ میں ہمارے ایک رشتے کے ماموں تھے جو چھوٹا موٹا کاروبار کرتے تھے، ایک دن میں کراچی جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا کہ وہ ہمارے گاؤں میں وارد ہوئے۔ ان کے پاس موٹر سائیکل تھی، کہنے لگے، کیوں، کہاں جارہے ہو۔'' میں نے کہا، ''جی کراچی جارہا ہوں، باڈرہ سے ریل گاڑی میں سوار ہوں گا۔'' کہنے لگا، ''اچھا چل میری موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ جا۔ میں تجھے باڈرہ چھوڑ دوں گا۔'' میں یہ سن کر بہت خوش ہوا، گھر بیٹھے لفٹ جو مل گئی تھی۔ راستے میں ایک گاؤں پڑا تو کہنے لگا، ''ذرا یہاں ٹھہرنا ہے۔ مجھے کچھ وصولی کرنی ہے، بس دو منٹ لگیں گے۔'' گاؤں میں ایک غریب آدمی کے گھر کے سامنے اپنی سواری روک لی۔ پل بھر میں گھر والے جمع ہو گئے اور ہماری آؤ بھگت شروع کر دی۔ دیکھتے دیکھتے کھانے پینے کی کئی چیزیں سامنے رکھ دی گئیں۔ خوب سیر ہو کر کھایا پیا، ڈکاریں لیں، ایک ڈبے میں دو ڈھائی سیر مکھن، تھیلوں میں اناج اور دوسری اشیا بھی تھیں اور وہ غریب آدمی الگ ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ ہم وہاں سے چلے تو میرا جذبہ اشتیاق جاگ اٹھا۔ میں نے پوچھا، ''ماما یہ کاہے کی وصولی تھی۔'' ماما کہنے لگا، ''بچے یہ سب ڈھائی روپے کا کھیل ہے۔'' میں نے پوچھا، ''ڈھائی روپے کا کھیل؟'' وہ کہنے لگا، ''ہاں بھئی ڈھائی روپے کا کھیل۔'' ماما نے مزید بتایا، بہت مدت ہوئی، کبھی اس آدمی نے ماما کی دکان سے کوئی کپڑا یا شے خریدی تھی جس کی قیمت کی ادائیگی میں ڈھائی روپے قرض ہو گیا تھا، سو آج تک ماما اس ڈھائی روپے کے عوض اس غریب آدمی سے سو روپے سے زیادہ وصولی کر چکا ہے اور کھانا پینا، تحفہ تحائف الگ۔ اور ابھی اصل زر باقی ہے یعنی ڈھائی روپے کا قرض جوں کا توں باقی چلا جاتا ہے کیوں کہ ماما اصل کی وصولی

سے زیادہ سود وصول کرنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ مذکورہ کہانی مہاجنی سماج پر نہایت بلیغ طنز ہے۔"

شانتی نکیتن کے زمانے میں بھی انھوں نے کم از کم تین کہانیاں انگریزی زبان میں لکھی تھیں جو شانتی نکیتن کے کالج میگزین میں شائع ہوئی تھیں جنھیں بلراج ساہنی نے جو اس زمانے میں شانتی نکیتن میں ہندی ادب پڑھاتے تھے اور بعد میں ہندوستانی فلمی دنیا کی ایک نہایت مقتدر شخصیت ثابت ہوئے، بہت سراہا تھا۔ یہ کہانیاں بعد میں سندھی زبان میں بھی لکھی گئیں اور "بھگوڑا"، "انوکھا پیار" اور "خودکشی" کے نام سے شائع ہوئیں۔

اس صورتِ حال سے یہ بات تو معلوم ہو جاتی ہے کہ ایک تخلیقی کہانی کار شروع ہی سے سوبھو گیان چندانی کے اندر بیٹھا ہوا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی و سماجی مصروفیت اور دلچسپیوں میں غیر معمولی اضافہ بھی ہوتا چلا گیا تھا جس نے انھیں دل جمعی کے ساتھ تخلیقی کاموں کی مہلت ہی نہ دی۔ لیکن اس کے باوجود ناقدینِ ادب اس بات کا اعتراف ضرور کرتے ہیں کہ سوبھو گیان چندانی نے ہرچند بہت کم افسانے لکھے ہیں لیکن وہ سندھی ادب میں نہ صرف ایک رجحان ساز فن کار ہیں بلکہ افسانہ نگاری کا ایک مخصوص اسلوب بھی رکھتے ہیں۔ وہ ان چند لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے سندھی افسانہ نگاری میں سوشل ریلزم (سماجی حقیقت نگاری) کی روایت کو مضبوط بنیادیں فراہم کی ہیں۔ ان سے قبل امرلعل ہنگورانی اور آسانند ماموترا وغیرہ کے حوالے سے سندھی افسانے میں حقیقت نگاری کا آغاز ہو چکا تھا لیکن بعد کے دور میں آنے والوں نے جن میں سوبھو صاحب بھی شامل ہیں۔ حقیقت نگاری کے رجحان اور روایت میں نئے زاویے اور گہرائیاں دی ہیں۔ اور کہانی لکھنے کے فن کو محض رسمی قصہ گوئی سے نکال کر ایک معاشرتی سرگرمی کا درجہ دے دیا تھا۔ افسانہ نگاری کو زندگی کی سانس لیتی ہوئی سچائیوں کو مصور کرنے کا فن بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک زمانے میں انھوں نے نئے لکھنے والوں کو آس پاس بکھرے ہوئے سچے کرداروں کی اُفتادِ حیات کو رقم کرنے کی ترغیب بھی دی تھی تاکہ لکھنے والوں میں اردگرد بکھری ہوئی زندگی کا مشاہدہ کرنے اور عصری حسیت سے قریب ترین ربط پیدا کرنے کی صلاحیت کو اجاگر کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے خود انھوں نے اپنے گاؤں کے ایک کردار کی سچی کہانی لکھی تھی جس میں واقعات نگاری حقیقت سے اتنے قریب تر تھی کہ انھیں گاؤں کی سماجی مصلحت کے پیشِ نظر اس کہانی کو اپنے نام سے شائع کرنے کی بجائے اپنے ایک دوست کے نام سے شائع کرانی پڑی تھی لیکن بعد میں بات کھل گئی اور یہ کہانی "**رحیمان**" کے نام سے ان کے مجموعے میں شامل کی گئی۔

سوبھو گیان چندانی کی سندھی کہانیوں کا ایک مجموعہ "**ڪڏهن بهار ايندي**" کے نام سے لگ بھگ پچیس تیس سال قبل شائع ہوا تھا جس میں کُل نو کہانیاں شامل تھیں۔ بعد میں اسلم رجیل مرزا نے

مذکورہ مجموعے میں شامل تمام کہانیوں کو اردو میں منتقل کر کے ''انقلابی کی موت'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ جس میں جدید سندھی افسانے کے ایک نہایت اہم تخلیقی نمائندے اور معروف نقاد جناب ایاز قادری کا لکھا ہوا دیباچہ بھی شاملِ اشاعت ہے۔

ایاز قادری جدید دور کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کا شمار شیخ ایاز، عبدالرزاق راز اور جمال ابڑو کی صف میں ہوتا ہے۔ انھوں نے سندھی افسانے کو متعدد یادگار افسانے دیے ہیں جو موضوع اور اظہار کے اعتبار سے رجحان ساز ثابت ہوئے ہیں، ان کی شہرۂ آفاق کہانی ''بلو دادا'' اپنے عہد کی منتخب اور نمائندہ ترین کہانیوں میں شامل ہے اور جدید سندھی افسانے کے مختصر سے مختصر انتخاب میں مذکورہ کہانی کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ ایاز قادری تخلیقی سطح پہ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ بلند پایہ شاعر بھی تھے اور عالمی ادب میں جاری جدید ترین رجحانات اور اسالیب سے بھی براہِ راست واقفیت رکھتے تھے۔ لہٰذا ایک نقاد کی حیثیت سے بھی ان کی رائے اپنا قابلِ اعتبار بھرم رکھتی ہے۔ ایاز قادری نے سوبھو گیان چندانی کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''سوبھو کا تعلق ترقی پسند ادبی تنظیموں اور تحریکوں سے شروع دن ہی سے رہا ہے۔ اپنے طالب علمی کے دور میں وہ ڈی جے سندھ کالج کے ادبی سرکل کا ایک سرگرم کارکن رہا ہے، جب کہ اس وقت ادبی سرکل کا صدر پروفیسر رام پنجوانی اور شیخ عبدالرزاق راز سیکریٹری تھا اور قیامِ پاکستان سے قبل جب کراچی میں ترقی پسند ادبی انجمن نے اپنی سرگرمی کا آغاز کیا تھا تو اپنے دوسرے ترقی پسند ساتھیوں گوبند مالھی، کیرت بابانی اور گوبند پنجابی کے ساتھ سوبھو گیان چندانی بھی بڑے انہماک اور دلچسپی کے ساتھ ان سرگرمیوں میں شریک تھا۔ اس انجمن نے ۱۹۴۴ء میں ''ریگستانی پھول'' کے نام سے ترقی پسند افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا تھا جس میں سوبھو کی دو مشہور کہانیاں ''**ڪڏهن بهار ايندي**'' (کڈھن بھار ایندی) ''اجڑ گیا آشیانہ'' اور ''رحیماں'' بھی شامل کی گئی تھیں جنھیں سندھی ادب میں آج بھی ابتدائی دور کی ترقی پسند کہانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔''

ڈاکٹر ایاز قادری نے سوبھو گیان چندانی کی افسانہ نگاری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مزید لکھا ہے:

> ''سوبھو اُن روایتی قسم کے افسانہ نگاروں میں سے نہیں ہیں جو اپنی ساری توجہ افسانہ برائے افسانہ لکھنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ چونکہ اس کا دنیا بھر کے مقصدی ادب پر بڑا وسیع مطالعہ ہے، اس لیے وہ اپنے گرد و پیش اور خصوصاً سندھ کے ابتر حالات اور مختلف مسائل سے دوچار ہو کر متاثر ہوتا رہتا ہے اور وقتاً

فوقتاً جب بھی کوئی خاص واقعہ یا حادثہ اس کے دل کو چوٹ لگاتا ہے تو وہ مجبور ہو کر اس واقعے کو ایک کہانی کا روپ دے دیتا ہے اور اس کی یہ تمام کہانیاں گزشتہ پچاس سال کے طویل دور کی عہد بہ عہد نظریاتی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس کی تین چار کہانیاں ''بھگوڑا''، ''آوارہ گرد''، ''انوکھا پیار'' اور ''خودکشی'' ابتدا میں شانتی نکیتن یونی ورسٹی میں دورانِ تعلیم انگریزی زبان میں لکھی کی گئی تھیں اور اب ایک طویل عرصے بعد سندھی میں شائع کی گئی ہیں۔''

ایاز قادری مزید لکھتے ہیں:

''۱۹۵۵ء میں سوبھو کی سندھی ادبی سنگت سے بھی بڑی گہری وابستگی رہی ہے۔ میں جب کراچی میں سندھی ادبی سنگت کا سیکریٹری تھا تو سنگت کے ہفتہ وار ادبی اجلاس میں، جو میرے فلیٹ واقع دھن رام بلڈنگ آرام باغ روڈ پر ہوا کرتے تھے، سوبھو اجلاسوں میں بھی باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے اور تنقید کے لیے پیش کی جانے والی کہانیوں اور نظموں پر بڑے نپے تلے انداز میں تنقیدی بحث میں بھرپور حصہ لیا کرتے تھے اور سنگت میں شریک ادیب اسے بہت عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اس کی رائے سے استفادہ کرتے تھے۔ سنگت کے انھیں اجتماعات سے متاثر ہو کر اس نے مشہور کہانی ''ڪڏهن بهار ايندي؟'' (بہار کب آئے گی؟) لکھی تھی جو سندھی ادبی سنگت کراچی کے ایک اجلاس میں پڑھی گئی تھی۔ اس کہانی میں گھریلو ''عورت'' کے مسائل پر بڑی سیر حاصل بحث کی گئی تھی اور اسے پسند کیا گیا تھا۔''

ایاز قادری سوبھو گیان چندانی کی کہانیوں کے کرداروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سوبھو کی ان کہانیوں کے اکثر کردار ہمارے آج کے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں جن کے ذریعے اس نے اپنے ترقی پسند نظریوں اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔''

اور ''بھگوڑے، آوارہ گرد'' اس کا ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں سوبھو نے اپنے کردار رمضان کی زبان میں بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

''نہ جانے مانگ کر کھانے اور دوسروں کی کمائی سے پیٹ بھرنے والے ان لوگوں کے پیشے سے مجھے نفرت کس طرح پیدا ہوگئی اور ان کے ساتھ رہ کر ان کی مدد کرنے سے مجھے کراہت کیوں آنے لگی۔''

سوبھوگیان چندانی کے افسانوں کا اصل موضوع اردگرد پھیلی ہوئی زندگی اور اس کے متعلقات ہیں۔ وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور واقعات کے گرد کہانی بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات کئی ایسے غیر اہم پہلو جن کی طرف بالعموم کسی کی توجہ نہیں جاتی یا جن پر آدمی کم کم نگاہ ڈالتا ہے، سوبھوگیان چندانی کے مشاہدے سے محفوظ نہیں رہ پاتے ہیں۔

چنانچہ ان کی کہانی کڏهن بهار ايندي'' (کڈھن بھار ایندی) روزمرہ زندگی میں ایک گھریلو عورت کی بہت معمولی سی خواہش سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک ہلکی پھلکی کہانی ہے جس میں ہمارے معاشرے میں گھریلو عورتوں کی زبوں حالی کی تصویر پیش کی گئی ہے:

''یہ ایک ایسے دانشور ادیب کی کہانی ہے جس کی زندگی کا بیشتر حصہ دانشورانہ سرگرمیوں میں بسر ہوتا ہے جو اپنے بیوی بچوں سے وابستگی اور محبت کے باوجود ان کی معمولی سی خواہش کے مطابق ایک عام سی تفریح کرا سکنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا اور اپنی نام نہاد دانش وارانہ مصروفیت یعنی لکھنے پڑھنے اور ادبی جلسوں میں بحث مباحثوں کی لت میں ایسا گرفتار ہوتا ہے کہ اسے اپنے بیوی بچوں سے کیے ہوئے وعدے بھی یاد نہیں رہ پاتے۔ یہاں کہانی کا ہیرو ایک ایسا نوجوان ادیب ہے جسے اس بات کا مزید احساس ہے کہ ایک پڑھے لکھے فرد کی حیثیت سے اسے اپنی علمی وادبی مصروفیت کے ساتھ ساتھ بیوی بچوں پر بھی توجہ دینی چاہیے اور ان کی بھی دل جوئی کرنی چاہیے اور وہ ایسا کرنے کا ارادہ بھی کر لیتا ہے۔ لیکن ادبی محفلوں، بحث مباحثوں اور روزمرہ سرگرمیوں کے نشے میں اہلِ خانہ کو مسلسل نظر انداز کرتا چلا جاتا ہے۔ افسانے کا ابتدائیہ دیکھیے جو میاں بیوی کے مکالمے پر مشتمل ہے—''

''سنو ذرا!''— ''ہاں ہاں کہو۔'' میں کہنا چاہتی ہوں کہ— ''کہو نہ۔ تمھیں کچھ کہنے سے بھلا روکتا کون ہے۔''—

''آج تم مجھے کوئی فلم دکھانے کے لیے سینما لے چلو—''

''بس صرف یہ بات ہے۔ اچھا ضرور چلیں گے سینما۔ بس میں ایک گھنٹے کے لیے آج ایک میٹنگ میں جا رہا ہوں، تم شام کو تیار رہنا تاکہ فلم کا پہلا شو دیکھ سکیں۔''

''تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم نہیں لے چلو گے۔ میں یہ بہانے خوب سمجھتی ہوں۔ آدھی رات کو واپس آؤ گے اور کہو گے کہ بھئی بھول گیا تھا۔ یہ دوست آخر تم کو چھوڑ کیسے دیتے ہیں کہ تم رات کو گھر واپس آ جاتے ہو؟'' اور وہ روہانسی ہو کے

منھ بسورتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چل دی۔ اتنے میں گگو باہر سے دوڑتا ہوا آیا اور مجھے کپڑے تبدیل کرتے دیکھ کر بولا، ''میں بھی چلوں گا، مجھے بھی کپڑے پہنادو۔ میں بھی بابا کے ساتھ گھومنے جاؤں گا۔''

''بیٹے تم کپڑے پہن کر تیار ہو جاؤ، اپنی ماں کے ساتھ۔ ہم سب آج سنیما دیکھنے جائیں گے۔ میں بس ذرا تانگا لے کر آتا ہوں۔''

غرض کہانی کا ہیرو حسب پروگرام ادبی نشست میں شریک ہونے چلے جاتا ہے اور اس بات کا مصمم ارادہ کرلیتا ہے کہ وہ محفل سے بس ایک گھنٹے میں ضرور اٹھ جائے گا اور آج بیوی بچے کو ضرور تفریح کرانے لے جائے گا۔ آخر ان کا بھی کوئی حق ہے کہ نہیں ؟! لیکن وہاں بحث مباحثے کا ایسا چکر چلتا ہے کہ اسے کچھ یاد ہی نہیں رہتا کہ گھر پر بیوی بچے اس کے انتظار میں سوکھ رہے ہوں گے۔ مرد اپنی حرکت پر شرمندہ ہے لیکن یہ شرمندگی تو اب اس کی سرشت بنتی جارہی ہے۔ عورت بے چاری مرد کو شرمندہ دیکھ کر ایک مرتبہ اور معاف کردیتی ہے کہ آخر کمپرومائز تو اسے ہی کرنا ہوتا ہے! نام نہاد انٹلیکچوئل فضا اور ماحول کے کھوکھلے پن کو نمایاں کرتے ہوئے انھوں نے لکھا، ''گھر سے رخصت ہو کر عباس کی بیٹھک میں پہنچا تو وہاں ادبی محفل پہلے سے جمی ہوئی تھی اور حلیم زور شور سے کہہ رہا تھا، میں یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ اس تحریر میں کوئی صحت مند خیال پیش کیا گیا ہے۔ دراصل اسے افسانہ کہنا ہی غلط ہے کیوں کہ فنی لحاظ سے بھی اس میں بہت سی خامیاں واضح طور پر موجود ہیں۔ غرض یہ کہ تحریر ہر لحاظ سے مصنف کی ایک ناکام کوشش ہے۔''

غرض مذکورہ کہانی میں سوبھو نے ادبی نشستوں اور نام نہاد انٹیلکچوئل طرز حیات کے کھوکھلے پن کو بہت مؤثر انداز میں واضح کیا ہے:

محفل میں موجود ہر شخص بحث میں حصہ لیتا ہے اور بغیر سوچے سمجھے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ کسی کو پیش کردہ تحریر خوب صورت فن پارہ لگتی ہے اور کسی کو بے معنی بکواس۔

آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں:

''اس طرح اس بحث کے دوران کوک شاستر سے لے کر انسان کی اس دنیا میں پیدائش کے مقصد تک ایک طویل داستان چھڑ گئی مگر افسانے کے حوالے سے بحث کے اصل موضوع پر غور و فکر کرنے کے مسئلے کو سب گول کر گئے۔ اور ثابت

ہوا کہ ہمارے اس دنیاوی بہشت سے صرف حوا یعنی عورت ہی خارج ہے جب کہ آدم اور آدم کے بیٹے تو یہاں گندم بھی آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔''

آگے چل کر چند فقرے مزید دیکھیے:

''آخر میں اس محفل کے صدر رحیم نے ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا،''ہم اپنے اصل موضوع سے دور ہٹتے جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہر انسان اپنا عمل اپنے حالات وحقائق کے مطابق کرتا ہے اور اصول صرف ان حقیقتوں کو سمجھنے سمجھانے اور ان پر روشنی ڈالنے کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ہم میں سے ایسا کون سا شخص ہے جو بے شمار نیک تمنائیں اور خواہش اپنے دل میں نہ رکھتے ہوئے انھیں عملی جامہ بھی پہناتا ہے؟ ایک اچھے انسان کو برائیوں سے صرف خوف زدہ ہو کر ہی نہیں رہ جانا چاہیے بلکہ جس بات کو وہ اپنے ضمیر کے مطابق درست سمجھتا اور جانتا ہے، اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں ہم سب کسی نہ کسی حد تک عورتوں کی آزادی اور خود مختاری کے قائل ہیں مگر ہم میں سے بہت کم ایسے لوگ ہیں جو ان خیالات ونظریات پر عمل بھی کرتے ہیں۔ آپ خود ہی ذرا غور فرمائیے کہ آپ میں سے کون سا ایسا شخص ہے جو عورتوں کو آزادی اور خود مختیاری کا برملا اعلان کرنے کے باوجود اپنی بیوی بچوں یا بیٹی یا بہن کو کہیں گھومنے پھرنے کے لیے بھی اپنے ساتھ لے کر جاتا ہو اور کون سا ایسا مرد ہے جو اپنی بیوی، بیٹی یا کسی اور نوجوان عزیزہ کو اپنے شریف سے شریف دوست سے بھی میل جول کی اجازت دیتا ہے؟! میری رائے تو اس معاملے میں یہی ہے کہ عورت کی آزادی وخود مختاری کی طرف پہلا قدم اس پر اعتماد کرنا ہے۔ اور جب تک اس پر اعتبار نہ کیا جائے گا، وہ کسی نہ کسی حد تک مرد اور معاشرے کی غلام ہی رہے گی۔ تاہم اگر وہ معاشرے کے ان بندھنوں سے آزاد ہو جائے تو پھر اسے ایک آزاد پرندے کی طرح کھلی فضاؤں میں اڑنے کا بنیادی حق بھی حاصل ہوگا۔'' رحیم نے اپنی بات ختم کر کے محفل برخاست کر دی۔ اس کے بعد حاضرین اجلاس کے لیے چائے آگئی۔ چائے کی چسکیوں کے دوران بھی یہ بحث جاری رہی۔ آخر کار مرید عباس کی بیٹھک سے نکل کر دوستوں کی یہ ٹولی ایک قریب ہوٹل میں آبیٹھی۔ آخر آدھی رات کے وقت جب ہوٹل کے ملازموں نے ہوٹل کے دروازے بند کرنا شروع کر دیئے تو یہ ٹولی منتشر

ہوکر گھروں کی طرف روانہ ہوئی — میں بھی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹایا، جلد ہی دروازہ تو کھل گیا مگر بیوی کے پھولے ہوئے منھ کو دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے کہہ رہی ہو کہ تمھیں گھربار کی کیا پروا ہے۔ تمھارے دوست تمھارا پیچھا کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟''

سوبھو گیان چندانی کی کہانی ''آشیاں برباد'' جو گوبند پنجابی کے مرتب کردہ مجموعے ''ریگستانی پھول'' میں شامل کیا گیا تھا۔

''سندھ کے دیہی معاشرے میں دھواں دیتے ہوئے خوف وہراس کی ایسی سچی اور فطری عکاسی کرتا ہے کہ نصف صدی سے زیادہ مدت گزر جانے کے باوجود آج بھی اتنی ہی تازہ اور موثر محسوس ہوتی ہے جتنی کہ چالیس کی دہائی میں تھی کیوں کہ گزشتہ پچاس برسوں کے بعد بھی سندھ کا دیہی معاشرے اس طرح لٹیروں، ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کے شکنجے میں پھنسا ہوا ہانپ رہا ہے اور کوئی سماجی وانتظامی ادارہ اس کو خوف ودہشت کی فضا سے نجات دلانے کی فکر نہیں کرتا۔ آج بھی سندھ کے ''مراد واہن'' جیسے مخلوط آبادی والے گاؤں اور وہاں کے رہنے والے اتنے ہی لاچار اور بے بس ہیں جتنا کہ نصف صدی قبل تھے۔ ڈاکوؤں کی پھیلائی ہوئی دہشت تو الگ ہے، اصل دہشت تو ان افواہوں کا نتیجہ تھی جس میں بتایا جاتا تھا کہ ڈاکو لوگ مسلمانوں کی بجائے صرف کھاتے پیتے ہندوؤں کو لوٹتے ہیں اور کبھی کبھار انھیں جان سے مار دیتے ہیں اور ان کی عورتوں کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ گویا ڈاکازنی میں بھی مذہبی عصبیت کا زہر گھولا جاتا تھا جیسے ڈاکو کا بھی کوئی مخصوص مذہب اور قومیت ہوتی ہو۔ اس قسم کی افواہوں میں دراصل سماجی مفاد پرستوں کی سازش شامل ہوا کرتی تھی جن کی نظریں کمزور اور بے ہمت ہندوؤں کی جائیداد پر لگی ہوتی تھیں کہ ادھر ہندو گاؤں چھوڑ کر جائیں، اُدھر وہ موالی ان کی جائیدادوں پر قبضہ کر بیٹھیں۔ خوف و دہشت کی اس فضا میں گاؤں کے ہندو صدیوں سے آباد گھروں کو چھوڑ کر نسبتاً زیادہ محفوظ جگہوں کا رخ کرتے ہیں۔ اس کٹھور زمانے میں بھی چند مسلمان گھرانے تو ایسے تھے جو اپنے ہندو بھائیوں کے گاؤں چھوڑ جانے پر آزردہ تھے اور ان کی آنکھیں نسلوں سے ساتھ رہنے والے ہم سایوں کی جدائی کے خیال سے نم آلود ہو رہی تھیں۔ گاؤں چھوڑنے والے یہ لوگ ہر چند ان کے ہم

مذہب تو نہ تھے لیکن دکھ درد میں ساجھی دار اور شریک ضرور رہے تھے۔''

''آشیاں برباد'' چالیس کی دہائی میں ہندو مسلم اتحاد اور بھائی چارے کی تقسیم پر لکھی ہوئی ایک مؤثر کہانی تھی بلکہ اس میں سندھ کے معاشرے کی زبوں حالی اور بے بسی کی تصویر کشی بھی کی گئی تھی اور وہ تمام سماجی کردار جو دیہی معاشرے میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں، (مثلاً وڈیرہ اور سرکاری حکام وغیرہ) انھیں بے حس اور خود غرض ہوتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک تاثراتی کہانی ہے جس میں کرداروں کی بجائے واقعاتی تاثر سے کہانی کے خدوخال ابھارے گئے ہیں۔ ایک تاثراتی تصویر ملاحظہ فرمائیے:

''ان دنوں کوئی دن ہی ایسا خالی جاتا تھا کہ جب کسی نہ کسی جگہ ڈاکوؤں کی قتل و غارت گری یا لوٹ مار کی خبر اخباروں میں نہ چھپتی ہوگی۔ ہمارے گاؤں میں صرف ایک ہی اخبار آتا تھا اور جب یہ اخبار یہاں پہنچتا تو گاؤں کے ہر چھوٹے بڑے میں اسے حاصل کرنے کے لیے چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی تھی۔ آخر ایک معمولی پڑھا ہوا دیہاتی اسے ہاتھ میں تھام کر بلند آواز سے پہلے ڈاکوؤں کا حال پڑھ کر سناتا اور پھر جنگ کے حالات پڑھتا، جنھیں سن کر نوجوان آپس میں تبصرہ کرتے ہوئے الٹی سیدھی بحث میں الجھ کر رہ جاتے جب کہ بزرگ قتل و غارت گری کے یہ واقعات سن کر ''خدایا، تو ہی لاج رکھنا ہماری'' کہتے ہوئے محفل سے اٹھ کھڑے ہوتے اور پھر گاؤں میں سارا دن اسی بارے میں باتیں ہوتی رہتیں۔ مگر یہ دیہاتی اس معاملے میں بحث کر کے خود کچھ کرنے کے قابل نہ تھے۔ وہ ہر کام خدا پر چھوڑ دینے کے عادی تھے—''

خوف کے اس پس منظر میں قریبی گاؤں ''مراد وا ہن'' جو ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا، ڈاکے کی افواہ چل پڑتی ہے جس سے آس پاس کے چھوٹے موٹے گاؤں اور دیہاتوں میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ خاص طور پر کھجر پور گاؤں جہاں مال دار ہندو رہتے تھے، خوف و ہراس پھیل جاتا ہے کہ افواہوں کے مطابق ''مراد وا ہن'' گاؤں میں آنے والے ڈاکوؤں نے پہلے کھجر پور گاؤں ہی کا پتا دریافت کیا تھا۔ غرض گاؤں کی پنچائیت فیصلہ کرتی ہے کہ وہ مل جل کر ڈاکوؤں کا مقابلہ کریں گے اور باپ دادا کا گاؤں چھوڑ کر ہر گز نہ جائیں گے— پنچائیت میں ہونے والی پُر جوش تقریر سنیے:

''ہمیں اپنے گاؤں کا اکھ توڑ کر شہر نہیں جانا چاہیے۔ اس گاؤں میں ہمارے گھر بار ہیں، عزیز و اقارب ہیں، کھیت کھلیان ہیں اور کھانے کے لیے ہر قسم کی سبزیاں ترکاریاں ہیں، مگر شہروں میں ہمیں گز بھر زمین بھی رہنے کے لیے نہیں ملے گی۔ وہاں بھاری کرائے پر تنگ و تاریک کمرے ملیں گے جن میں ہوا ہوگی

نہ سورج کی روشنی— یہاں ہمیں انسانوں کی طرح دکھ درد میں شریک ہوکر رہنے کا سکھ حاصل ہے۔''

''لوگوں کو کچھ وقت کے لیے تسلی ہو جاتی ہے۔ چندہ بھی جمع ہو جاتا ہے اور کچھ لوگ کلکٹر سے مل کر گاؤں کی مدافعت کے لیے اسلحہ کے لائسنس بھی مانگتے ہیں۔ حکومت کے کارندے ہر طرح تعاون کا وعدہ کرتے ہیں اور ڈاکوؤں کو جلد از جلد گرفتار کر لینے کی آس دلاتے ہیں لیکن ہوتا کچھ بھی نہیں۔ ڈاکوؤں کی افواہیں کچھ وقت کے لیے دب جاتی ہیں لیکن پھر خوف آہستہ آہستہ ہندوؤں کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیتا ہے۔ گاؤں کے مسلمان اس میں اپنی ہتک محسوس کرتے ہیں اور ہندو بھائیوں کو دلاسا دیتے ہیں کہ اگر ڈاکو گاؤں پر حملہ آور ہوں گے تو سب سے پہلے وہ ان کا مقابلہ کریں گے اور انھیں گاؤں میں کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن خوف کے بطن سے شک وشبہے کے اژدہے پھنکارتے ہیں اور ہندوؤں ہی میں کوئی کہہ اٹھتا ہے کہ اگر مسلمان ڈاکو حملہ کریں گے تو گاؤں کے مسلمان انھیں کے ساتھ مل کر ہندو پڑوسیوں کو لوٹنے میں شریک ہو جائیں گے۔ اور نسلوں سے آباد مشترکہ آبادی والا گاؤں کھجر پور ہندوؤں سے خالی ہو جاتا ہے کہ وہ بہت صبح سویرے بیل گاڑیوں کے قافلے میں گاؤں چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کہانی میں سوبھو صاحب نے افواہوں، خوف اور دہشت سے پیدا ہونے والی نفسیات کا بہت فن کارانہ انداز میں اظہار کیا ہے۔ عصبیت اور باہمی فرقہ وارانہ نفرت، عدم اعتمادی سے پیدا ہوتی ہے۔ جو معاشرے باہمی اعتماد سے محروم ہو جاتے ہیں، ان کا مقدر اسی طرح اجڑنا لکھا ہوتا ہے۔''

یہاں ہم سوبھو صاحب کی کہانی ''رحیماں'' کا ذکر بھی کرنا چاہیں گے:

''اس کا موضوع بھی ''عورت'' کی لاچارگی اور بے کسی ہے۔ خاص طور پر سندھ کے بند معاشرے میں جہاں عورت کی حیثیت محض ایک جائیداد اور پالتو جانور سے بھی بدتر ہے، خاص طور پر عورت کی جانب سے جنس کی فطری خواہش اور جنسی جذبے کی تسکین کا تصور ایک ایسا شجرِ ممنوعہ ہے جس کی بابت وہ عالمِ خیال میں بھی سوچ نہیں سکتی لیکن فطرت تو ہزار پابندیوں کے باوجود اپنا اظہار چاہتی ہے۔ چنانچہ ''رحیماں'' جو گاؤں کے وڈیرے بہرام خاں کی بیٹی ہے، جو نہ صرف

خوب صورت اور نوجوان ہے بلکہ حسن اور جوانی کے امڈتے ہوئے احساس کی حامل بھی ہے۔"

اس کہانی کی ابتدا سے چند سطریں دیکھیے:

"رحیماں اپنی اس عمر میں کھل کر گلاب کا نوشگفتہ پھول بن گئی تھی۔ اس کے سرخی مائل تمتماتے ہوئے چہرے پر خون جھلیاں مارتا ہوا نظر آتا اور بھرا بھرا مضبوط جسم، تندرستی اور جوانی کی امنگوں کا اظہار کرتا تھا۔ وڈیرے کی اکلوتی بیٹی کو گھر میں نہ تو دودھ مکھن کی کمی تھی۔ اور نہ گھر کے چھوٹے موٹے مشاغل کے سوا کوئی محنت طلب کام ہی کرنے تھے۔ بس یہی دو وقت روٹی پکاتی، دودھ دہی سنبھال کر رکھ لیا، باقی سارا وقت وہ حسن اور جوانی کے خمار آلود خیالات و جذبات میں غلطاں رہتی تھی۔ اسے اپنے حسن و جوانی کے جوبن پر سوچ بچار کے لیے کافی وقت مل جاتا تھا۔ اس کے انگ انگ سے جوانی کا حسن اور شباب کا جوبن پھٹا پڑتا تھا۔ اور اس کی خوب صورتی کا چرچا تھر کے دور دراز علاقے تک میں پھیلا ہوا تھا۔ مگر اس کا باپ وڈیرہ بہرام خاں اسے کبھی گھر سے باہر قدم بھی رکھنے نہ دیتا تھا کیوں کہ نوجوان اور ہٹے کٹے کارندوں کی حریص نگاہیں اس سے ڈھکی چھپی نہ تھیں۔"

ان پابندیوں کے باوجود آخر "رحیماں" اپنے پڑوسی "ایوب کمھار" کے ساتھ جنسی تجربے سے دوچار ہوتی ہے اور نتیجے میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو ایک پابند معاشرے کا رواج ہے، یعنی رحیماں خاموشی سے ایک حرامی بچے کو جنم دیتی ہے جسے وڈیرے کے آدمی راتوں رات گھر کے آنگن میں گڑھا کھود کر دفنا دیتے ہیں۔ رحیماں پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے اور اس کی سوتیلی ماں اس کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے۔ ایوب کمھار کو وڈیرہ کئی جھوٹے مقدمات میں پھانس کر جیل کی ہوا کھلا دیتا ہے۔ ایوب کمھار کی بیوی بھی تنہائی کا شکار ہوتی ہے اور اپنے عاشق مہانے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ اور یہی راستہ آخر رحیماں بھی اختیار کرتی ہے اور بالآخر بازارِ حسن میں اپنی جوانی کی دکان سجا کر بیٹھ جاتی ہے۔"

یہ کہانی بھی کم و بیش ساٹھ باسٹھ برس قبل لکھی گئی تھی جس میں سندھ کی معاشرتی قدروں کی فرسودگی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اور آج جب ہم اپنے اردگرد کی صورت حال سے موازنہ کرتے ہیں تو واقعاتی اور احساساتی سطح پر ہمیں گزشتہ چھ سات دہائیوں کے دوران معاشرتی قدروں میں مزید انحطاط کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ سوبھو صاحب نے رحیماں میں ایک نہایت نازک اور حساس موضوع کو انتہائی چابک

دستی اور مہارت کے ساتھ رقم کیا ہے۔

اسی طرح ''بھگوڑے آوارہ گرد'' میں:

''سوبھوگیان چندانی نے ایک کم سن لڑکے (رمضان) کی داستان بیان کی ہے جسے پڑھنے لکھنے سے بظاہر کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ اس کا من آس پاس کی چیزوں میں زیادہ لگتا ہے۔ وہ ایک خوش حال کھاتے پیتے گھر کا بچہ ہے جس کے دو بھائی اور ہیں۔ یک بڑا اور ایک چھوٹا۔ ماں تینوں بھائیوں کو تیار کر کے روز اسکول بھیج دیتی ہے لیکن اس کا جی پڑھائی میں نہیں لگتا۔ چنانچہ اسکول میں روز اس پر سختی ہوتی ہے اور اسے روز نت نئی اہانت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چانچہ وہ گھر سے بھاگ جاتا ہے کہ بے فکری اور آزاد زندگی اس کا سب سے بڑا خواب تھا۔ بے روک ٹوک زندگی گزارنا، اپنی مرضی کے کام کرنا اور اپنی مرضی کے مطابق جینا۔''

رمضان کی روئیداد اس کے اپنے الفاظ میں سنیے:

''ایک دن دوپہر کے وقت میں چوری چھپے اپنے گاؤں کے کھیتوں کھیتوں نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ دو تین میل تک لگاتار بھاگنے کے بعد تھک گیا۔ آج صبح سے روٹی بھی نہ کھائی تھی مگر چلتے وقت میں نے اپنی جیب میں تھوڑے سے سفید چنے ڈال لیے تھے۔ اس لیے یہ چنے کھا کر اور کھیتوں میں جانے والی کھال سے پانی پی کر میں ایک درخت کے نیچے لیٹ کر سو گیا۔ بڑی دیر بعد جب میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ شام ہوگئی ہے او سورج مغرب میں غروب ہونے والا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ شام کے بعد مجھے گھر والوں کا پیچھا کرنے کا خطرہ تھا اس لیے میں بڑی ہوشیاری سے تیز تیز چلنے لگا اور آخر رات گئے اس گاؤں میں جا پہنچا جہاں خانہ بدوشوں کے قبیلے نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ پھر میں بڑے اعتماد سے سیدھا چلتا ہوا ان کے خیمے کے پاس اس طرح جا کھڑا ہوا گویا کہ وہ میرے اپنے عزیز ہوں اور انھوں نے بھی مجھے دیکھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا تھا'' لیکن جلد ہی یہ خواب، خوابِ پریشاں بن کر رہ گیا۔ خانہ بدوش رمضان کو نیند کی حالت میں کہیں دور انجانی جگھوں پر لے گئے تا کہ وہ اپنے گھر والوں کے کبھی ہاتھ نہ آسکے۔ کچھ دن وہ لوگ اس کی آؤ بھگت کرتے ہیں اور پھر ایک بندریا کی رسّی تھما کر قریب کی بستی میں بھیک مانگنے بھیج دیتے ہیں کہ ان کے اغوا کیے ہوئے

بچوں کا مقدر یہی ہوتا ہے۔ 'رمضان' دن بھر در در پھرتا اور شام کو جو کچھ وہ اکٹھا کر لاتا خانہ بدوش اس سے وہ سب ہتھیا لیتے اور اسے روکھی سوکھی روٹی کھانے کو دے دیتے۔ اس پر شروع میں کڑا پہرا اور سخت نگہداشت رکھی جاتی ہے کہ کہیں وہ موقع پاتے ہی خانہ بدوشوں کے چنگل سے نکل نہ بھاگے۔ خانہ بدوش کبھی ایک جگہ نہ ٹکتے تھے کہ انھیں ہر وقت پولیس کا خطرہ لگا رہتا، وہ بچے اغوا کرتے اور انھیں اپنے رنگ میں رنگ کر بھیک منگوانے کے کام پر لگا دیتے۔

رمضان' بھی آہستہ آہستہ خانہ بدوشوں کے طور طریقے سیکھ چکا تھا اور اب اس کے دل سے ماں باپ بہن بھائیوں کی یادیں بھی محو ہوگئی تھیں۔ اس کا کوئی مستقل ٹھکانہ تو تھا نہیں۔ جہاں کہیں رات ہو جاتی، خانہ بدوش آس پاس محفوظ جگہ دیکھ کر اپنے خیمے ڈال دیتے تھے۔ عام طور پر وہ کسی نہ کسی بستی کے باہر اپنا ٹھکانہ بناتے۔ دو چار دن وہاں رکتے اور پھر آگے کسی مناسب بستی کی تلاش میں نکل پڑتے، ایسی ہی صورتِ حال میں جب وہ ایک مرتبہ کسی خوش حال بستی کے کنارے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور رمضان اپنی بندریا کی رسّی تھامے کھیل تماشہ دکھا رہا تھا، بستی کے بچے اس کے گرد جمع تھے، ان ہی میں ایک پیاری سی گڑیا جیسی چھوٹی سی بچی بھی تھی۔ رمضان کی بانسری سن کر اس سے متاثر ہو جاتی ہے اور اس سے ہمدردانہ گفتگو کرتی ہے۔ ہمدردی کے یہ چند بول رمضان کے دل میں اس کی گزشتہ زندگی کی یادیں تازہ کر دیتے ہیں۔ وہ ننھی منی بچی اس کی زندگی کے اندر ایک نئی لہر پیدا کر دیتی ہے اور وہ خواب دیکھنے لگا ہے کہ جیسے وہ پھر اپنی دنیا میں واپس چلا گیا ہے اور صاف ستھرے کپڑے پہنے رمضان دو تین دن میں ہی اس بچی سے اس حد تک مانوس ہو جاتا ہے کہ وہ چوری چوری اس بچی کے لیے اچھی اچھی سوغاتیں لاتا ہے۔ بچی بھی دو چار چھ روز ہی میں رمضان سے بہت مانوس ہو جاتی ہے اور اس سے ہمیشہ بانسری سنانے کی فرمائش کرتی ہے۔ بچی کے گھر والے بھی رمضان کو ڈھیر سارے پیسے وغیرہ دیتے ہیں، کیوں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی بچی رمضان سے نہ صرف مانوس ہوگئی ہے بلکہ اس کے ساتھ کھیلنے کودنے کو پسند کرنے لگتی ہے۔ ادھر خانہ بدوش رمضان کے ذریعے منصوبہ بناتے ہیں کہ وہ کسی طرح سے بہلا پھسلا کر اس بچی کو خیمہ بستی کے اندر لے آئے تاکہ وہ لوگ اسے بے ہوش کر کے اغوا کر لیں۔ یہ بات

رمضان کے لیے انتہائی صدمے کا باعث تھی، اب رمضان کو خانہ بدوشوں کی اصلیت کا پتا چل جاتا ہے کہ ان لوگوں کا اصل پیشہ بچوں کو اغوا کر کے فروخت کرنے یا انھیں بھیک مانگنے پر لگانا ہوتا ہے اور یہ ان بچوں کی مانگی ہوئی خیرات ہی ہوتی ہے جس پر خانہ بدوش گزارا کرتے ہیں۔ اس بات کو جان لینے کے بعد اس کے دل میں خانہ بدوشوں کے خلاف ایک قسم کی نفرت جاگ جاتی ہے اور اسے اپنا چھوڑا ہوا گھر اور اپنے لوگ اور بھی شدت سے یاد آنے لگتے ہیں لیکن وہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں اور نہ اس کو یہ خبر ہے کہ اسے کس سمت جانا چاہیے کہ وہ اپنے گھر والوں سے مل سکے۔ آخر اس میں شعور کی ایک کرن پیدا ہوتی ہے اور وہ خانہ بدوشوں کا آلۂ کار بننے کی بجائے انھیں دھمکی دیتا ہے کہ اگر تم نے اس معصوم بچی کو اغوا کیا تو وہ اُن لوگوں کے خلاف لوگوں کو صاف صاف بتا دے گا۔ خانہ بدوش اس کے اس نئے روپ کو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں اور کسی نئی جگہ کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ 'رمضان' موقع پاتے ہی خانہ بدوشوں کے چنگل سے خود کو آزاد کرا لیتا ہے اور کچھ دن کسی بستی میں چھپ کر ایک نئی زندگی اختیار کرتا ہے، محنت مزدوری کی زندگی۔ چند دن بعد وہ خانہ بدوشوں کے خوف سے چھپتے چھپتے پھرتا ہے اور بالآخر پھر اسی گاؤں کو اپنا ٹھکانہ بناتا ہے جہاں وہ لڑکی رہا کرتی تھی۔ وہ لڑکی کے باپ کو، جو گاؤں کا چھوٹا موٹا وڈیرہ ہے، خانہ بدوشوں کے خطرناک ارادوں سے آگاہ کر دیتا ہے اور اسے بچی کی حفاظت کرنے کا مشورہ دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ کس طرح خانہ بدوشوں کے گروہ میں شامل ہوا تھا اور اب کس طرح اس نے ان سے نجات حاصل کر لی ہے۔ وڈیرہ اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیتا ہے جہاں اس نے گھر کے ملازم کی حیثیت سے آٹھ نو سال گزار دیے ہیں اور یہاں رہ کر وہ سب کام کرتا ہے جو معمولی گھریلو نوکر کیا کرتے ہیں۔ مال مویشی چرانا، گھر کی صفائی ستھرائی کرنا، بچوں کے بستے اٹھا کر اسکول لے جانا۔ کبھی کہیں میلہ لگتا تو انھیں اپنی حفاظت میں میلے ٹھیلے کی سیر بھی کرا دیتا تھا۔ بچوں کو خوش کرنے کے لیے جانوروں کی بولیاں بولتا، وہ ننھی بچی جس کی محبت اور توجہ اسے دوبارہ گھریلو زندگی کی طرف لائی تھی، جوان ہو کر بیاہ دی جاتی ہے اور وہ اپنے سسرال چلی جاتی ہے۔ رمضان کو اس بچی سے ایسا ہی والہانہ لگاؤ ہو جاتا ہے جیسے وہ اس کی سگی بہن ہو۔ دراصل اس معصوم بچی کی صورت میں

اسے اپنے گم شدہ ماضی اور اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے بہن بھائی یاد آتے ہیں لیکن شادی کے بعد اس کے گاؤں سے چلے جانے کے بعد رمضان بھی وڈیرے سے رخصت لیتا ہے اور ایک گاؤں کے بعد دوسرے گاؤں میں محنت مزدوری کرتا ہے اور کہیں جم کر نہیں رہ پاتا اور اس کا بچپن، لڑکپن سے گزرتا ہوا، جوانی اور ادھیڑ عمر کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت بھی وہ ایک گاؤں کے وڈیرے کے ہاں ملازم ہے اور وڈیرے کے لڑکے کی ضد کرنے پر اسے اپنی زندگی کے حالات سنا رہا ہے۔

کہانی کے ابتدائیے میں سے چند فقرے ملاحظے فرمائیے:

''ہمارا یہ ملازم رمضان عجیب وغریب خصلت کا ایک معما قسم کا انسان تھا، وہ بولتا تو کم تھا مگر بولنے کے دوران بلند آواز سے کھلکھلا کر ہنستا بہت تھا اور ساتھ ہی زور زور سے قہقہے بھی خوب لگاتا تھا۔ بھرپور قہقہے لگانے اور کھلکھلا کر ہنسنے میں وہ سب پر سبقت لے جاتا تھا۔ معمولی معمولی دل لگی کی بات پر بھی وہ اس طرح دل کھول کر ہنستا تھا کہ یوں محسوس ہونے لگتا جیسے وہ کسی عارضے میں مبتلا ہے، اس کے یہ بے تکے قہقہے سن کر اکثر تو ہمیں خود ہنسی آ جاتی تھی اور ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے اور کبھی اس کی ہنسی پر غصہ بھی بہت آتا تھا۔ اس کے جسم کی مضبوط کاٹھی اور پھرتی کو دیکھ کر میرے بچگانہ دل پر بڑا اثر ہوتا تھا اور جب وہ لٹھ ہاتھ میں تھامے عربی نسل کے لوگوں کی طرح بالکل سیدھا اور اکڑ کر نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا مال مویشی چرانے کے لیے روانہ ہوتا تو اس کی ''ہو — اماں — ہو'' کی پاٹ دار آواز بھی مجھے اس قدر بھلی لگتی تھی جس قدر کہ وہ خود مجھے پسند تھا — میں نے سن رکھا تھا کہ بچپن میں ہی وہ اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کے گھر سے بھاگ گیا تھا، اس لیے مجھے اس کے بچپن کے حالات جاننے کی ہمیشہ بڑی جستجو رہتی تھی۔''

سوبھو گیان چندانی کی مذکورہ بالا کہانی نسبتاً طویل کہانی ہے جو اوریجنلی انھوں نے انگریزی میں "Traunt" کے نام سے لکھی تھی اور ۱۹۴۰ء میں شانتی نکیتن کے انگریزی میگزین میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازیں انھوں نے اسی کہانی کو بعض ترمیم و اضافے کے ساتھ سندھی زبان میں لکھا اور سندھی ہی سے اسلم رحیل مرزا نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اور سوبھو صاحب کی کہانیوں کے اردو تراجم پر مشتمل مجموعے ''انقلابی کی موت'' میں شامل ہے۔

اس کہانی میں جہاں انھوں نے بچوں کو موضوع بنا کر ان کے ساتھ کیے جانے والے غیر منطقی اور غیر انسانی سلوک کو فوکس کیا ہے، وہیں کم عمر بچوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور اُن کی خواہشوں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ بچوں کی بابت ہمارا رویہ دراصل چند مبہم مفروضات اور غیر حقیقی رویوں اور ٹیبوز (Taboos) کا نتیجہ ہے اور ہم بچوں کو ایک زندہ حقیقت اور نمو زائیدہ شخصیت کا حامل سمجھنے کی بجائے بے جان اشیا سمجھتے ہیں جسے من مانے طریقے پر ڈھالا جا سکتا ہے۔ اب سے ساٹھ پینسٹھ سال قبل بچوں کے موضوع پر لکھی گئی کہانیاں سندھی اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں کم کم ہی پائی جاتی ہوں گی۔ موضوع کے علاوہ اس کہانی کی ایک خصوصیت اس کا انو کھا ٹریٹمنٹ اور فنی اسلوب ہے کہ کہانی کو سوبھو صاحب نے نہ تو کہیں غیر ضروری طوالت کا شکار ہونے دیا ہے اور نہ واقعاتی اظہار میں لاؤڈ (loud) ہونے دیا ہے بلکہ اکثر محض ہلکے ٹچز (touches) اور اشاروں کے ذریعے معنوی تہ داری اور اثر پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ رمضان ہی کی کہانی کے ساتھ خود اپنے مالک کے اس لڑکے کی کہانی بھی بیک گراؤنڈ میں ہلکی آواز اور مدھم پرچھائیوں کے ساتھ چل رہی ہے جس کی فرمائش پر رمضان اپنی گزشتہ زندگی کی کہانی سنانے لگتا ہے۔ یعنی نئی پود کی وہ جھنجھلاہٹ جو کالج کی بے جان فضا اور بھس مضامین کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔ اس کہانی میں سوبھو صاحب نے متحرک لوکیل (locale) سے بامعنی اور تخلیقی کام لیا ہے۔ وہ اپنے قاری کو خانہ بدوشوں اور بنجاروں کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی طرف لیے پھرتے ہیں جس کی وجہ سے کہانی کے تناظر میں جہاں حقیقت اور سچائی کا رنگ گہرا ہوا ہے، وہیں واقعاتی سطح پر کہانی میں وسعت اور پھیلاؤ کا تاثر بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس تحرک پذیری کی وجہ سے کہانی میں منظر جلد جلد بدلتے ہیں جس کی وجہ سے قاری اکتاہٹ اور بوریت کا شکار نہیں ہو پاتا۔ اس صورتِ حال سے انھوں نے فن کارانہ طور پر سماجی حقیقت نگاری میں بھی تازہ کاری پیدا کی ہے اور خانہ بدوشوں اور چھوٹے بچوں کے اغوا جیسے سماجی مسئلے کو اجاگر کرتے ہوئے مجموعی طور پر سماجی نظام میں موجود انتشار اور لاقانونیت کی فضا کو بھی واشگاف انداز میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن مزے کی بات ہے کہ موضوع کی سماجی اہمیت کے باوجود وہ اظہار میں کہیں بھی غیر فنی رویہ اختیار نہیں کرتے ہیں اور تجسس کی ایک لہر آخر وقت تک کہانی میں جاری رہتی ہے۔

''بھگوڑا — آوارہ گرد'' سوبھو صاحب کی نہایت کامیاب کہانی ہے اور سندھی افسانے میں اسے ایک اہم اور عصر ساز فن پارے کی حیثیت حاصل ہے۔

اسی زمانے کی لکھی گئی ایک اور کہانی ابتدا میں انگریزی میں "Some boys love this way" کے عنوان سے لکھی گئی تھی اور شانتی نکیتن کے میگزین، شمارہ نومبر دسمبر ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی جسے مصنف نے بعد ازیں سندھی میں بعض ترامیم و اضافوں کے ساتھ دوبارہ لکھا ہے۔ اس کہانی کا اصل

موضوع محبت ہے بلکہ دیکھا جائے تو یہ افلاطونی (Platonic) محبت کے شدید ترین احساس کی بہت پُر تاثر کہانی ہے

"جس میں کہانی کا ہیرو ارجن اپنے کالج میں پڑھنے والے ایک نسوانی پیکر سے جو ظاہراً غیر معمولی طور پر حسین وجمیل اور پُر کشش شخصیت کی حامل دوشیزہ ہے جس کا آس پاس کوئی ثانی نہیں ہے اور جو شخص بھی ایک جھلک اس کی دیکھ لیتا ہے، بس اس پر فریفتہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ارجن بھی اس کی ایک مسکراہٹ سے گھائل ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی بے پناہ محبت میں مبتلا ہے جس میں نہ تو جنسی مطلب برآوری کا مقصد شامل ہے اور نہ سماجی سطح پر شادی کے بندھن میں باندھنے کا خیال دامن گیر رہتا ہے، گویا عشق برائے عشق کا معاملہ ہے اور بس۔ ارجن ایک ایسا عاشق ہے جو گھنٹوں اپنے محبوب کے خیالات میں گم رہتا ہے۔ وہ محبوب کے خیال میں مگن گھنٹوں سرد بھیگی راتوں میں گھومتے پھرتے گزار دیتا ہے اور اپنے روم میٹ (room mate) کو پل پل کی داستانیں سناتا ہے۔ ان میں کچھ باتیں محض فرضی اور تخیلاتی ہوتی ہیں۔ کسی دن وہ مندر میں ملنے کی کہانی سناتا ہے تو کسی روز باہمی قول واقرار کی روئیداد۔ لیکن دراصل ارجن میں اظہار محبت کی ہمت ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اک دن 'دیوی' خود ارجن کو پرچہ بھیج کر باغ میں بلاتی ہے اور اپنی جانب سے پسندیدگی کا عندیہ دیتی ہے بشرطے کہ خود 'ارجن' بھی اسے سمجھنے کی کوشش کرے اور اپنے دل سے شرمیلے پن کو نکال کر پہل کاری اختیار کرے لیکن اس کھلی دعوت کے بعد بھی ارجن اپنے آپ میں اتنی ہمت پیدا نہیں کر پاتا کہ اس سے اظہار عشق کر سکے اور جو کچھ کہنا سننا ہے، وہ سب اس کے پیٹھ پیچھے اور تنہائی میں اپنے دوست سے کہتا ہے۔ یہ ایک ایسے نوعمر شخص کی کہانی ہے جو جذباتی طور پر جوانی کے بھنور میں داخل ہو رہا ہے اور جو حقیقت سے زیادہ خوابوں کی دنیا میں مگن رہنا چاہتا ہے۔ وہ اپنا بیشتر وقت تصوراتی محبوبہ کے لیے نظمیں لکھنے میں گزار دیتا ہے اور ہمہ وقت اس کے خیالات میں مگن رہتا ہے۔ تعلیم سے بھی اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر وہ دیوانہ وار باغ کے اس گوشے میں پہنچ جاتا ہے جہاں کبھی اسے وہ دیوی ملی تھی۔ رفتہ رفتہ دیوانگی اس قدر بڑھتی ہے کہ سرد اور اندھیری رات میں ارجن ہوسٹل کے کمرے سے غائب ہو کر پبلک پارک پر

ٹھٹھرتا ہوا پایا جاتا ہے اور ڈبل نمونیے کا شکار ہو کر دیکھتے دیکھتے جاں بحق ہو جاتا ہے۔ گویا یہ افلاطونی خاموش محبت کی معراج تھی جو ارجن جیسے عاشق صادق مگر غیر حقیقت پسند نوجوان کو نصیب ہوئی۔

اس کہانی میں سوبھو صاحب نے محبت کی 'سادہ لوحی' کے جذبے کو جس پُر تاثر انداز میں ابھارا ہے، وہ ان کے افسانے کے فن پر کامل دسترس کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ہر چند سوبھو صاحب جنسی معاملات میں خود بھی Puritan رویے کے حامل رہے ہیں لیکن وہ زندگی میں جنسی جذبے کی صداقت اور اہمیت کے منکر نہیں رہے ہیں بلکہ عورت اور مرد کے درمیان محبت کے تعامل جنسی لگاوٹ کو ضروری اور فطری رویہ سمجھتے ہیں اور کہانی کے ہیرو کی افلاطونی محبت کو غیر فطری جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود کہانی کے متن میں کہیں بھی ہیرو کی سادہ لوحی کی بابت کوئی تضحیک آمیز ردِ عمل نہیں ابھرنے دیتے بلکہ کہانی کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے قاری، کہانی کے ہیرو کی 'سادگی' سے ہمدردی محسوس کرنے لگتا ہے۔

''پردیسی پریتم'' — ''انوکھا پیار'' سے مختلف نوعیت کی کہانی ہے حالانکہ اس میں بھی محبت کے موضوع کے گرد کہانی کے تانے بانے بُنے گئے ہیں۔

''ایک چینی لڑکا ''سن فو'' جو تعلیم حاصل کرنے ہندوستان آتا ہے، ہندوستانی لڑکی کملا چودھری سے ملتا ہے اور اس کی طرف کشش محسوس کرتا ہے۔ اسے ہندوستانی لڑکیوں میں اس لیے بھی کشش محسوس ہوتی ہے کہ ان کے نقش و نگار اور خدوخال چینی لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ تیکھے، زیادہ جاذبِ توجہ ہوتے ہیں۔ اور ادھر خود سن فو دوسرے چینی لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ وجیہ اور خوب رو نوجوان تھا۔ اور لڑکیاں اس کی طرف دلچسپی کا اظہار کیا کرتی تھیں۔ لیکن کملا چودھری اسے بالکل لفٹ نہیں کراتی اور اس کے بجائے ایک ہندوستانی ہم جماعت سے اظہارِ عشق کرتی ہے۔ اور یوں یہ قصہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ بظاہر تو مذکورہ کہانی بھی ایک سیدھی سادی کہانی ہے جس میں کوئی الجھاؤ، کوئی کش مکش اور کوئی سنسنی خیزیت موجود نہیں ہے لیکن بغور دیکھیے تو یہ نوجوان نسل کی اس ذہنی کیفیت اور جذباتی صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہے جس میں نوجوان لڑکے لڑکیاں آزاد فضا میں ملتے جلتے ہیں۔ ایک دوسرے کے درمیان باہمی ربط پیدا ہوتے ہیں اور کبھی کبھار ایک دوسرے کے حق میں پسندیدگی کا اظہار بھی ہو جاتا ہے لیکن یہ سب میل جول اور تعلقات ''محبت'' کے زمرے میں نہیں آتے کیوں کہ محبت زیادہ گہری وابستگی کا نام ہے! اس کہانی کی

دوسری سطح یہ بھی ہے کہ دو مخالف جنسوں کے درمیان کشش کا پیدا ہو جانا ایک فطری عمل ہوتا ہے اور یہ کشش پسندیدگی میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ جیسے کملا چودھری جیسی طالب علم سن فو کو بظاہر پسند کرتی ہے کہ وہ شکل وصورت اور عادات و اطوار میں ایک جداگانہ انداز کا مالک نظر آتا ہے۔ 'سن فو' بھی کملا چودھری کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ چینی لڑکیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ جاذبِ توجہ اور پُرکشش لگتی ہے۔ کالج میں ایک کھیل کے دوران وہ اشاروں کنایوں سے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کر دیتا ہے اور کھیل کے دوران اپنے کیمرے سے اپنے ہم جماعت دوستوں اور کملا چودھری کی تصویریں کھینچ کر انھیں تحفے میں پیش کر دیتا ہے۔''

لیکن دوسرے دن کملا چودھری اسے خط لکھ کر شکریہ ادا کرتی ہے اور کہتی ہے:

پیارے سن فو!

تصویریں بھیجنے کے لیے تمھارا بہت بہت شکریہ۔ تمھاری کھینچی ہوئی تصوریں آرٹ کے نکتہ نظر سے تو بے شک قابلِ تعریف ہیں، لیکن اگر کسی دوسرے مقصد کے تحت تم نے یہ تصاویر بھیجی ہیں تو میں تمھیں صاف اور واضح الفاظ میں بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ یہ تمھاری بہت بڑی بھول ہے اور تم کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو چکے ہو۔

فقط تمھاری ہم جماعت

کملا چودھری

''گویا کہ کملا کی طرف سے اسے راہِ راست پر لانے کا ایک مہذب مگر فیصلہ کن طریقہ تھا ورنہ دراصل کہنا وہ یہ چاہتی تھی کہ تم ایک چینی چوہے ہو اور مجھے تم سے انتہائی نفرت ہے—

اور اتنے دنوں تک بھٹکنے کے بعد یہ خط پا کر ایک رات کو اپنے کمرے کی طرف واپس آتے ہوئے 'سن فو' سوچنے لگا، ''بھلا کہاں میں اور کہاں وہ پُراسرار ہندوستانی لڑکی— ہم دونوں نرالے اور الگ الگ ملکوں کے رہنے والے ہیں۔ ہمارا خون الگ اور رسم و رواج بھی جدا جدا ہیں تو پھر یہ رشتہ کیسا—؟ اور یہ سوچ بچار کرتے ہوئے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوتی تھیں۔

کہانی کے خاتمے پر 'سن فو' کی آنکھوں کی نمی ہی اس کہانی کا حاصل ہے کہ محبت

کے راستے میں کیسی کیسی باتیں حائل ہو جاتی ہیں۔''

''حفاظتی بند'' اپنے موضوع اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے قطعی جداگانہ تاثر کی کہانی ہے۔ اس میں سوبھو گیان چندانی نے سندھ کے تجارتی اور صنعتی شہروں میں ابھرتی ہوئی ٹریڈ یونین تحریکوں سے پیدا ہونے والی فضا کی عکاسی کی ہے۔ اس کا آغاز کی چند سطور ملاحظہ کیجیے:

''محبوب اور میں دونوں بی اے تک ساتھ ساتھ پڑھتے تھے اور بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں مزدوروں اور کسانوں کی تنظیمیں اور انقلابی تحریکیں بنانے میں لگ گیا تھا۔ جب کہ محبوب سرمایہ داری نظام کے چکر میں پھنس کر رہ گیا تھا کیوں کہ وہ ایک سرمایہ دار کا بیٹا تھا اور اس کا باپ خاندانی طور پر خوش حال سرمایہ پرست انسان تھا۔ ویسے بھی ہماری دوستی لڑکپن کے دور کی روایتی قسم کی دوستی تھی جس میں زندگی کے نشیب و فراز اور نظریاتی سیاست کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔

کالج کے دو بے تکلف دوستوں کے درمیان وقت کے ساتھ ساتھ اور طبقاتی وابستگی کی تبدیلی کے ساتھ نظریاتی تبدیلی بھی واقع ہو جاتی ہے۔''

سوبھو صاحب نے سیاسی موضوع پر لکھی گئی اس کہانی میں بھی تکنیک کی خوبی سے قاری کے لیے دلچسپی کا عنصر پیدا کر دیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جہاں کہانی کے ہیرو میں انقلابی شعور پیدا ہوتا ہے، وہیں سوسائٹی کے پڑھے لکھے سرمایہ دار طبقے میں بھی نئی حقیقتوں سے نئے انداز میں سمجھوتا کرنے اور ان سے اس انداز میں نبرد آزما ہونے کی تراکیب اختیار کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے جو سوشلزم میں بھی ان کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ چنانچہ محبوب بھی کبھی خود کو 'لبرل' اور آزاد خیال شخص کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، اور کبھی ترقی پسند کے روپ میں۔ لہٰذا جب ایک مدت کے بعد وہ دونوں دوست ملتے ہیں تو محبوب اپنے انقلابی دوست کے سامنے تجویز رکھتا ہے کہ وہ اس کی نگرانی میں ایک ترقی پسند ہفت روزہ رسالہ نکالنا چاہتا ہے۔ تجویز یہ تھی کہ کراچی سے ایک نیا اور ترقی پسند نظریاتی رسالہ نکالا جائے جس کی گیٹ اَپ ملک سے نکلنے والے تمام رسالوں سے بہتر ہوں۔ اس میں رنگین تصاویر ہوں، خوب صورت کہانیاں ہوں، سیاسی رہنماؤں کے انٹرویو اور عوام کی دلچسپی کا تمام مواد موجود ہو۔ اس کی یہ تجویز سرسری نظر میں مجھے بہت پسند آئی۔ میں نے پوچھا، ''مگر اس رسالے کی پالیسی کیا ہو؟'' کہنے لگا، ''خالصتاً ترقی پسند افکار اور نظریات کا ترجمان ہوگا یہ رسالہ۔'' ''مگر ترقی پسندی کی بھی آج کل کئی قسمیں ہیں۔'' میں نے جرح کرتے ہوئے پوچھا، ''کس قسم کی ترقی پسندی آخر تمھارے ذہن میں ہے۔ ترقی پسندی کی جو پالیسی بھی تمھیں پسند ہو، وہ چلاؤ مگر صرف یہ خیال رکھو کہ حکومت رسالہ جاری ہونے کے فوری بعد بند نہ کر دے۔''

اور مجھے یاد آ گیا کہ اس قسم کی ایک تجویز اس نے ۱۹۵۳ء میں بھی میرے سامنے رکھی تھی اور اس وقت بھی میں نے یہی سوال کیا تھا کہ اس جریدے کی نظریاتی پالیسی کیا ہوگی اور اس نے جواب دیا تھا کہ 'لبرل' یعنی اعتدال پسند اور جواب میں، میں نے والٹیئر کا یہ مشہور قول سنایا تھا کہ: ''پختہ اور بے لچک اصولوں پر قائم رہنا حماقت کی نشانی ہے، جب کہ کوئی عقیدہ یا نظریہ نہ رکھنے کو اعتدال پسندی کہہ دیا جاتا ہے۔''

والٹیئر کے الفاظ میں:

> To have an opinion is to be erratic and to have none is to be liberal.

چنانچہ ایک فقرہ دیکھیے:

> ''اور وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا، ''یار اب تو ذرا سیانا بننے کی کوشش کرو۔ اعتدال پسندی سے زیادہ موزوں آج کے حالات میں اور کیا پالیسی ہوسکتی ہے۔ تمھاری یہ انتہا پسندی کی پالیسی کیا ہمارے حکمران برداشت کرسکیں گے؟ یہ ایک نظریاتی ملک ہے۔ مذہب کے نام پر قائم ہوا ہے اور مذہب کے نام پر ہی اسے ہمیشہ قائم رکھا جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں جیل کی ہوا اب راس آ گئی ہے۔''

چنانچہ مجوزہ رسالہ دھوم دھام سے نکلتا ہے، اس کے چند ماہ بعد ہی محبوب کو اپنے انقلابی دوست کی ضرورت پیش آ جاتی ہے جب اس کی لانڈھی فیکٹری کا گھیراؤ مزدور کر لیتے ہیں اور انقلابی اسے مشورہ دیتا ہے کہ وہ مزدوروں کا مقابلہ کرنے کی بجائے فیکٹری ان کے حوالے کر دے اور کہہ دے کہ وہ خود اسے سنبھالیں۔ لامحالہ مزدور خود اس پر بھروسا کرنے پر مجبور ہوں گے۔ جس کے نتائج حسب دل خواہ نکلتے ہیں۔

ایک اور مکالمہ ملاحظہ کیجیے:

> ''تھوڑی دیر کے بعد رک کر وہ بولا، ''تم سندھ کے پرانے باشندے ہو۔ اس لیے تمھیں بخوبی معلوم ہوگا کہ یہاں بپھرے ہوئے دریائے سندھ کو قابو میں رکھنے کے لیے بہت سے ''حفاظتی بند'' اور پشتے بنانے پڑتے ہیں۔ اسی لیے اپنی دولت کی حفاظت کے لیے ہمیں بھی حفاظتی بند تیار کرنا پڑتے ہیں۔ ہمارا سب سے پہلا حفاظتی بند مذہب کی تلقین و تبلیغ کرنا ہے جس کے لیے ملک کی تقریباً سب بڑی بڑی مذہبی جماعتوں کو لاکھوں روپے سالانہ امداد دیتا ہوں۔ ان کے لیے چندے بھی جمع کرواتا ہوں، کیوں کہ ان سب مذہبی جماعتوں کا صرف

ایک نعرہ ہوتا ہے کہ اس فرسودہ معاشرے کو جوں کا توں قائم رکھنا مذہب کے عین مطابق ہے۔ اس لیے ہمیشہ خدا تعالی کی رضا پر راضی رہو۔ خدا جسے چاہتا ہے خوب مال و دولت دیتا ہے اور باقی نیک بندوں کو ہمیشہ آزمائش میں رکھتا ہے۔ اس لیے لوگوں کی اکثریت بھی مذہب کے اس حفاظتی بند کو توڑ نہ سکے گی۔ اور اگر یہاں کے عوام اس حفاظتی بند کو پھلانگ کر آگے بڑھنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو پھر اس سے آگے دوسرا حفاظتی بند تیار رہتا ہے۔ آج کل چاروں طرف سے آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ آزادی اور خوش حالی کے لیے ہمیں ووٹ دو اور جمہوریت کے کچھ نام نہاد علم بردار سادہ لوح عوام کو جمہوریت اور سیاست کے سبز باغ دکھا دکھا کر چکر میں ڈال دیتے ہیں اور ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور اگر اس کے بعد بھی ان میں کچھ جان باقی رہ جائے اور وہ سیاست کے میدان میں آنے کی کوشش کریں تو پھر میرے دوست اور کارندے سیاسی جماعت میں موجود ہیں جن کی مدد میں ہر وقت کرتا رہتا ہوں۔ اس لیے جمہوریت کے نام پر بپھرے ہوئے عوام کو قابو میں رکھنے کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اس کا گلا بھر آیا تھا اور کھنکارتے ہوئے اس نے بلغم تھوک کر بولا، ''صرف تم ہی یہاں ایک ایسے شخص ہو جو اب تک میرے کی جال میں پھنسنے سے انکار کرتے رہے ہو۔'' ''مگر اب تو میں بھی تمھارے پھیلائے ہوئے ایک جال میں پھنس چکا ہوں۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا، ''ترقی پسندی کے نام پر پھینکے ہوئے دانے چگنے کے جال میں۔''

تم مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کرو—'' وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا— ''ادب اور صحافت کے میدان میں اس طرح کام کرتے ہوئے جہاں ایک طرف تم اپنے عوام کو انقلاب کا دروازہ دکھاتے ہو تو دوسری طرف اصلاحی کاموں کے ذریعے انھیں اپنی نجات کا راستہ بھی دکھاتے ہو— اب میری طرف ہی دیکھ لو کہ اگر میں سوجھ بوجھ سے کام لوں تو ایک سوشلسٹ نظام کے اندر رہ کر بھی مجھے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے کیوں کہ میں ایک قابل ایڈمنسٹریٹر ہوں اور لوگوں کی نبض خوب پہچانتا ہوں—''

آپ کو اندازہ ہوا ہوگا ''حفاظتی بند'' سوبھو صاحب کے آدرشی رویے کے اظہار کی کہانی ہے اور سیاسی و اقتصادی فضا میں سوشلزم سے متاثر ہونے والی کیفیت کا اظہار کرتی ہے۔ دلچسپی کے عنصر نے ایک سپاٹ

موضوع کو بھی قابلِ مطالعہ فن پارہ بنا دیا ہے۔

اسی طرح ''انقلابی کی موت'' ایک پرانے کمیونسٹ ورکر ابراہیم مالاباری کا تاثراتی خاکہ ہے جس میں دلچسپ مگر متاثر کن ٹچز دے کر سوبھو صاحب نے اس کو کہانی کا روپ دے دیا ہے۔

''یہ ایک ایسے سچے انسان کی کہانی ہے جو اپنے آدرش کی آخری فتح کے لیے جان تک کی بازی لگا دیتا ہے اور بدلے میں کچھ طلب نہیں کرتا اور جو اپنی اَن تھک محنت، جفاکشی، غربت اور ناداری کی وجہ سے ۳۵۔۳۶ برس میں بھی ۶۰۔۶۲ برس کا دکھائی دیتا ہے۔ نحیف اور ہڈیوں کا ڈھانچا جسے گزر بسر کرنے کے لیے بھی روزانہ دو ہزار بیڑیاں بنانی پڑتی ہیں، لیکن عزم و حوصلے میں وہ فولاد و پیکر تھا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کی باریکیوں کو بالکل نہیں سمجھتا لیکن یہ بات اس کے شعور کا حصہ بن گئی تھی کہ غریبوں اور ناداروں کی مکتی لال جھنڈے ہی کے زیرِ سایہ ممکن ہے۔ اس نے خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی اس مقصد کی کامیابی میں صرف کردی اور آخری عمر میں اس کی صرف یہ خواہش تھی کہ کسی طرح وہ اپنے وطن کیرالہ پہنچ جائے اور اپنے ہی لوگوں کے درمیان موت کو گلے لگائے۔'' آخر بڑی بھاگ دوڑ کے بعد کامریڈ ابراہیم مالاباری ''گردن مار'' پاسپورٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اور تھر پار کر، کچھ وغیرہ کی سرحد پار کر کے کیرالہ میں اپنے رشتے داروں سے جا ملا اور وہیں خاک میں دفن ہوا۔''

''انقلابی کی موت'' میں کردار نگاری کا فن اپنے نکتۂ کمال پر فائز نظر آتا ہے۔ کہانی کے ہیرو کا حلیہ ملاحظہ کیجیے:

''پھر وہ زمین پر ہاتھ رکھ کر اس کے سہارے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی کمر کو دونوں ہاتھوں سے دو تین بار تھپکی دی تا کہ ہڈیوں کے جوڑوں اور انگلیوں کی تھکن اور درد کی چبھن دور ہو جائے۔ اس کے بعد وہ ایک قدم آگے بڑھ کر میرے بالکل قریب آیا اور بولا، ''آؤ اب چلیں، چل کر چائے پییں۔''

اس کے بعد میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر وہ مجھے گلی کے نکڑ پر ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہمارے آگے چائے آگئی۔ تو وہ چائے کے کپ سے چسکیاں لیتے ہوئے اس نے مجھے اپنی کتھا سنائی۔''

کہانی کی نثر سیدھی سادی اور حقیقی زندگی سے بہت قریب ہے۔ اسی لیے اس میں کسی قسم کا مصنوعی یا گنجلک پن نہیں آسکا ہے۔ اسی سچائی نے ان کے اظہار کو نہایت دل آویز تاثیر عطا کردی ہے۔

سوبھو گیان چندانی کے اسلوب میں سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کے زہر خند طنز یعنی (irony) کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے ایک پُر لطف فضا پیدا ہوتی ہے اور پڑھنے والا کہانی کی ماجرائیت میں پوری طرح محو ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ سوبھو گیان چندانی نے بہت کم کہانیاں لکھی ہیں لیکن ان کہانیوں میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر تنوع اور رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے اور انھیں ہم عہد آفریں کہانیوں کے زمرے میں رکھتے ہیں— وہ سندھی افسانے میں اردو کے معروف ترقی پسند افسانہ نگار کرشن چندر کی انقلابی روایت کے علم بردار رہے ہیں جس نے آگے چل کر زیادہ برگ وبار پیدا کیے ہیں۔ سوبھو صاحب ایک واضح آدرش وادی شخص ہیں اور نظریاتی غلبے اور مقصدیت کے تحت اس بات کا اندیشہ لاحق ہو سکتا ہے کہ ان کی کہانیوں میں سیاسی نعرے بازی کی صدائے بازگشت گونجتی ہوگی لیکن ان کے ادبی شعور اور عالمی ادب کے وسیع مطالعے کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنی افسانہ نگاری کو اسلوبیاتی لحاظ سے کبھی بلند آہنگ، لاؤڈ (loud) اور نعرہ نہیں بننے دیا ہے اور اکثر کہانیوں میں فنی رموز اور ضرورتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ زیادہ تر کہانیوں کا موضوع بھی سیاست سے زیادہ سماجی معروضیت رہی ہے جن میں انھوں نے سماجی اور گھریلو مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ موضوع اور اسلوب میں ایک ہموار اور مکمل توازن ہی کامیاب اور موثر فن پارے کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

روشنی کی راہ میں

''خودنوشت سوانح عمری''

(ایک جائزہ)

سندھی زبان میں خودنوشت سوانح عمریاں، آپ بیتیاں، آتم کتھائیں یا جنم کتھائیں ہر چند بہت زیادہ نہیں لکھی گئی ہیں لیکن گزشتہ چند عشروں میں خودنوشت آپ بیتیاں اور عہدِ رفتہ کی یادداشتیں لکھنے کا رجحان تیزی سے پھیلا ہے اور سرحد کی دونوں جانب چند یادگار آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں جن میں سے بیشتر ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور فن کاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جس نے قیامِ پاکستان سے قبل ہی سندھی زبان وادب کی تعمیر وتوسیع میں رہنمایانہ کردار ادا کیا ہے جنھیں ہم بجاطور پر جدید سندھی زبان وادب کے معماروں میں شمار کرسکتے ہیں۔ مثلاً پاکستان میں نصف صدی کے دوران جو چند اہم خود نوشت سوانح عمریاں اور آپ بیتیاں شائع ہوئی ہیں، ان میں محمد صدیق مسافر کی آپ بیتی ''منازلِ سفر'' (۱۹۵۲ء)، ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ کی ''**منهنجي مختصر آتم ڪهاڻي**'' (منجھی مختصر آتم کہانی) (میری مختصر داستانِ حیات، ۱۹۵۹ء)، جی ایم سیّد کی آپ بیتی ''**منهنجي ڪهاڻي منهنجي زباني**'' (منجھی کہانی منجھی زبانی) (میری کہانی میری زبانی، ۱۹۵۴ء)، محمد صدیق میمن کی آپ بیتی ''**تان کي ڏونگر ڏوريان**'' (تان کی ڈونگر ڈوریاں) (۱۹۸۱ء)، عبدالجبار جونیجو کی آپ بیتی ''**ديپڪ ملهار**'' (دیپک ائیں ملھار) (۱۹۸۴ء)، کریم بخش نظامانی کی آپ بیتی ''**ڪئي ڪتاب**'' (کئی کتاب)، شیخ ایاز کی تین جلدوں پر مشتمل خودنوشت سوانح عمری ''**ڪتي نه پجبو ٿڪ مسافر**'' (کتھنے نہ بھجیو تھک مسافر) اور معروف افسانہ نگار جمال ابڑو کی دو جلدوں پر مشتمل آپ بیتی ''**جيون آتم ڪٿا**'' جیون آتم کتھا اور عبدالقادر جونیجو کی آپ بیتی ''**ڇو ڇاءِ ڪيئن**'' (چھو، چھا، ائیں کیں) (کیوں، کیا اور کیسے) سندھی سوانحی ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ اسی طرح سرحد کے اس پار بھی خودنوشت آپ بیتی لکھنے کا رجحان مقبول رہا ہے اور گوبند مالھی، کیرت بابانی، پوپٹی ہیرانندانی، موہن کلپنا، لچھمن کومل، کیول مالکانی اور متعدد دوسرے اہم ادیبوں اور شاعروں نے اپنی سوانح

عمریاں اور یادداشتیں مرتب کی ہیں جن میں سندھی شرنارتھیوں پر سرحد کے اس پار گزرنے والی افتاد اور ہندوستان میں سندھی زبان و ادب کی بقا کے لیے لڑی جانے والی عظیم تہذیبی جنگ کا احوال بھی سنائی دیتا ہے جس کے نتیجے میں سندھی زبان کو ہندوستان کے دستور میں ایک قومی زبان کا درجہ حاصل ہوا۔ چنانچہ سرحد کی دونوں جانب لکھی جانے والی خودنوشت سوانح عمریوں اور یادداشتوں کی بنیاد پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سندھی زبان کے سوانحی ادب میں آپ بیتیوں کا حصہ، معیار اور مقدار ہر دو اعتبار سے گراں قدر ہے۔

خودنوشت سوانح عمریوں کی مقبولیت کی ایک وجہ حقیقت نگاری کا رجحان بھی ہے جس کا اظہار عام سوانح عمریوں کے مقابلے میں اس صنف میں زیادہ بہتر اور مؤثر انداز میں ہو جاتا ہے۔ یہاں لکھنے والا چونکہ خود اپنی بابت اظہار خیال کرتا ہے، اس لیے اپنے بارے میں نسبتاً زیادہ صاف گوئی اور جرأت کا اظہار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح ایک اچھی سوانح عمری کے لیے اس کا دلچسپ اور ادبی انداز نگارش ایک امتیازی خوبی سمجھی جاتی ہے اور جس طرح ایک اچھے سوانح نگار کے لیے غیر جانب دار اور حقیقت نگار ہونا ضروری خیال کیا جاتا ہے جو اپنے موضوع کی شخصیت اور کردار کو اس طرح اجالتا ہے کہ پڑھنے والے حقائق کی روشنی میں اس کی بابت اچھی یا بری رائے قائم کرسکیں۔ اسی طرح آپ بیتی لکھنے والے سے بھی یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ سچائی اور حقیقت نگاری کے بنیادی جوہر کو اپنے پیشِ نظر رکھے۔ چنانچہ ایسی تحریریں جن میں اپنی ذات وصفات اور اپنے خاندانی حالات و واقعات کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کیا گیا ہو اور تاریخی و واقعاتی حقائق میں جھوٹ اور لن ترانی کی آمیزش شامل کردی گئی ہو، پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہے۔ سچائی اور حقیقت نگاری کے علاوہ ایک معیاری خودنوشت سوانح عمری لکھنے والے کے لیے منکسر المزاج اور انصاف پسند ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اپنے منھ میاں مٹھو بننا اور اپنے تئیں ڈینگیں مارنا یوں بھی کردار کی نفسیاتی خامیوں کی نشان دہی کرتے ہیں لیکن انکساری کی خوشبو ایسی ہے کہ وہ کردار کو لاکھ چھپانے کے باوجود بھی ظاہر کردیتی ہے۔ جس طرح ایک سوانح نگار اپنے موضوع کے گرد پھیلے ہوئے معروضی حالات و واقعات، کرداروں اور احساسات کے اظہار سے ایسی فضا سازی کرتا ہے جس میں اس کے موضوع کی شخصیت ابھر آتی ہے، اسی طرح آپ بیتی لکھنے والے کے لیے بھی ضروری ٹھہرتا ہے کہ وہ اپنے اطراف موجود ماحول معاشرتی صورتِ حال اور رویوں کا اظہار کرے جن سے اس کا براہِ راست یا بالواسطہ تعلق بنتا ہو۔

مذکورہ بالا معیار کی روشنی میں جب ہم سوبھو گیان چندانی کی خودنوشت سوانح عمری ''روشنی کی راہ میں'' جو سندھی زبان کے مؤقر جریدے ''سوجھرو'' کراچی میں فروری ۲۰۰۲ء سے اگست ۲۰۰۵ء تک قسط وار شائع ہوتی رہی ہے، نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ سوبھو گیان چندانی کی آپ بیتی ایک

معیاری دستاویز ہے جس میں صاحبِ تصنیف نے اپنی ذات، صفات اور اپنے خاندانی پس منظر کی بابت کہیں بھی سچائی اور حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے چنانچہ ''روشنی کی راہ میں'' کی پہلی قسط ہی میں اپنے خاندانی پس منظر کی بابت صرف چند سطری تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''ہم لوگ نسلاً اور ذات برادری کے اعتبار سے کٹیار اور لوہانہ ہیں اور ننھیالی اعتبار سے ڈوڈانی ہیں۔ پڑدادا گیان چند جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، سیٹھ ہریل داس کے فرزند تھے جن کا تعلق کنڈیارو سے تھا۔ وہیں سے نقل مکانی کر کے گوٹھ بندی میں آباد ہوئے تھے۔ گیان چند کے چار بیٹے تھے، بڑا روپ چند۔ دوسرا پارومل، تیسرا پربھ داس اور چوتھا جیوت رائے۔ ان کا ایک بھائی بھی تھا جس کا نام سیرومل تھا۔ اس کی اولاد نہ تھی، اس لیے پربھ داس کو گود لے رکھا تھا۔ جب گیان چند کی ملکیت کا بٹوارہ ہوا تو پربھ داس کو چھ آنا حصہ ملا جس میں ''گیریلو'' اور ''مانو'' والی اراضی اور دکان شامل تھے۔ بندی کے پاس دیہہ بکھی میں جو زمین تھی، وہ بھی اسی چھ آنے حصے میں شامل تھی۔ پربھ داس کے حصے میں آنے والی زمین لگ بھگ ڈیڑھ سو ایکڑ ہوگی۔ زمینوں کی ناہمواری اور دریا میں پانی کی کمی بیشی کی وجہ سے پیداوار بہت کم ہوتی تھی۔ اکثر اراضی تو کنویں کے پانی اور ندی نالے کے ذریعے سیراب کی جاتی تھی۔ زمین کی دیکھ بھال زیادہ تر پربھ داس کے ذمے تھی جس کی وجہ سے ان کا گوٹھ گاؤں کے شرفا، زمیں داروں اور افسروں سے اچھے سماجی تعلقات اور ملنا جلنا رہتا تھا۔ ریونیو ڈپارٹمنٹ کے افسروں سے بھی عمدہ تعلقات اور اثر و رسوخ تھا۔ یاد پڑتا ہے کہ بکھی گوٹھ میں امتحان کے زمانے میں دادا دو چار بھائی بندوں کو ساتھ لے کر فروٹ اور مٹھائی کی ڈالی بطور تحفہ پہنچاتے تھے۔ گیان چند نے زیادہ تر زمینیں ابڑو خاندان کے زمیں داروں سے لین دین کے بدلے میں حاصل ہوئی تھیں۔ ہمارے گوٹھ کے زیادہ تر مسلمان ''ساریہ'' ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان لوگوں سے ہمارے گھرانے کے تعلقات بہت دوستانہ تھے۔ شادی بیاہ، غمی خوشی ہر بات میں ہم ایک دوسرے کے شریک رہتے تھے۔ پربھ داس کے دو بیٹے تھے، ایک میرے والد ٹنورل اور دوسرا کھلن داس۔ کھلن داس کی اپنی اولاد نہ تھی، اس لیے اس نے میرے بڑے بھائی کیول رام کو گود لے رکھا تھا۔ مشترکہ خاندان ہونے کی وجہ سے جائیداد کی تقسیم نہ ہوئی تھی اور سب رہن سہن ایسی

محبت اور میل جول کے ساتھ چلتا تھا کہ لوگ حیرت کرتے تھے۔''

خاندانی پس منظر کے بارے میں مذکورہ بالا بیان نہایت سیدھا سادہ اور کسی حد تک انکساری کا پیرایہ لیے ہوئے ہے۔ صرف ضروری باتوں کا حقیقت پسندانہ اظہار ہے۔ اسی طرح بچپن اور لڑکپن کے احوال بیان کرتے ہوئے بھی اپنے خاندان کی تونگری وغیرہ کا تذکرہ کرنے کی بجائے اپنے دادا، والد اور چچا وغیرہ کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کیا ہے جس سے ان کی انسانی سرشت کا اندازہ ہو سکے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''مشترکہ رہن سہن ہونے کے باوجود ہمارے گھرانے میں کسی قسم کا کوئی جھگڑا، فساد بلکہ رنجش تک نہ تھی۔ سب میل میلاپ سے رہتے اور مل جل کر کام کیا کرتے تھے۔ گھر کا ماحول تمام سکھ اور راحت والا تھا۔ نند بھاوجوں اور دیورانیوں جٹھانیوں تک میں کوئی کھٹ پٹ نہ تھی اور گھر کی سب عورتیں سہیلیوں کی طرح رہتی تھیں۔ اور کشیدگی کی جو باتیں عام طور پر مشترکہ گھرانوں میں دیکھنے سننے میں آتی ہیں، ہمارے گھر میں بالکل نہیں تھیں۔ ہمارے ہاں ہاریوں اور دوسرے کارندوں سے ویاج اور سود لینے کو بری بات سمجھا جاتا تھا اور نہ قرض کے روپے پیسے کے لین دین کو نفع بخش کاروبار بنایا جاتا تھا۔ اس ریت کی پاس داری اب تک ہوتی چلی جاتی ہے۔''

سوبھو صاحب نے اپنے لڑکپن اور بچپن کے احوال بھی بڑی للک اور دلچسپی کے ساتھ لکھے ہیں کہ اس دور کا پورا منظر متحرک ہو جاتا ہے۔ بکھی اور قمبر کے اسکول کے استادوں کا ذکر ہو کہ اس عہد کے یار دوستوں اور سنگی ساتھیوں کا احوال، اس میں زندگی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے لیکن بچپن اور لڑکپن کے واقعات کی کمی کا احساس بھی ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ یا تو ان کی یادداشت بچپن کے چلبلے پن کو فراموش کر چکی ہے یا انھوں نے اپنے نوجوانی اور اس کے بعد کے دور کو زیادہ اہمیت دی ہے۔

ہمارے نزدیک ''روشنی کی راہ میں'' ایک ایسی سوانحی دستاویز ہے جس کے ذریعے آپ نہ صرف سوبھو گیان چندانی کے ماہ و سال کے احوال جان سکتے ہیں بلکہ ہندوستان اور بالخصوص صوبہ سندھ کے سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور اخلاقی صورتِ حال کی متحرک عکاسی ہوتے دیکھتے ہیں۔ گویا یہ خودنوشت سوانح محض ایک شخص کی زندگی کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے لے کر ساتویں دہائی کے اواخر تک کے ہر اس چھوٹے بڑے سیاسی و سماجی واقعات اور شخصیات کا احوال سناتی ہے جس سے سوبھو گیان چندانی کا کسی نہ کسی طور پر واسطہ پڑا تھا۔ اس اعتبار سے اس کتاب کو ایک تاریخی اہمیت بھی حاصل ہو گئی ہے اور اسے ایک مخصوص عہد کی تاریخی دستاویز کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے، جو ایک عمدہ

خودنوشت سوانح عمری کی خوبی شمار کی جاتی ہے۔ کیوں کہ کوئی بھی شخصیت اپنی تمام تر بزرگی، اوصاف حمیدہ اور خوبیوں کے باوجود نہ تو بسم اللہ کے گنبد میں بند رہتی ہے اور نہ رابن سوکروسو کی طرح تنہائی کے جزیرے میں زندگی بسر کرتی ہے۔ چنانچہ صاحبِ تصنیف کو اپنے شخصی احوال کے ساتھ ان سماجی، معاشی اور تہذیبی و ثقافتی حالات کی منظر کشی کرنی پڑتی ہے جن سے اسے نبرد آزما ہونا پڑا ہے اور جن کے اچھے برے اثرات اس کی زندگی پر مرتب ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سوبھو صاحب نے اپنی خودنوشت سوانح میں اپنے اردگرد موجود سماجی، سیاسی اور ثقافتی ماحول کی جس تفصیل اور تجزیاتی انداز میں عکاسی کی ہے، اس نے اس کتاب کو ایک اضافی اہمیت دے دی ہے۔

سوبھو صاحب نے میٹرک این جے وی ہائی اسکول کراچی سے ۱۹۳۹ء میں پاس کیا تھا۔ اس وقت کراچی کی سیاسی، سماجی فضا کیسی تھی اور اس دور کے نوجوان کس طرح کے خواب دیکھتے تھے، ان کا اظہار اس کتاب میں نہایت عمدگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

میٹرک اور انٹر کے مراحل طے کرنے کے بعد وہ گریجویشن کرنے کے لیے شانتی نکیتن چلے گئے تھے، جہاں دو سال کے قیام نے ان کی شخصیت میں غیر معمولی تبدیلی پیدا کی تھی۔ ان کے علمی ذوق کی آبیاری اور تعلیمی سرگرمیوں کی تفصیلات دراصل سوبھو صاحب کے کردار اور شخصیت سازی کے مختلف مراحل کی نشان دہی کرتی ہیں لیکن ساتھ ہی اس دور کے مروج اور موجود علمی اور تہذیبی رویوں کو بھی سامنے لاتی ہیں۔

گرودیو ٹیگور کی شخصیت اور شاعری نے صرف سوبھوگیان چندانی ہی کو متاثر نہیں کیا تھا بلکہ وہ ایک عہد تھا جو ''ٹیگوریت'' کے نام سے موسوم تھا۔ چنانچہ شانتی نکیتن میں تعلیم حاصل کرنا سوبھو صاحب کے خواب کی تکمیل تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے شانتی نکیتن میں موجود غیر سیاسی فضا پر نکتہ چینی بھی کی ہے اور یہ لکھا ہے:

> ''شانتی نکیتن پہنچ جانے کے بعد وہ رومانی دلچسپی جو انھیں گرودیو ٹیگور سے تھی، باقی نہیں رہی تھی لیکن اس مادرِ علمی کے علم پرور ماحول سے انھوں نے جو اکتساب کیا ہے، اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ بے شک شانتی نکیتن میں وہ ایک ناپختہ نوجوان کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے اور ایک مکمل مرد بن کر وہاں سے لوٹے تھے۔ شانتی نکیتن کے دو سالہ قیام نے انھیں ننھے منے سنت اور شرمیلے رومان پسند نوجوان کی بجائے جنگِ آزادی کا ایک پُرجوش انقلابی بنا دیا تھا اور ایسی حقیقت پسندانہ بصیرت سے نوازا تھا جس کی بنیاد خیال پسندیت اور جذباتیت کی بجائے تعقل پسندی، منطقی استدلال، سائنسی نکتۂ نظر، تاریخی جدلیات کا تجزیاتی انداز جیسے رویئے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے

سوچنے اور محسوس کرنے کا دائرہ وسیع تر عالمی سماج تک پھیل گیا تھا۔ ان کا اس فکری و جذباتی سفر کا احوال کسی بیان اور عبارت آرائی کے ذریعے ہم تک نہیں پہنچتا بلکہ ''روشنی کی راہ میں'' کے صفحات پر لحہ بہ لحہ اور واقعہ در واقعہ ظہور پذیر ہونے والے واقعات اور حالات کے توسط سے منکشف ہوتے ہیں۔''

سوبھو گیان چندانی کی زندگی مسلسل جہد و عمل کی کہانی ہے اور اس دور کی شاید ہی کوئی ایسی سیاسی و سماجی تحریک ہوگی جس میں سوبھو صاحب نے بہ نفسِ نفیس شرکت نہ کی ہو۔ چنانچہ ان کی خودنوشت سوانح عمری میں ان تحریکوں کے مکمل منظرنامے بھی دکھائی دیتے ہیں اور اس طرح ان صفحات میں قیامِ پاکستان سے قبل اور بعد سندھ میں برپا ہونے والی مختلف النوع سیاسی، سماجی اور تہذیبی تحریکوں کے مؤثر رپورتاژ محفوظ ہو گئے ہیں جو بجائے خود اس خودنوشت کی اہمیت میں یک گونہ اضافہ کرتی ہے۔

''روشنی کی راہ میں'' اپنے دلچسپ اندازِ نگارش کے اعتبار سے بھی ایک منفرد تصنیف ہے۔ ایک اچھی خودنوشت سوانح عمری سے پہلا مطالبہ اور تقاضا یہی کیا جا سکتا ہے کہ اس میں صاحبِ تصنیف کی ذات و صفات کا یک طرفہ اور سپاٹ احوال بیان کیے جانے کی بجائے ایسے عناصر بھی وافر مقدار میں موجود ہوں جو قاری کی دلچسپی کا باعث ہوں۔ آخر ایک عام آدمی آپ کی زندگی کے حالات کیوں پڑھے؟ یہی سوال آپ بیتی لکھنے والے کو ایسا اندازِ نگارش اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جس میں ریڈایبلٹی (readability) کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔

سوبھو صاحب ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں اور انھیں سندھی افسانے میں حقیقت نگاری کی روایت کے بنیادگزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے افسانہ نگاری کے فن سے خودنوشت سوانح عمری میں بھی خوب فائدہ اٹھایا ہے اور اکثر حالات و واقعات کو سیدھے سادے سپاٹ انداز میں بیان کر دینے کی بجائے دلچسپ منظرناموں کی صورت پیش کیا ہے۔ مثلاً ۱۹۳۹ء میں شانتی نکیتن میں یومِ آزادی کے انعقاد کا قصہ ایک دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

> ''۱۹۳۹ء کا قصہ ہے، دسمبر کی ۲۷ یا ۲۸ تاریخ کا دن ہندوستان کے یومِ آزادی کے طور پر منایا جاتا رہا ہے۔ یہ دن دراصل کانگریس کے لاہور اجلاس کی اس قرارداد کے حق میں منایا جاتا تھا جو کانگریس نے ۱۹۳۲ء میں پاس کی تھی اور جس کے ذریعے کانگریس نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالبہ کر دیا تھا۔ شانتی نکیتن میں طلبا اس قرارداد کی یاد مناتے چلے آئے تھے لیکن گزشتہ دو تین برسوں سے گرودیو ٹیگور نے کالج کی حدود میں ہر قسم کی سیاسی تقریب کے انعقاد پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ تقریب سے دو تین دن قبل انڈونیشیا کے دو طالب علم

دوست خیر الدین اور سلامت پر استو اور دو چار جامعہ عثمانیہ سے نکالے ہوئے طالب علم میرے پاس آئے اور مجھے آزادی کے ساتھ اس بات کے لیے تیار کیا کہ اس سال شانتی نکیتن میں یومِ آزادی کا جلسہ ضرور منعقد کیا جانا چاہیے۔ اس وقت میں بوائز ہوسٹل کا وارڈن تھا۔ میں نے پوچھا، ''بھلا اگر سب طالب علم اس تقریب کو منانے پر تیار ہیں تو اس کے انعقاد میں آخر رکاوٹ کیا ہے؟'' مجھے بتایا گیا کہ ''گرودیو کی جانب سے دو تین برسوں سے شانتی نکیتن میں سیاسی نوعیت کے جلسے جلوس پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ لہٰذا طلبا اپنی خواہش کے باوجود یومِ آزادی کا جلسہ منعقد نہیں کر سکتے۔'' یہ سن کر مجھ میں جوش کی ایک لہر پیدا ہوئی اور میں فوراً ہی کالج کے پرنسپل انیل چندا کے پاس جا پہنچا اور ان سے تمام طلبا کی جانب سے درخواست کی کہ وہ گرودیو سے یومِ آزادی کا جلسہ منعقد کرنے کی اجازت دلا دے۔ میں نے پرنسپل انیل چند پر یہ بات بھی زور دے کر واضح کر دی تھی کہ اگر طلبا کو باقاعدہ اجازت نہ دی گئی تو بھی وہ یومِ آزادی منانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔'' یہ سن کر انیل چندا اپنی کرسی سے اچھل پڑا اور اپنی بیوی کو آواز دے کر کہا، ''رانی، رانی، یہاں آؤ، دیکھو یہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ اگر گرودیو آزادی کا جلسہ کرنے کی اجازت نہ دیں گے تو بھی لڑکے یہ جلسہ ضرور کریں گے۔'' پرنسپل کی بیوی یہ بات سن کر ہنس پڑی اور بولی، ''بچوں کی دل جوئی کی جانی چاہیے۔ تم ایک مرتبہ گرودیو سے ان لڑکوں کی سفارش تو کر کے دیکھو۔'' چنانچہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر انیل چندا ٹیگور سے بات چیت کر کے لوٹ آیا اور خوشی خوشی ہمیں بتایا کہ ''ٹیگور کا کہنا ہے کہ انھوں نے کالج کی حدود میں سیاسی جلسے جلوس کی پابندی صرف اس لیے لگائی ہے کہ وہ کالج کی حدود میں پولیس اور سی آئی ڈی جیسے کسی ادارے کی مداخلت برداشت نہیں کرتے۔ کیوں کہ وہ نہیں چاہتے ہیں کہ شانتی نکیتن میں پڑھنے والے طالب علموں کا سی آئی ڈی کے کارندے پیچھا کرتے پھریں اور اس طرح ان کی تعلیمی سرگرمیاں متاثر ہوں، ورنہ اصولی طور پر انھیں یومِ آزادی کے جلسے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگر طالب علم جلسہ کرنے پر مصر ہیں تو ضرور کریں لیکن انھیں یہ بات ضرور جتلا دی جائے کہ اس جلسے کے نتیجے میں اگر انھیں بعد میں کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تو اس کی تمام تر ذمہ داری خود ان پر عائد ہوگی۔''

اس اجازت کے بعد ہم دو چار دوست مل کر استادوں کی کالونی میں گئے اور ان میں سے ہرایک کو فرداً فرداً پُر جوش انداز میں یوم آزادی کے جلسے میں شرکت کی دعوت دی۔ یہ جنگِ عظیم دوم کا زمانہ تھا اور اکثر اساتذہ دن بہ دن بگڑتی ہوئی صورتِ حال سے پہلے ہی دل گرفتہ تھے کیوں کہ وہ لوگ باہر کی دنیا کے حالات اور خبروں سے ہمارے مقابلے میں زیادہ واقفیت رکھتے تھے۔

پروگرام کے مطابق جلسے والے دن صبح پانچ بجے ہی سے باوجوں، راگوں اور سازو کی گونج میں پربھات پھیری (صبح کی پریڈ) شروع ہوئی جس میں تمام اساتذہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ شریک ہوئے۔ لڑکیوں کے ہوسٹل میں مقیم طالبات کے علاوہ کلا بھون میں رہنے والے کلاکاروں نے بھی اس پریڈ میں شرکت کی۔ سب نے ایک جلوس کی صورت میں شانتی نکیتن کی اندرونی سڑکوں پر گشت کرنے کے بعد لگ بھگ آٹھ بجے ایک میٹنگ منعقد کی جس میں طے کیا گیا کہ شام کو پانچ بجے کالج کے آڈیٹوریم میں ایک ہنگامی جلسہ منعقد کیا جائے گا جس میں تمام طالب علموں اور اساتذہ کے علاوہ باہر کے مہمان بھی شریک ہوں گے اور جس میں انگریزی، بنگلہ، ہندی اور اردو میں ہندوستان کی آزادی کے حق میں تقاریر کی جائیں گی۔ چنانچہ شام کے پانچ بجے میٹنگ ہال میں خوب دھوم دھام سے جلسہ منعقد ہوا جس میں ہندوستانی طالب علموں کے علاوہ بیرونی ممالک سے آنے والے طالب علم اور اساتذہ نے بھی نہایت گرم جوشی کے ساتھ شرکت کی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس جلسے میں ڈچ، ویسٹ انڈیز (موجودہ انڈونیشیا) کے گورنر جنرل بھی شریک ہوئے تھے۔ جلسے میں دو گھنٹے سے زائد ہندی اور بنگلہ میں بہت جوشیلی تقریریں ہوئیں اور مقررین نے تحریکِ آزادیِ ہند کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ آخر میں مجھے انگریزی میں تقریر کرنے کا حکم دیا گیا کیوں کہ اس وقت وہاں کوئی ایسا طالب علم موجود نہ تھا جو انگریزی زبان میں روانی کے ساتھ اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرسکتا۔ چنانچہ میں نے دس بارہ منٹ انگریزی میں تقریر کی اور حاضرینِ جلسہ کو بتایا کہ ہم یہ جلسہ گرودیو کی اجازت کے ساتھ کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی تقریر میں ہندوستان کی آزادی کے مسئلے پر عام سیاسی جماعتوں اور گروہوں میں مکمل آزادی اور یک جہتی پر بھی زور دیا اور آج ہم سب طالب علم اور اساتذہ خواہ وہ

کسی بھی سیاسی مکتبہ خیال سے تعلق رکھتے ہوں، ہندوستان کی آزادی کے حق میں ایک زبان ہو کر متحدہ طور پر آواز اٹھا رہے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ہماری آواز کی گونج سے کوئی سرکار اپنے کان بند نہیں کر سکے گی۔''

یہ میری پہلی سیاسی اور فی البدیہہ تقریر تھی جسے عام حاضرین نے بہت بہت سراہا تھا۔ میں جب اسٹیج سے اتر کر آیا ہوں تو پسینے سے شرابور تھا حالاں کہ وہ دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں اور ہال چاروں طرف شادو، شادو (شاباش، شاباش) کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ تقریب میں شریک طالب علم اور اساتذہ اس کامیاب تقریر پر مبارک باد دے رہے تھے اور میں دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ آخر میں نے کون سی عجوبہ بات کردی ہے جس کی سب اتنی تعریف کر رہے ہیں۔ میں نے سب کچھ وہی تو کہا ہے جو ہندوستان کی آزادی سے دلچسپی رکھنے والا ہر فرد کہہ رہا ہے۔''

دیکھیے اس ایک واقعے کو سوبھو صاحب نے کس ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے اور اس اندازِ نگارش نے واقعاتی اظہار کو کس قدر موثر اور دلچسپ بنا دیا ہے! یہی اندازِ نگارش پوری کتاب میں پھیلا ہوا ہے، جس کی وجہ سے کتاب کے وہ حصے بھی جہاں کسی سیاسی یا سماجی مسئلے پر سنجیدہ بحث مباحثہ پیش کیا گیا ہے، قاری کے لیے دلچسپی کا باعث بن گئے ہیں۔ سوبھو گیان چندانی کی خودنوشت سوانح عمری ''روشنی کی راہ میں'' اس اعتبار سے منفرد ٹھہرتی ہے کہ اس میں سوبھو صاحب نے بے شمار ایسے کرداروں کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے، جن سے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ان کا سابقہ پڑا ہے اور جس میں کوئی انوکھی اور منفرد بات انھیں محسوس ہوئی ہے۔ خودنوشت سوانح عمری کی شاید ہی کوئی ایسی قسط رہی ہو، جس میں ہم ایک نہ ایک ایسے منفرد کردار سے نہ ملتے ہوں۔ سوبھو صاحب ایک چابک دست خاکہ نگار بھی ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی شخصیت کے ظاہری اور باطنی رنگوں کو کیوں کر ابھارا جاتا ہے۔ چنانچہ بچپن، لڑکپن، جوانی سے لے کر شانتی نکیتن کے دور تک انھوں نے کتنے ہی کرداروں کے دلچسپ خاکے پیش کیے ہیں۔ بچپن میں اپنی ماں، دادا اور ہم جولیوں کے تذکرے، بہت دلچسپ انداز میں کیے ہیں۔ بکھی اور قمبر کے اسکولوں کے استادوں کے ذکر اس انداز سے کیے گئے ہیں کہ ان کے پڑھنے سے ان لوگوں کی پرچھائیاں نمودار ہونے لگتی ہیں۔

شانتی نکیتن میں خود گرودیو ٹیگور کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اگر اسے یکجا کر دیا جائے تو گرودیو کا ایک دلچسپ اور حقیقت پسندانہ خاکہ ابھر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ کلکتہ، سلہٹ اور آسام وغیرہ کا جو سفر کیا تھا، اس کے اظہار میں بھی ایک ڈرامائی کیفیت موجود ہے۔ یہی نہیں

انھوں نے اس موقعے پر بنگال میں ابھرتی ہوئی نئی تحریکوں اور بنگالی قومیت کے نئے طرزِ احساس کو بھی نہایت دل پذیر انداز میں بیان کر دکھایا ہے۔ شانتی نکیتن سے واپسی کے بعد وہ لا کالج میں داخلہ لے چکے تھے لیکن وکالت کا امتحان پاس کرنے سے پہلے ہی انھیں طلبا تحریک کا لیڈر بنا دیا جاتا ہے، اس دور میں حشو کیول رامانی کا کردار ایک کمیٹڈ نوجوان دانشور کا کردار بن کر ابھرتا ہے۔ اسی طرح شیخ ایاز کے مختلف ادوار میں اس کے تاثرات اور ذہنی وفکری ارتقا کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، ان سے شیخ ایاز کی شخصیت کے بابت ایک بھرپور اجتماعی تاثر ابھرتا ہے جو حقیقت سے بہت قریب بھی ہے اور شیخ ایاز کے فن اور شخصیت کو سمجھنے کا ذریعہ بھی۔ جیل یاتراؤں کے دوران جیل کے آدرش وادی ساتھیوں میں گوبند مالھی، کیرت بابانی اور دوسرے لوگوں کے بارے میں جو تاثراتی تصویریں کھینچی گئی ہیں، ان سب میں زندگی کی حرارت اور توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جیل میں بھوپت ڈالو سے ملاقات اور اس کی شخصیت کا بھی ایک تاثر انھوں نے ابھارا ہے۔ ان کے قریبی دوستوں کے شخصی نقوش، خیالات و تصورات، عادات و اطوار اور خوبیوں اور کمزوریوں کا احوال بھی موجود ہے اور ان کے درمیان جو فکری تضادات اور کش مکش موجود رہی ہے، ان کے تجزیاتی مطالعے بھی انھوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پیش کر دیے ہیں۔ الغرض اس مختصر جائزے میں سوبھو گیان چندانی کی اس خودنوشت روئیداد کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ ایسی دلچسپ اور مایہ ناز سوانحی یادداشت اب تک کتابی صورت میں طباعت کے مراحل سے نہیں گزر سکی ہے۔ ماہنامہ ''**سوجھرو**'' اس کی اشاعت پر ضرور مبارک باد کا مستحق ہے۔

سوانحی خاکہ نگاری، سوانحی مضامین

جدید سوانحی ادب میں خاکہ نگاری کی صنف کو بطورِ خاص مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ سندھی ادب میں قیامِ پاکستان سے قبل خاکہ نگاری کے آثار کچھ زیادہ واضح دکھائی نہیں دیتے۔ اس زمانے میں زیادہ تر سوانحی نوعیت کے مضامین لکھے جاتے تھے جن میں ممدوح کے بارے میں ضروری تفصیلات اور کوائف پیش کردیئے جاتے تھے اور ضروری ہوا تو ممدوح کی زندگی کے معمولات، خیالات، تصورات اور آس پاس کے ماحول پر بھی سرسری تبصرہ کردیا جاتا تھا۔ لیکن ان میں صرف شخصیت کے روشن روشن خدوخال ہی دکھائی جاتے تھے۔ اوصاف ومحاسن کا تذکرہ کیا جاتا تھا اور ان باتوں کو ابھارا جاتا تھا جن سے ممدوح کی شخصیت کے صرف پسندیدہ پہلوؤں ہی پر نظر جاسکے۔ سوانحی واقعات وحالات کے بیان میں بھی اختصار سے کام لیا جاتا تھا۔ ایسے سوانحی مضامین شاعروں کی کلیات اور دیوانوں میں بالعموم شائع ہوتے تھے جن میں سوانحی تفصیلات کے ساتھ شاعروں کے کلام کی خوبیوں اور محاسن پر توصیفی تبصرے بھی شامل کیے جاتے تھے۔ ان مضامین میں مذکورہ شخص اور اس کی تخلیقات کے بابت علمی، ادبی اور تحقیقی رویہ اختیار کرنے کی کوشش خال خال ہی کی جاتی تھی۔ ورنہ زیادہ تر توصیفی انداز ہی نمایاں رہتا تھا کہ ان مضامین کا مقصد بھی سوانح نگاری کی بجائے دراصل تعریف وتوصیف اور تحسین وستائش ہی ہوا کرتا تھا۔ مثلاً دیوان کوڑومل چندن مل نے ''سامی جا سلوک'' مرتب کیے تو سامی کے سلوک پر اظہارِ خیال کرنے کے ساتھ ساتھ سامی کی زندگی کے حالات بھی رقم کیے ہیں۔ مرزا علی قلی بیگ نے بچل سرمست کا رسالہ ترتیب دیا تو اس میں بچل سرمست کی زندگی اور ان کے زمانے کے حالات بھی لکھے اور بچل سرمست کے بارے میں فقیروں اور عقیدت مندوں میں جو روایتیں مشہور تھیں، انھیں بھی جمع کردیا۔ اسی طرح ''دیوانِ گل''، ''دیوانِ بیکس''، ''دیوانِ قاسم''، ''دیوانِ فاضل''، ''کلیاتِ گدا''، ''دیوانِ سانگی'' وغیرہ میں متعلقہ صاحبوں کے مختصر حالاتِ زندگی بھی شامل کیے گئے ہیں۔

ابتدائی دور میں سوانحی مضمون لکھنے والوں میں دیوان کوڑومل کھلنانی، دیوان نندی رام، اخوند عبدالرحیم وفا، میاں غلام حسین، میراں محمد شاہ وغیرہ شامل تھے جب کہ بعد کے دور میں نرمل داس گربخشانی، شیوا

رام بھیروانی، عثمان علی انصاری، پروفیسر لطف اللہ بدوی، مولائی شیدائی، حکیم فتح محمد سہوانی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر علامہ محمد بن عمر داؤد پوتہ، ڈاکٹر غلام علی الانہ، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، پیر حسام الدین راشدی، ماسٹر محمد سومار شیخ وغیرہ کے مضامین میں تحقیقی وتنقیدی رویہ کارفرما رہا کرتا ہے۔

سوانحی خاکہ نگاری، سوانحی مضمون نویسی سے قدرے مختلف صنف ہے۔ یہ سوانح نگاری، مرقع نگاری اور یادداشت نگاری سے بھی جداگانہ صنف ہے جس میں ایک خاص اسلوب، مخصوص رویہ اور مقصد کارفرما رہتا ہے کہ اس میں ممدوح کی شخصیت کے ساتھ خاکہ نگار کی شخصیت اور رویے کا پرتو بھی اتر آتا ہے۔ سوانحی خاکہ نگاری میں سوانحی مضمون کی طرح نہ تو تفصیلات اور معلومات کی بھرمار کی جاتی ہے اور نہ لکھنے والے کی واضح جانب داری کو پسند کیا جاتا ہے۔ ہر چند اس مقبولِ عام صنف کی اب تک کوئی جامع تعریف متعین نہیں ہوسکی ہے لیکن بالعموم یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک تاثراتی تحریر ہوتی ہے جو ممدوح اور خاکہ نگار کے درمیان موجود شخصی تعلق اور جذباتی رشتوں کے تاثر سے وجود پاتی ہے۔

عمدہ اور معیاری خاکوں کے مطالعے سے جو چند خصوصیات اس صنفِ سوانح کی بابت متعین کی جاسکتی ہیں، وہ درجِ ذیل ہیں:

۱۔ شخصی خاکہ سوانحی مضمون ہی کی ایک شکل ہے جس میں شخصیت کے ان نقوش کو اجاگر کیا جاتا ہے جن کے تاثراتی امتزاج سے کسی کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔

۲۔ شخصی خاکہ نہ تو کسی فرد کی مکمل داستانِ حیات ہوتی ہے اور نہ سوانح عمری کا نعم البدل۔ اسے ایک مکمل تصویر کی بجائے قلمی پورٹریٹ کی آؤٹ لائن سمجھنا چاہیے۔ یہ ممدوح اور خاکہ نگار کے درمیان جذباتی رشتوں کا تاثراتی اظہار بھی ہوتا ہے۔

۳۔ شخصی خاکے میں ممدوح کے ایسے سوانحی کوائف شامل کیے جاتے ہیں جن کی مدد سے اس کے تشخص، حلیے، عادات واطوار، رہن سہن، ماحول، چال چلن اور کردار کے نقوش ابھر سکتے ہیں اور پڑھنے والے پر اس کی ذات وصفات روشن اور نیم روشن گوشے اجاگر ہوجاتے ہیں۔

شخصی خاکہ ایک ساکت فوٹو کی بجائے ایسا قلمی اسکیچ ہوتا ہے جس میں ممدوح کی شخصیت کے خدوخال، رہن سہن، چال ڈھال، روزمرہ مشاغل، طبیعت ومزاج، اخلاق ومعائب، محاسن ونقائص، ذوق وشوق، لین دین وغیرہ کا متحرک عکس اتر آتا ہو اور ممدوح کا تشخص قائم کیا جاسکے۔ ساتھ ہی ساتھ خاکہ نگار کے ساتھ اس کے ذاتی تعلق وروابط کی نوعیت کا بھی اندازہ ہوسکے۔ ایک اچھے سوانحی خاکے کو لازمی طور پر بہترین اسلوبِ نگارش اور دلچسپ پیرایۂ اظہار کا حامل ہونا ہی چاہیے اور حقیقی صورتِ حال کو فنی چابک دستی سے فکشن کی طرح حیرت آشنا بنا دینا، ایک خاکہ نگار کا کمالِ فن ہوا کرتا ہے۔

سوبھوگیان چندانی نے افسانہ نگاری اور مضمون نگاری کے ساتھ بعض سوانحی مضامین اور سوانحی خاکے

بھی لکھے ہیں جن میں ممدوح کی شخصیت کے ساتھ اس ماحول اور گردوپیش کی صورت گری بھی کی گئی ہے جس نے ممدوح کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سوبھو صاحب کے لکھے ہوئے خاکوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، جب تک انھیں خصوصی طور پر یک جا جمع نہ کرلیا جائے۔ کیوں کہ انھوں نے بعض سوانحی خاکے اور مضامین فرمائشی طور پر بھی لکھے ہیں جو مختلف کتابوں میں بطور دیباچہ شامل کیے گئے ہیں۔ بعض مضامین مشاہیر پر شائع ہونے والے یادگاری مجلوں اور مخزنوں میں چھپے ہیں اور بعض ابھی تک غیر مطبوعہ صورت میں ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ جی ایم سید، حیدر بخش جتوئی، سید جمال الدین بخاری، محمد عثمان ڈیپلائی، ذوالفقار علی بھٹو، حسن ناصر، قاضی فیض محمد، فتح اللہ عثمانی، شیخ ایاز اور ایاز قادری، ڈاکٹر اعزاز نظیر، رشید بھٹی وغیرہم پر ان کی تحریریں "مہیں سندھ" اور "عوامی آواز" کے صحافتی کالموں میں موجود ہیں جنھیں اگر ایک جگہ مرتب کردیا جائے تو سندھ کی نصف صدی کی سیاسی تاریخ کے بہت سے گوشے روشن ہوسکتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ عبید کٹپر صاحب نے ان کے لکھے ہوئے اکیس خاکوں اور سوانحی مضامین کو ایک کتاب "وڈي وٿ ھنام" کے نام سے مرتب کردیا ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس کتاب میں جو خاکے شامل ہیں، ان میں سے اکثر خاکے ایسے لوگوں پر لکھے گئے ہیں جو سماجی اعتبار سے نہ صرف گم نام ہیں بلکہ زندگی کے بیرونی حاشیے سے بھی باہر بسنے والے بے خانماں برباد اور غریب لوگ ہیں جنھیں عام زندگی میں نہ تو ان کے ناموں سے پہچانا جاتا ہے اور نہ ان کے نام سے ایسے اہم اور قابلِ ذکر کارنامے ہی منسوب ہیں جنھیں سماجی مؤرخ اپنی شہ سرخیوں میں نہ سہی، بین السطور ہی میں کہیں شامل کرنے کا روادار ہو۔ لیکن یہ فراموش کردہ لوگ بھی زندگی میں کوئی نہ کوئی عملی کردار ادا کرتے ہی ہیں اور اپنے حقیر ترین کاموں سے بھی سائٹی کو کچھ نہ کچھ سوغات ایسی عطا کر جاتے ہیں جو بہت بڑے بڑے مال دار لوگوں، عالموں اور قابلِ ذکر ہیروؤں سے بھی ممکن نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کی روزمرہ کی زندگی بے وقعت ٹھہرادی جاتی ہے اور ان کے کردار پر اتنی دھول جم جاتی ہے کہ ان کے اصل نقش و نگار بھی نہیں پہچانے جاتے۔ سوبھو گیان چندانی نے بیشتر ایسے بے وقعت اور غیر اہم لوگوں ہی کو اہمیت دی ہے اور ان کو اپنا موضوع بنا کر ان کی شخصیت پر جمی ہوئی بے اعتنائی کی گرد کو جھاڑ کر ان کے چمکتے ہوئے نقش و نگار روشن کر دکھائے ہیں۔ اس کتاب میں نصف سے زیادہ خاکے ایسے ہی لوگوں پر لکھے گئے ہیں جن میں جیل میں متعین برداشتی بھی شامل ہیں اور سلطان ڈرائیور بھی۔ مائی دھیانی، خالقو، ارباب فقیر، عبدالکریم بجلی وغیرہ کے خاکے بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ محمد امین کھوسو، محمد ابراہیم جویو، پیکر نقوی، عبدالفتاح میمن، کامریڈ عزیز سلام بخاری وغیرہ پر لکھے گئے خاکوں کی مدد سے قیامِ پاکستان کے بعد سندھ کی سماجی اور ادبی تاریخ کے بعض خطوط متعین کیے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان کی معروف فلمی شخصیت اور قیامِ پاکستان سے قبل سندھ میں بائیں بازو کی

سیاست کے اہم رہنما ای کے ہنگل کے علاوہ گلی سدارنگانی، کرشن کھٹوانی، سوامی انگد یو اور کوڑومل وغیرہ کے خاکے چالیس کی دہائی کے رفقا اور شریک ساتھیوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں جن میں نہ صرف ان لوگوں کے چلتے پھرتے کرداروں کے نقوش ابھرے ہیں بلکہ ان کے اردگرد موجود فضا بھی پیدا کی گئی ہے۔ غرض یہ سب خاکے الگ الگ اور جداگانہ کرداروں کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جن سے سوبھو صاحب کو یک گونا قربت اور دوستی رہی ہے اور چند ایسے بھی ہیں جن سے کوئی خاص بے تکلفی کا پتا نہیں چلتا۔ لیکن جنھوں نے سوبھو صاحب کو کسی نہ کسی عنوان متاثر کیا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں پر لکھے گئے خاکوں میں نسبتاً تکلفانہ فاصلہ بھی موجود رہا ہے۔ مذکورہ بالا خاکوں کے علاوہ سوبھو صاحب کی خودنوشت سوانح عمری میں بھی جو ماہنامہ ''سوجھرو'' میں بعنوان ''روشنی کی راہ میں'' قسط وار شائع ہو چکی ہے، کئی مقامات پر اور کئی لوگوں کے نہایت مؤثر اور دلچسپ قلمی خاکے لکھے ہیں جن کی اپنی انفرادی حیثیت بھی ہے اور جنھیں سوانحی عمری سے قطع نظر ایک قلمی خاکے کے طور پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ مثلاً ٹیگور کی بابت لکھے گئے حصے میں خاکہ نگاری کے جوہر موجود ہیں جنھیں یکجا مرتب کر کے ٹیگور کا مکمل اور مؤثر سوانحی خاکہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح لیکھو تلسانی، گوبند مالھی، شیخ ایاز، بھوپت ڈاکو غیرہ سے متعلق یادداشتوں سے سوانحی خاکے بھی مرتب کیے جاسکتے ہیں۔ سوبھو صاحب کی یہ منتشر تحریریں جداگانہ توجہ چاہتی ہیں۔

چند اہم خاکے

گرودیو ٹیگور

یہاں سب سے پہلے ہم گرودیو رابندرناتھ ٹیگور کے بابت لکھی گئی یادداشتوں کا تذکرہ کرنا چاہیں گے جن سے ٹیگور کے مکمل خاکے کے خطوط ابھر آتے ہیں۔ یہ خطوط سوبھو صاحب کی خودنوشت سوانح عمری میں بھی ہیں اور ایک جداگانہ مضمون جو ''شانتی نکیتن میں'' کے عنوان سے سوبھو صاحب کے اعزاز میں ممبئی سے شائع ہونے والی کتاب ''سویہ ساچی ـــ سوبھو'' میں شامل کیا گیا ہے۔ ہماری دانست میں سوبھو صاحب کی مندرجہ بالا تحریروں سے گرودیو ٹیگور کا مکمل خاکہ ابھر آتا ہے۔ اس میں سوبھو صاحب اور ٹیگور کے درمیان جو ذہنی و جذباتی رشتہ موجود رہا ہے۔ اس کی آنچ بھی محسوس کی جاسکتی ہے اور ٹیگور کی شخصیت میں موجود تلون مزاجی کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ کاش یہ پورا خاکہ یہاں پیش کیا جاسکتا! ہم صرف اس سوانحی خاکے کے خلاصا پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں۔

"گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور ۷ رمئی ۱۸۶۱ء کو کلکتے میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک برہمن زادے تھے اور ان کے جاگیردارانہ متمول خاندان کو بنگلہ سماج میں کئی پیڑھیوں سے کافی اثر ورسوخ حاصل رہا تھا۔ ان کے والد مہارشی دیوندرا ناتھ ٹیگور تھے جو بنگال کے ہندوؤں میں خاص طور پر بہت بااثر اور مقبول تھے۔"

سولھویں صدی کے اواخر ہی سے بنگال میں ایسی تحریکیں پیدا ہونا شروع ہوگئی تھیں جو خاص طور پر ہندو سماج میں دوررس اصلاحات کی خواہش مند تھیں۔ انگریزوں اور دوسری مغربی اقوام کو بنگال میں خاطر خواہ کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں۔ اور ان کے نئے طریق زندگی نے بھی بنگالی سماج کے صاحبان فکر ونظر کو متاثر کیا تھا اور نتیجے میں قدامت پسندی کے خلاف برہمو سماج کی تحریک کی جڑیں دور تک پھیلتی جاتی تھیں۔ راجا رام موہن رائے نے بنگالی ہندوؤں میں نئی تعلیم کا جو شعلہ جلایا تھا، اب اس کی روشنی دور دور تک پھیل چکی تھی۔ برہمو سماج کی تحریک قدامت پسندیت، بے بنیاد مذہبی اوہام پرستی اور غیر منطقی رسوم و رواج کے خلاف ایک انقلاب آفریں تحریک تھی۔ برہمو سماج والے چاہتے تھے کہ ہندومت کے بنیادی تصورات اور عقائد کو بدلے بغیر لوگوں کو اپنے اردگرد معروضی صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے اپنے رہن سہن اور طرزِ فکر میں ایسی تبدیلیاں کرنی چاہییں جو انھیں جدید زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرسکے، یعنی مذہب کی اندھی اور کورانہ تقلید کے بجائے تعقل پسندیت کو اپنایا جانا چاہیے۔

جدید انگریزی تعلیم اور سائنسی نکتۂ نگاہ کا فروغ اس تحریک کے بنیادی مقاصد میں شامل تھے۔ اس زمانے کی دوسری بڑی تحریک بنگلہ زبان اور ادب میں جمود اور روایت پسندیت کے خلاف شروع ہوئی تھی جس کے بانی اور روحِ رواں بنکم چندر چٹرجی تھے۔ یہ ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، موسیقاروں، بت تراشوں اور مصوروں سے تقاضا کرتی تھی کہ وہ قدیم روایتی اندازِ فکر اور اسلوبِ اظہار کو ترک کرکے اپنی تخلیقات کو زندگی کی سچائیوں اور حقیقت کا آئینہ اور امین بنائیں اور اپنے قلم و موقلم کو جھوٹی اور غیر موثر نقالی کی بجائے انسانی معاشرے کی ترجمانی کے لیے استعمال کریں۔ جدت طرازی اور تازہ کاری اس تحریک کے بنیادی مقاصد تھے جس کے تحت بنگالی زبان کے لکھنے والوں کو دوسری عالمی زبانوں کے ادب اور فنون کے مطالعے کی ترغیب بھی دیتی تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں برطانوی حکمرانوں کے خلاف قومی آزادی کی تحریکوں نے جنم لینا شروع کردیا تھا۔ راجا رام موہن رائے کی تحریک کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لوگ قدامت پسندیت کی بجائے جدید طرزِ فکر اختیار کریں اور خود کو انگریزی تعلیم اور سائنٹفک نکتۂ نگاہ سے لیس کریں۔ نئی ایجادات واختراعات کو کام میں لاتے ہوئے برطانوی حکمرانوں سے نجات کے راستے تلاش کریں۔ چنانچہ نئی تعلیم کی روشنی نے بنگال کے عوام کو نیا جمہوری اندازِ فکر بھی دیا اور زندگی کے بارے میں روشن خیالی اور وسیع النظری بھی بخشی جس کے تحت ان میں قومی

حمیت اور آزادی کے تصورات نے بھی جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ غرض یہ دورہ وہ تھا جب پورا ہندوستانی معاشرے اور بالخصوص بنگال ہمہ گیر تبدیلیوں سے دوچار تھا۔ نئے خیالات، نئے تصورات، نئے علوم، نئی روشنی اور نئی امنگوں نے نئی نئی توقعات بھی پیدا کر رکھی تھیں۔

اس ماحول میں ٹیگور جیسے بلند پایہ تخلیق کار کا ظہور بنگلہ زبان و ادب کے لیے نیک فال ثابت ہوا۔ یوں رابندر ناتھ ٹیگور کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی کرشمہ سازی (Chrismatic Inflame) کا عنصر نمایاں تھا۔ ٹیگور بنگلہ زبان کے عظیم ترین شاعر، ڈرامانگار، کہانی کار، ناول نویس، مصور اور موسیقار تو تھے ہی لیکن اس کے علاوہ نہایت وسیع المطالعہ فلسفی، مفکر اور دانشور بھی تھے۔ عہد جدید میں وہ پہلے شخص تھے جو ہندوستان کے ویدانتی تصورات اور برہمو سماج میں نہایت دور رس تبدیلیوں کے خواہاں اور پرچارک تھے۔ ہر چند عملی سیاست میں ان کا کردار محدود رہا ہے لیکن اس کے باوجود ہندوستانی سیاست پر ان کے خیالات اور شخصیت کے اثرات نہایت گہرے رہے ہیں، خاص طور پر ہندو قوم پرست سیاست سے وابستہ اہم ترین اشخاص شانتی نکیتن اور گرودیو کی کشش اور حصار سے باہر نہ تھے۔ وہ پہلے ایشیائی شخص تھے جن کو ان کے غیر معمولی اعجازِ فن اور ندرتِ کمال کی بنا پر ۱۹۱۳ء میں نوبیل انعام حاصل ہوا تھا جس کے بعد انھیں عالمی دانشوروں کی صف میں ممتاز مقام حاصل ہو گیا۔

یوں تو رابندر ناتھ ٹیگور کم عمری ہی سے شاعری کر رہے تھے اور ۱۸۹۰ء میں ان کی شاعری کا مجموعہ Mansi شائع ہوا تھا جس میں اولین دور کی سماجی، سیاسی اور رومانی نظمیں شامل تھیں، ان کے لب و لہجے اور اندازِ فکر کو بنگلہ شعر و ادب میں جو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی، وہ ان سے پہلے کسی اور کو مقدور نہ ہوئی تھی۔ وہ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ علم و ادب اور تخلیقِ فن کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا رہا ہو جس میں انھوں نے غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ ان کی عظیم کتاب 'گیتا نجلی' کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی تھی اور انگریزی کے علاوہ دنیا کی تمام اہم زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ اردو میں ٹیگور کی تخلیقات کا ترجمہ کرنے والوں میں عبدالمجید سالک، اختر حسین رائے پوری اور عبدالعزیز خالد قابلِ ذکر ہیں۔ ٹیگور اپنی زندگی ہی میں عالم گیر شہرت کے مالک، ایک لیجینڈ اور قومی سطح پر مہاکوی اور گرودیو بن چکے تھے۔ ہر چند معروف معنوں میں وہ اسکالر، فلسفی اور عالم نہیں تھے اور نہ کسی مستند درس گاہ سے تعلیمی سند پائی تھی لیکن وہ ایسی زبردست تخلیقی صلاحیتوں اور غیر معمولی قوتِ متخیلہ، دانش، شعور، استدراک اور تجزیاتی انجذاب کے مالک تھے جو بہت کم لوگوں کو ودیعت ہوتی ہیں۔ انھوں نے ذاتی کوششوں سے مختلف تہذیبوں کی تاریخ اور مذاہب کے درمیان کارفرما مخلوط عناصر کا بغور مطالعہ کیا تھا اور پُرامن عالمی معاشرے کے قیام کو اپنا نصب العین تصور کرتے تھے۔ ٹیگور نے اپنی زندگی ادب اور فنون کی ترقی کے لیے وقف کرنے کے ساتھ بنگلہ معاشرے کی بہبود اور ترقی کی متعدد تحریکوں سے بھی خود کو وابستہ

کر رکھا تھا۔ فطرت پرستی سے غیر معمولی انہماک نے ان کی شاعری میں بے پناہ نغمگی، حساسیت، پُر اسراریت اور وسعت پیدا کردی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری ہو کہ نثری تخلیقات، جن میں ناول، ڈرامے اور کہانیاں شامل ہیں، سب کو نہ صرف بنگالی زبان میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ ان کی بنگلہ تحریروں کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں مقبول ہوئے اور خاص طور پر ہندوستان کی کم و بیش تمام زبانوں کے ادب میں ٹیگور کے اندازِ نگارش کی پیروی کو بطور عصری رجحان اپنایا گیا۔ خود اردو فکشن میں 'ٹیگوریت' ایک جداگانہ اسلوبِ نگارش کے طور پر رائج ہوئی تھی۔ چنانچہ ہندوستانی ادبیات پر رابندر ناتھ ٹیگور کے اثرات نہایت ہمہ گیر رہے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، رابندر ناتھ ٹیگور صرف ادیب، شاعر اور دانشور نہیں تھے بلکہ فنونِ لطیفہ کے دوسرے شعبوں میں بھی یکساں دلچسپی رکھتے تھے۔ مثلاً انھیں رقص، موسیقی، سنگ تراشی اور مصوری سے بھی انہماک رہا ہے۔ غرض مصوری اور سنگ تراشی ہو کہ موسیقی، ہر طرزِ اظہار میں ان کا ایک خاص اسلوب اور انداز تھا۔ بقول سجاد ظہیر ان کی نظموں میں سنہری تخیل، لطیف دردانگیزی اور میٹھے خواب آور سروں سے معمور حسین و جمیل دنیا میں ہر ہندوستانی نوجوان کے لیے ایک خاص کشش اور اپیل تھی۔ وہ ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک کے لیے درمندانہ ہمدردی رکھتے تھے اور ان کی شاعری میں وطن پرستی اور حریت کے جذبات کی آنچ بہت مدھم مگر بہت موثر انداز میں ظہور پاتے ہیں۔ ان کی نظمیں، گیت اور کہانیاں دیکھتے دیکھتے ہندوستان اور اس کے باہر مقبول ہو جاتے تھے۔ بے شک ٹیگور نے بیسویں صدی کے ہندوستانی ذہن، طبقوں، مفکروں، سیاست دانوں اور طالب علموں پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے تھے اور ایک عالم ''ٹیگوریت'' کے حصار میں بند دکھائی دیتا تھا۔

ٹیگور برہمو سماج میں دور رس تبدیلیوں کے خواہاں تھے۔ وہ چاہتے تھے ہندوستان کو مذہبی اوہام پسندیت اور ماضی پرستی سے باہر نکال کر جدید سائنٹفک نظریوں اور خیالات اور تصورات سے ہم آہنگی کی طرف بڑھنا چاہیے۔ وہ برہمو سماج کی پرانی ریت، رسم و رواج اور عقائد میں وسیع تبدیلیاں لانا چاہتے تھے لیکن کسی انقلابی طریقہ کار کے ذریعے مذہبی تصورات اور رسومات کو یکسر منہدم کرنے کے قائل نہ تھے بلکہ وہ یہ نتائج ویدانتی فلسفے کی جدید تعبیر اور تفہیم کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کلاسیکل ویدانیاتی تصورات کے مطابق کائنات اور عالمِ موجود کے تین بنیادی مظاہر ہیں۔ اوّل ''ست'' یعنی عالمِ موجودات، تمام مادّی وجود برہما۔ دوم ''چت'' (ذہن، شعور، استدراک)، سوم ''آنند'' (جذب و جدان)۔ اس بات کا مطلب غالباً یہ ہے کہ موجودات اور مظاہرِ فطرت کی مکمل آگہی اور قوانینِ فطرت کا شعور حاصل کیے بغیر کوئی انسان روحانی آنند اور سکون حاصل نہیں کر سکتا۔ روحانی آسودگی کے حصول کے لیے لوگ ریاضت اور عبادت کے طور طریقے اختیار کرتے تھے اور ایک دن آتا کہ انھیں روشنی حاصل ہو جاتی اور فطرت کے خوابیدہ رازوں کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ ٹیگور نے فطرت اور قوانینِ فطرت کے

بابت ان مروّجہ غیر منطقی تصورات کی نئی تعبیریں پیش کی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ:

(۱) فطرت کے تمام مظاہر، تمام موجودات اور نئی نئی دریافتیں اور تسخیر کائنات کے سب طور طریقے ویدانیاتی ''ست'' کا روپ ہیں۔

(۲) مظاہرِ فطرت کے سب روپ اور سب موجودات ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود اندورنی قوانین کے تابع رہ کر ہمہ وقت تغیر وتبدل سے دوچار ہیں۔ موجودات کی اصلیت اوران میں وقوع پذیر تبدیلیوں کو جدید سائنسی علوم اور تجربوں کے توسط سے دریافت کیا جاسکتا ہے۔

مظاہرِ فطرت کو محض فطرت سے قریب ہوکر بازیافت نہیں کیا جاسکتا بلکہ فطرت کے پوشیدہ رموز کو علوم اور تجربوں کے توسط سے زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ اور آج کے عہد میں یہی ''چت'' کی منزل ہے۔ اور جب ہم مظاہرِ فطرت کو سمجھ لیتے ہیں اوران میں وقوع پذیر ہوتی ہوئی تبدیلیوں کے رموز کو اپنے علم کے بل پہ جان لیتے ہیں تو یہ کارگہِ عالم ہماری رفیق بن جاتی ہے جسے عام انسان کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرکے ہم وہ روحانی شانتی، سکون اور راحت پاتے ہیں جسے قدیم ویدانتی اصطلاح میں 'آنند' کا نام دیا گیا ہے۔ یہی وہ بنیادی تصورات تھے جو شانتی نکیتن کی اساس بھی ہیں۔ عالمی سطح پر ٹیگور کی شہرت دراصل مرہونِ منّت تھی نوبیل انعام کی جو انھیں ۱۹۱۳ء میں ان کی شاعری کی کتاب ''گیتا نجلی'' پر ملا تھا۔ ان کا مخصوص اندازِ نگارش ٹیگوریت کے نام سے جانا گیا جس کے اثرات ہندوستانی ادبیات پر بھی ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب ''گیتا نجلی'' کو ہندوستان کی کم وبیش سب زبانوں میں منتقل کیا جاچکا تھا۔ سندھی میں رابندر ناتھ ٹیگور پر سب سے پہلا مضمون بھی سوبھو صاحب نے لکھا تھا جو غالباً ٹیگور پر اردو اور انگریزی میں دستیاب معلومات کی بنیاد پر لکھا گیا تھا۔ یہ این جے وی ہائی اسکول کے پرنسپل ہنگورانی کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا اور ہنگورانی نے اس مضمون پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے انھیں ایک کتاب بھی بطور انعام دی تھی۔

ٹیگور کی شخصیت بہت پُرکشش اور جاذبیت کی حامل تھی، ہندوستان کی ہر اہم سیاسی، سماجی، علمی، ادبی شخصیت ٹیگور سے ملنے کشاں کشاں چلی آتی تھی۔ سوبھو صاحب بتاتے ہیں کہ اکثر لوگ تو ان کے آشرم میں قیام ہی کو باعثِ تسکین سمجھتے تھے۔ یہیں ہم نے چیانگ کائی شیک، سومیندر ناتھ ٹیگور، یوسف مظہر علی، مہاتما گاندھی، سبھاش چندر بوس، خان عبدالغفار خاں، ابوالکلام آزاد، انڈونیشیا کے گورنر جنرل ہولٹ کو دیکھا تھا۔ کبھی جاپان اور چین کے فن کار، ادیب اور مصنف ملنے چلے آرہے ہیں اور کبھی یورپ کا کوئی وفد گرودیو سے ملنے کا متمنی ہوتا تھا۔ ایک قطار لگی رہتی تھی اور لوگ بس چند لمحے کے لیے ہی اس مہان شخصیت کو دیکھنے، ملنے اور بات کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ اس پس منظر میں وہ لوگ جن کے درمیان گرودیو چوبیس گھنٹے موجود ہوتے تھے، اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے میں حق بہ جانب تھے۔ یہ ٹیگور

کے عروج کا زمانہ تھا۔

گرودیو اپنی خاموش طبعی کے باوجود بعض اوقات ایسے اقدام کر جاتے تھے جن سے ان کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوتا تھا اور ہندوستان کی تحریک آزادی کو بھی تقویت ملا کرتی تھی۔ چنانچہ جب جاپان نے چین پر حملہ کیا تو انھوں نے جاپانی شاعر 'ناگوچی' کو سولہ صفحات پر مشتمل نہایت پُرجوش خط لکھا اور اسے جاپان کی سامراج دوستی کے خلاف اقدام کرنے پر اکسایا۔ اسی طرح جب انھوں نے ''سر'' کا خطاب لوٹایا تو وہ ہندوستان بھر کے ''ڈارلنگ'' بن گئے اور کرپس مشن کی ناکامی کی صورت میں ٹیگور نے انگلستان کے بادشاہ اور پارلیمنٹ کے چیئرمین کو جو خطوط لکھے تھے، ان کے تحریکِ آزادی پر غیر معمولی اثرات مرتب ہوئے تھے۔ ٹیگور علم وادب کے آدمی تو تھے ہی لیکن مختلف فنون سے بھی انھیں غیر معمولی دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ وہ ایک بہت عمدہ اور مشاق ڈانسر تھے۔ سنتے ہیں اپنی جوانی میں بے تکان اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے اور کئی ڈراموں میں بھی اپنی رقاصی اور اداکاری کے جوہر دکھا چکے تھے۔ ستر سال کی عمر میں موسیقی کا جنون سمایا تو مشرقی ومغربی موسیقی کے اختلاط سے ایک نئی طرز ایجاد کی جو ٹیگور اسکول آف میوزک کہلائی۔ غرض جس میدان میں دیکھیے ٹیگور اور ٹیگوریت کے طلسماتی اثرات عالم گیر سطح پر کارفرما نظر آتے ہیں۔

آخری عمر میں ٹیگور کسی قدر رزود رنج ہو گئے تھے اور اپنے آپ کو چند مخصوص کاموں تک محدود کر لیا تھا۔ انھیں وہ عوامی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی کہ لوگ انھیں ''اوتار سمان'' سمجھنے لگے تھے۔ ہر چند وہ بنگال کے ایک جاگیردار اور خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور دولت ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن انھوں نے اپنی دولت کا بیشتر حصہ علوم وفنون، تہذیب وثقافت، امن وامان اور عالمی انسانی اقدار کے فروغ کے لیے صرف کیا تھا۔ وہ کلاسیکل مزاج کے آدمی تھے اور اشرافیت کا ایک خاص تصور ان کی زندگی پر حاوی رہا ہے۔ عمر کے آخری حصے میں جب سوبھوگیان چندانی گرودیو سے ملے ہیں، اس وقت ان کے طرزِ احساس پر ایک نوع کی ویدانتی اثرات، تھکن اور بے ثباتی وغیرہ کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے جو طویل العمری کا فطری تقاضا بھی ہو سکتا ہے لیکن اس عمر میں بھی وہ ہندوستانی معاشرے میں کسی مثبت تبدیلی کے خواہاں تھے جس کا اندازہ ان کے اس پیغام سے ہوتا ہے جو انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی اردو ہندی کانفرنس (۱۹۳۸ء، منعقدہ الہ آباد) کے لیے دیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا:

> ''عزلت پسندی میری طبیعتِ ثانیہ ہو گئی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سماج سے الگ تھلگ رہنے والا ادیب بنی نوع انسان سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ بہت سے لوگوں سے مل کر جو تجربہ حاصل ہوتا ہے، الگ رہ کر ادیب اس سے محروم ہو جاتا ہے۔ سماج کو جاننے پہچاننے کے لیے اس کی ترقی کی راہ کا پتا دینے کے

لیے ناگزیر ہے کہ ہم سماج کی نبض پر ہاتھ رکھیں اور اس کے دل کی دھڑکنیں سنیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم انسانیت کے غم گسار اور ہمدرد ہو جائیں۔

انسان کی روح صرف اسی صورت میں ہم پہچان سکتے ہیں۔ ظاہر ہے عوام سے الگ رہ کر ہم ہنگامہ محض رہ جائیں گے۔ نئے ادیبوں کو انسانوں سے مل جل کر انھیں پہچاننا ہے۔ میری طرح گوشہ نشین رہ کر کام نہیں چل سکتا۔ زمانہ دراز تک سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں میں نے بڑی غلطی کی ہے۔ اب میں اس غلطی کو سمجھ گیا ہوں اور اسی لیے یہ نصیحت کر رہا ہوں۔ میرے شعور کا تقاضا ہے کہ جو ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہوگا تو وہ ناکام اور نامراد رہے گا۔ یہ حقیقت میرے دل میں چراغ کی طرح روشن ہے اور کوئی استدلال اسے بجھا نہیں سکتا۔

آج ہمارا ملک ایک لق ودق صحرا ہے جس میں شادابی اور زندگی کا نام ونشاں تک نہیں ہے، ملک کا ذرہ ذرہ دکھ کی تصویر بنا ہوا ہے، ہمیں اس غم واندوہ کو مٹانا ہے اور ازسرِنو زندگی کے چمن میں آبیاری کرنا ہے۔ ادیب کا فرض ہوتا ہے کہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے، بیداری اور جوش کے گیت گائے، ہر انسان کو امید اور مسرت کا پیغام سنائے اور کسی کو ناامید اور ناکارہ نہ ہونے دے۔ ملک اور قوم کے بہی خواہی کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینے کا جذبہ ہر چھوٹے بڑے میں پیدا کرنا، ادیب کا فرضِ عین ہونا چاہیے۔ قوم، سماج اور ادب کی بہبودی کی سوگندھ جب تک ہر انسان نہ کھائے گا، اس وقت تک دنیا کا مستقبل روشن نہیں ہو سکتا۔ اگر تم یہ کرنے کے لیے تیار ہو تو تم کو پہلے اپنی متاع کھلے ہاتھوں لٹانی ہوگی اور پھر کہیں تم اس قابل ہوگے کہ دنیا سے کسی معاوضے کی تمنا کرو، لیکن اپنے کو مٹانے میں جو لطف ہے اس سے تم محروم نہ رہ جاؤ۔

یاد رکھو، تخلیق ادب بڑے جاں جوکھوں کا کام ہے، سچائی اور حسن کی تلاش کرنا ہے تو پہلے انا اور خود پرستی کی کینچلی کو اتار دو۔ پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف، روشنی کتنی سہانی اور پانی کتنا لطیف ہوتا ہے۔" (روشنائی، صفحہ ۱۹۱ تا ۱۹۹)

والدہ کا سوانحی خاکہ

سوبھو صاحب نے اپنی والدہ کا سوانحی خاکہ "امڑ" (امڑ) (ماں) کے نام سے لکھا ہے۔ خاکہ کیا ہے، ممتا کی چلتی پھرتی تصویر کھنچ گئی ہے۔ ان کے ایک ایک فقرے اور ایک ایک جملے میں اس محبت اور پیار کی خوشبو بسی ہوئی ہے جو انھوں نے اپنی ماں کے کردار سے کشید کی ہے۔ ماں کی سنائی ہوئی لوریاں

آج بھی ان کے کانوں میں رس گھولتی ہیں اور لڑکپن میں اماں نے جھولے پہ بٹھا کے جو جھونکے دیئے تھے، اس کے ایک ایک جھونکے کی یاد نے انھیں زندگی کے حسین ترین لمحات کی سیر کرادی ہے اور وہ اس بات پر کفِ افسوس ملتے ہیں کہ آج کی نئی نسل کے بچے ماں کی لوری سے محروم ہیں اور وہ گھر کے ماحول میں گندھی ہوئی اس محبت کی سرشاری کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے جو ماں کی ممتا سے لبریز ہوا کرتی تھی کہ آج کی نوجوان مائیں روایتی ممتا کا روگ ہی نہیں پالتیں کہ ان کا زیادہ وقت ٹیلی وژن کے سامنے گزرتا ہے اور بچے کو بھی ٹی وی کے سامنے ہی رُولتے ہوئے چھوڑ دینا پسند کرتی ہیں، اللہ اللہ خیر صلا۔ اگلے وقتوں میں مائیں تھیں کہ خود اپنی نیند اپنی راحت اور اپنا سکھ چین نثار کر کے بچوں کی پرورش کرتی تھیں اور انھیں موسم کی شدت سے محفوظ رکھنے کے ہزار جتن کیے جاتی تھیں، گھنٹوں پنگوڑے میں جھولا جھلاتی رہتیں کہ بچہ گرم رُتوں سے بے نیاز سکون کی نیند سو سکے۔

انھوں نے اپنی ماں کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اماں بہت محنتی اور جفاکش تھیں، ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی تھیں۔ انھیں آرام سے ٹک کر بیٹھنے کی مہلت کم ہی ملتی تھی۔ ہم اسکول سے میل بھر کا سفر طے کر کے پاپیادہ گھر لوٹتے تو وہ سب سے پہلے ہمیں نہلا دھلا کر کھانا کھلاتیں، پھر پنگوڑے میں بٹھا کر ہلکی پھلکی پینگیں دیتیں اور اپنی مدھر میٹھی آواز میں ہولے ہولے لوریاں سناتیں، ان کی آواز کی مدھرتا اور جھولے کی لہروں میں نہ جانے کیا سحر تھا کہ اب بھی یعنی اس بڑھاپے میں بھی بچپن سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔''

ایک اور جگہ لکھا ہے

> ''ماں اکثر چکی بھی پیستی تھیں۔ ایک ہاتھ سے وہ گندم یا جوار چکی میں ڈالتی جاتیں، دوسرے ہاتھ سے چکی کا پاٹ چلائے جاتیں۔ میں شرارت سے چکی سے باہر نکلنے والے آٹے کی مٹھی مٹھی بھر کر ہوا میں اچھالتا رہتا، ماں کبھی مجھے بائیں ہاتھ اور کبھی دائیں ہاتھ سے روکتی رہتی تھیں، کبھی آٹا سمیٹنے لگتیں۔ بس یہ سب کام ساتھ ساتھ چلے جاتے تھے اور کسی کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہو پاتی تھی۔ جیسے چکی کی گھر گھر چلنا ہو کہ میری قلقاریوں بھری شرارت کے ساتھ مٹھی بھر بھر کر آٹا اچھالنا۔ سب ایک ہی مشغلے کا حصہ تھے۔ زندگی کتنی سادہ مگر کتنی مربوط اور دلچسپ تھی؟!''

سوبھو صاحب نے بتایا:

> ''ان کی والدہ ایک سیکولر سوچ والی خاتون تھیں یعنی انھیں چھوت چھات کی کبھی

کوئی فکر نہ ہوئی تھی۔"

انھوں نے مزید بتایا:

"ہم دونوں بھائی بچپن میں اکثر و بیشتر" مائی دھیانی" کے پاس رہا کرتے۔ اس کے گھر کے پلنگوڑے میں پڑے رہتے، مائی دھیانی جو ایک مسلمان غریب عورت تھی، اماں کی خاص سہیلی تھی۔ پڑوس میں ایک مائی حلیمہ بھی رہتی تھیں۔ مائی حلیمہ کا چہرہ مہرہ، حلیہ، چال ڈھال اماں سے ملتا جلتا تھا جیسے دونوں جڑواں بہنیں رہی ہوں۔ وہ بھی فرصت ملتے ہی ہمارے گھر میں آنکلتی تھی۔ اس زمانے میں عورتوں کو گھر کے سب چھوٹے بڑے جھگڑے نمٹانے کے بعد بھی کافی مہلت مل جاتی تھی کہ وہ آپس میں مل جل کر بیٹھ جاتی تھیں۔"

سوبھو صاحب نے مزید لکھا ہے:

"میں جب بیس اکیس سال کا ہو گیا تو میں نے اماں سے پوچھا، ماں سچ سچ بتانا، میں بچپن میں کیا تم کو بہت پریشان کرتا تھا۔ کہنے لگیں، نہیں لیکن یہ جو تمھارا بھائی ہے نا، یہ ہر وقت ریں ریں کرتا ہوا میرے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ میں جدھر جاتی، یہ بھی لڑھکتا چلا جاتا تھا۔ لیکن تو بس اپنے آپ میں مگن اکیلے ہی تپتی دھول کے فرش پر لڑھکیاں لگاتا پھرتا تھا۔ کبھی مجھ کو پریشان نہیں کرتا تھا۔"

ظاہر ہے اس زمانے میں گھروں کے فرش کچے ہی ہوتے تھے۔ زیادہ تر کچے فرش پر مٹی گارے کا لیپ کر دیا جاتا تھا۔ کہیں کہیں گائے اور بھینس کے گوبر کی ہلکی سی لپائی بھی کر دی جاتی تھی۔ سوبھو صاحب اس دور کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بچے اسی دھول مٹی کی دنیا میں لڑھکتے پھرتے تھے اور خوش رہتے تھے۔ ٹیگور نے اپنی خوب صورت نظم "Crescent moon" میں دھرتی اور بچوں کے درمیان قائم اسی رشتے کو اجاگر کیا ہے۔"

سوبھو صاحب اپنی ماں کے ممتا بھرے پیار اور خاص رشتے کو یاد کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

"ہم دونوں بھائی اپنی ماں اور چاچی دونوں کے لاڈلے تھے۔ لیکن مجھے ماں کی توجہ اس لیے بھی زیادہ حاصل ہو جاتی تھی کیوں کہ میں کھانے پینے کے معاملے میں ذرا زیادہ ہی نخرے کیا کرتا تھا۔ رات کو سالن روٹی وغیرہ کھانے سے بالکل انکار کر دیتا تھا۔ مجھے مٹھائی اور اوپر کی بنی ہوئی چیزیں زیادہ پسند تھیں۔ ماں رات میں اٹھ اٹھ کر کبھی میرے لیے حلوہ پوری بناتی، کبھی کوئی دوسری مزیدار چیز

تیار کرتی۔"

ماں کی ممتا کو یاد کرتے ہوئے سوبھو صاحب بتاتے ہیں:

"جب میں سیاسی معاملے میں پہلی مرتبہ جیل گیا تو مجھ سے ملنے کے لیے بڑا بھائی اور "امڑ" (امڑ) (ماں) باقاعدگی سے جیل آیا کرتے تھے لیکن دادا اور بابا کبھی نہ آئے، کیوں کہ وہ مجھے کسی تکلیف میں مبتلا دیکھنے کا خیال کر کے ہی رو پڑتے تھے۔ اس اعتبار سے "امڑ" (امڑ) (ماں) ذرا حوصلے والی عورت تھیں۔ اماں جب بھی جیل میں ملنے آتیں، اپنے ساتھ بے شمار کھانے پینے کا سامان لاتیں، جو جیل کے ساتھیوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔"

سوبھو صاحب مزید لکھتے ہیں:

"اماں گھریلو معاملات میں بہت بااختیار خاتون تھیں اور ہندوستانی معاشرے میں ساس کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے "امڑ" (امڑ) (ماں) کی شخصیت میں اس کی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ ماں کے حکم کے برخلاف کوئی کام کر ڈالے اور کسی کو حکم عدولی کی ضرورت بھی پیش نہ آتی تھی۔ کیوں کہ وہ خود ایسی طبیعت رکھتی تھیں کہ گھر کے سب افراد، پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں، بہوؤں، بیٹوں اور ہر چھوٹے بڑے اور آنے جانے والے کی ہر ہر ضرورت کا پورا پورا خیال رکھتی تھیں اور کسی کو ان سے شکایت کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔"

سوبھو صاحب اپنی "اماں" کے آخری لمحات کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۱۹۶۸ء میں ان کی عمر ۶۷، ۶۸ سال رہی ہوگی، بس ایک صبح آواز دی، "مجھے گھٹن ہو رہی ہے۔" میں نے انھیں فوراً "کورامین" (Coramin) کے چند قطرے پلائے لیکن بابا تجربہ کار تھے، فوراً صورتِ حال بھانپ گئے۔ کہنے لگے، "بے کار ہے، اب نہیں بچے گی، عزیزوں رشتے داروں کو بیماری کی اطلاع پہنچا دو۔"

سوبھو صاحب اس الم ناک واقعے کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ پہلا موقع تھا جب مجھے گھر کے کسی قریبی عزیز کو کندھا دینا پڑا تھا۔ قریبی سوگوار ہونے کی وجہ سے بارہ دن تک میں نے بھی شیو کرنا ترک کر دیا تھا اور داڑھی رکھنی پڑی تھی۔ "امڑ" کی عذر خواہی اور تعزیت کے لیے میرے کتنے ہی

مسلمان دوست کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں سے آئے تھے۔ ان میں
کامریڈ نازش بھی تھے جو پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی نمائندگی بھی کر رہے تھے۔
انھوں نے مجھے اس عالم میں دیکھا تو بڑی حیرت کا اظہار کیا۔ اس غریب کو یہ پتا
ہی نہ تھا کہ کراچی سے لے کر کلکتہ تک ہندوؤں کی ریت رسم اور رواج یہی ہے
کہ قریبی عزیز مرنے والے کے سوگ میں داڑھی مونڈنا بند کر دیتے ہیں۔
صرف اس ایک مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے دوست ہندوستان
کی اکثریتی آبادی کے رہن سہن اور رسم و رواج سے کس قدر کٹے ہوئے تھے۔''

اس سوانحی خاکے کے آخری فقرے میں احساسِ درد کی پنہاں لہروں کا اندازہ کیجیے۔ لکھتے ہیں:

''میں اپنی عملی زندگی کی مصروفیتوں کے سبب ماضی کو بہت کم یاد کرتا ہوں۔ لیکن
جب کبھی کبھی نیند نہیں آتی ہے اور نیند کی گولی کھانے کے لیے اٹھنے کی ہمت
بھی نہیں ہوتی ہے تو میں اپنے تصور میں ماں کی تصویر کو روشن کر لیتا ہوں اور اس
کی کوئی نہ کوئی بات یاد کرتا ہوں اور پھر یوں ہوتا ہے کہ نیند سے آنکھیں بوجھل
ہونے لگتی ہیں اور میں ماں کی گود میں سو جاتا ہوں۔''

مائی دھیانی

''مائی دھیانی'' کا خاکہ بھی اپنی نوعیت، دلچسپی اور معنویت کے اعتبار سے سندھی خاکہ نگاری میں نہایت منفرد، اہم اور پُر تاثر ہے جسے کفایتِ لفظی اور کردار نگاری ہر دو اعتبار سے مثالی قرار دیا جا سکتا ہے:

''مائی دھیانی ہندی گاؤں میں رہنے والی ایک بے آسرا خاتون ہے جس سے
سوبھو جی کی والدہ کو دلی وابستگی رہی ہے۔ کیوں کہ ان کی والدہ کے کردار میں
ایک نمایاں رنگ یہ بھی تھا کہ وہ اردگرد موجود دھتکارے ہوئے اور مظلوم لوگوں
خاص طور پر عورتوں کی ہر طرح مدد کیا کرتی تھیں اور انھیں تسلی دیتی تھیں اور ان
کے ساتھ ایسا سلوک کرتیں کہ ان کی کھوئی ہوئی عزتِ نفس کسی نہ کسی حد تک
بحال ہو سکے۔ مائی دھیانی کا خاکہ ایک ایسی خاص عورت ہی کا خاکہ نہیں ہے جو
بے آسرا اور کمزور ہے جس کو مرد کا ظلم پیشہ معاشرہ مسلسل روندے چلے جاتا ہے
بلکہ سندھ کے صدیوں پرانے ٹھٹھرے ہوئے بے حس معاشرے میں ''عورت''
کی مسلسل بے توقیری کی الم ناک تصویر بھی پیش کرتا ہے۔''

''امرتؔ'' والے خاکے میں سوبھو صاحب نے مائی دھیانی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے:

''مائی دھیانی ان کے پڑوس میں رہتی تھیں اور اکثر ماں کے پاس آتی جاتی رہتی تھی اور سوبھو صاحب اور ان کے بڑے بھائی دونوں بچپن ہی سے اس سے اس حد تک مانوس تھے کہ اکثر و بیشتر وہ انھیں گود میں اٹھائے، اپنے گھر لے جاتی، وہاں انھیں کھلاتی پلاتی اور جب انھیں نیند آنے لگتی تو ان لوگوں کو لوریاں دے دے کر سلا بھی دیتی تھی، وہ سراسر محبت اور شفقت تھی۔ مائی دھیانی شریف بندوقچی کی بیوی تھی جو کہیں چھوٹی موٹی چوکیداری کی نوکری کرتا تھا اور اپنی بندوق سے تیتر، بٹیر اور چھوٹے چھوٹے پرندے شکار کر لایا کرتا تھا۔ شریف بندوقچی کی پہلی بیوی سے ایک لڑکا بھی تھا جس کا مائی دھیانی بہت خیال رکھتی تھی جیسے وہ اس کا اپنا بیٹا ہو۔ اس نے اپنی ساری ممتا اس پر نثار کر دی تھی۔ لیکن شریف کے مرنے کے بعد اسی وہی لڑکا اپنی سوتیلی ماں یعنی مائی دھیانی کو گھر سے دھکے دے کر نکال باہر کر دیتا ہے اور مائی دھیانی ادھر اُدھر دھکے کھاتے کھاتے گاؤں سے غائب ہو جاتی ہے۔''

''جب مائی دھیانی کا پہلا مرد فوت ہوا تھا تو وہ بہت کم عمر اور نا سمجھ تھی اور اس کا کوئی پرسانِ حال بھی نہ تھا۔ لہٰذا کوئی دوسرا شیر مرد اس چھوٹی سی دلہن کو اپنے کندھے پر بٹھا کر چلتا بنا تھا۔ لیکن یہ دوسرا مرد اتنا ظالم اور بے رحم تھا کہ اس نے مار مار کر مائی دھیانی کا بھرکس نکال دیا تھا کہ اس جیسی خاموش اور صابر عورت کو بھی گھر سے بھاگتے ہی بنی تھی۔ لیکن وہ آخر بھاگ کر کہاں جاتی؟ وہاں تو کوئی تیسرا اور پھر چوتھا شکاری مرد اس کی گھات لگائے بیٹھے تھے۔ شریف اس کا پانچواں مرد تھا لیکن بد قسمتی سے اسے کسی بھی مرد سے کوئی اولاد نہ ہوئی چنانچہ اس نے پوری توجہ شریف کے لڑکے پر صرف کر ڈالی اور جہاں تک ممکن تھا، اس نے اپنی تمام ممتا اس سوتیلے بیٹے پر صرف کی جس نے باپ کے مرتے ہی اپنے باپ کی بیوہ کو گھر سے نکال باہر کیا کہ کہیں باپ کے چھوڑے ہوئے مکان میں حصہ نہ مانگ بیٹھے۔ اور وہ غریب مظلوم عورت کسی کو اپنے ظلم کی داستان سنائے بنا ہی کہیں ایسے غائب ہو گئی جیسے اُسے زمین کھا گئی ہو کہ آسمان!''

آخر بہت دنوں بعد جب سوبھو صاحب لاڑکانہ ہائی اسکول میں پڑھتے تھے کہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اسکول میں منعقد ہونے والی بچوں کی کسی تقریب میں شریک ہو رہے تھے تو انھیں کسی شخص نے

پیغام پہنچایا:

''مائی دھیانی تم لوگوں سے ملنا چاہتی ہے۔ یہ لوگ مائی دھیانی کا نام سن کر خوشی خوشی ملنے چلے گئے اور انھیں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ مائی دھیانی بہت سکھ چین اور آرام سے رہتی ہے اور اس کے ''گھر والے'' نے اسے ہر طرح کی سہولت اور آسائش پہنچائی ہوئی ہے۔ وہ پہلے کی نسبت خود بھی صحت مند اور قبول صورت ہوگئی ہے۔ مائی دھیانی نے ان کی خوب خاطر تواضع کی۔ مٹھائی، پھل اور کئی دوسری چیزیں کھانے کو دیں، گاؤں میں رہنے والے ایک ایک فرد کا حال پوچھا۔ خاص طور پر اماں کی بہت خیریت دریافت کی اور کہا کہ سب کو مائی دھیانی کا سلام پہنچا دینا اور کہنا کہ مائی دھیانی کسی دن سب لوگوں سے ملنے بندی ضرور آئے گی۔ اسے خوش دیکھ کر ان لوگوں کو بھی خوشی ہوئی لیکن یہ پتا نہ چل سکا کہ اس کا موجودہ مرد کتنے نمبر کا مرد ہے۔؟

آخر کئی برس بعد پتا چلا کہ مائی دھیانی مر گئی ہے۔ لیکن کب؟ کہاں؟ کس کے گھر میں؟ کون سے گوٹھ میں، اس کا جنازہ کہاں سے اٹھا اور اس کی قبر کہاں بنی؟ یہ سب سوال لایعنی اور فضول تھے کیوں کہ مائی دھیانی نہ تو کسی بڑے آدمی کی بیٹی تھی اور نہ کسی اہم شخص کی بیوی تھی، وہ علم و ادب کی نمائندہ تھی اور نہ اسے معاشرے ہی میں کوئی خاص اہمیت اور شناخت حاصل تھی۔ وہ تو ایک عام سی سندھی عورت تھی، جو جہاں پیار، محبت اور اپنائیت کی چھاؤں دیکھتی تھی، گھڑی دو گھڑی جا بیٹھتی تھی اور پھر کچھ دیر بعد یہی چھاؤں، یہی سایہ اسے بے آسرا کرے تپتی دھوپ میں پھینک دیتا ہے اور وہ جلتے پاؤں کسی دوسری چھاؤں کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔''

مائی دھیانی ایک غریب، مسکین، دکھیاری اور دھتکاری ہوتی عورت ہے جسے لوگ طعنہ زنی کے طور پر آٹھ خصمی کہہ کہہ کر پکارتے ہیں لیکن ایک بچے کی حیثیت سے سوبھو صاحب نے اس کی ممتا بھرے پیار کی جو گرمی اپنے بچپن میں محسوس کی تھی، اس کی سوندھی اور راحت افزا خوشبو اور حرارت انھیں آج بھی سرشار کر جاتی ہے۔ کیا ایسے دھتکارے ہوئے کردار بھی محبت کی سوغات بانٹ سکتے ہیں۔ انسانی رشتوں کو بلند ترین احساس کی سطح پر چھونے اور ظاہری شکل و صورت کے آر پار جھانک کر دیکھ لینے کی فنی صلاحیت اور فکری بالیدگی نے 'مائی دھیانی' کے خاکے کو سندھی زبان کے منتخب خاکوں میں شامل کر دیا ہے۔

برداشتی

''برداشتی'' ۱۹۴۹ء میں کراچی جیل کی قید کے دوران ملنے والے ایک قیدی خدمت گزار کی کہانی ہے۔ وہ ایک سیدھا سادا غریب آدمی تھا جو اپنے گھریلو حالات کی تلخی سے فرار حاصل کرنے کے لیے خواہ مخواہ سائیکل چوری کے جرم میں خود کو ملوث کر کے جیل میں آ جاتا ہے۔ اس خاکے کا ابتدائیہ دیکھیے

سوبھو صاحب نے برداشتی کے کردار کے ذریعے غریب، نچلے، متوسط درجے کے ایک عام سماجی مسئلے کی عکاسی بھی کی ہے اور بتایا ہے کہ ساس بہو جیسے غیر اہم اور معمولی لڑائی جھگڑے بھی کس طرح آدمی کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیتے ہیں اور وہ مجبور ہو کر حقیقی دنیا سے فرار کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہ حالات ذہنی تنگ نظری اور جہالت ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں، خاص طور پر قریبی رشتوں ناتوں میں ایک دوسرے سے محبت کے سلوک اور دوسروں کی غلطیوں کو نظر انداز کر کے ہی ہم ان رشتوں میں مٹھاس اور پائیداری پیدا کر سکتے ہیں۔

عبدالکریم بجلی

''عبدالکریم بجلی'' — بھی جیل کے ایک دوسرے برداشتی کا خاکہ ہے۔ اس خاکے میں سوبھو صاحب نے ایک بہت دلچسپ اور انوکھے آدمی سے تعارف کرایا ہے۔

> ''عبدالکریم ایک چور ہے اور چوری ہی کے جرم میں جیل کی سزا کاٹ رہا ہے۔ اس نے بہت جتن کر کے اپنی ڈیوٹی سوبھو صاحب کے برداشتی کی حیثیت سے لگوائی تھی بلکہ اس کام کے لیے صوبے دار کو تین سو کی رشوت دے کر سوبھو صاحب کے وارڈ میں خود کو متعین کروایا تھا۔ اسے خبر تھی سیاسی لوگوں کے ساتھ زندگی مزے سے گزرتی ہے۔ کھانے پینے کا عیش رہتا ہے، اے کلاس کا مزے دار کھانا کھانے کو ملتا ہے، چائے پانی الگ۔ اپنی تو بس بچت ہی بچت ہوتی ہے۔ عبدالکریم اپنے کام میں بہت چوکس تھا۔ صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھتا تھا۔ چلت پھرت کا تیز اور پھرتیلا تھا اور اپنی اسی پھرتی کی وجہ سے وہ جیل میں ''بجلی'' کے نام سے مشہور تھا۔ وہ سوبھو صاحب کے پاس یوں تو بہت خوش تھا لیکن ایک تکلیف ضرور تھی اور وہ یہ کہ یہاں اسے سگریٹ پینے کو نہ ملتے تھے کیوں کہ سوبھو خود بھی سگریٹ نہیں پیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس کی دل جوئی کی خاطر وہ کسی

سگریٹ نوش دوست سے ایک آدھ سگریٹ مانگ کر اسے دے دیا کرتے تھے جسے وہ رکھ رکھ کر پیتا تو اور مزے اڑاتا تھا۔ ایک دن اخبار میں خبر چھپی کہ کراچی میں کسی معاملے میں 'لوٹ مار' لگی ہوئی ہے۔ سیاسی لوگ تو اس خبر کا تجزیہ کرنے میں لگ گئے لیکن جب عبدالکریم بجلی کو خبر کی تفصیلات بتائی گئیں تو اس نے نہایت افسوس کا اظہار کیا۔ اس بات پر نہیں کہ لوگ آپس میں کیوں لڑ بھڑ رہے ہیں، امن چین سے کیوں نہیں رہتے، بلکہ اسے دکھ تھا تو اس بات پر تھا کہ لوٹ مار کے اس موقعے پر وہ خود باہر کیوں نہ ہوا۔ اگر وہ باہر ہوتا تو اس بہتی گنگا میں خود بھی ہاتھ دھو لیتا۔ لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے اور وہ مزے میں دکانوں کے تالے توڑتا، لوگوں کے جمع جتھا کو ٹھکانے لگاتا۔ گوداموں کی صفائی کر دیتا۔ اس بات نے عبدالکریم کی شخصیت میں سوبھو صاحب کی دلچسپی بے حد بڑھا دی۔ اور انھوں نے موقعہ بہ موقعہ اس کی زندگی کے حالات کریدنے شروع کر دیئے۔ اس خاموش تفتیش سے جو آدمی باہر نکل آیا ہے، اس کے خدوخال سوبھو صاحب نے نہایت سلیقے سے دکھائے ہیں۔ عبدالکریم نے انھیں بتایا تھا کہ وہ کانپور کی کسی غریب بستی میں پیدا ہوا تھا۔ اسے ماں کی بابت کچھ یاد نہیں تھا۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ ایک شخص نے جو اسے اپنا باپ بتاتا تھا، بچپن ہی سے اپنے ساتھ بھیک مانگنے کے کام میں لگا لیا تھا۔ دن بھر کبھی اس بازار میں، کبھی اس چوک پہ بھیک منگواتا تھا۔ رات کو روکھی سوکھی کھلا کر کبھی فٹ پاتھ پر اور کبھی ٹوٹے پھوٹے چھپر میں اپنے پاس سلا رکھتا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں کہ اس کا بھکاری باپ کب مرا تھا۔ جوانی کی سرحدوں میں داخل ہی ہو رہا تھا کہ وہ جیب کتروں کے استاد 'جیوا' کے ہتھے چڑھ گیا جس نے اسے ہاتھ کی صفائی کے ایسے گر سکھائے کہ جیب کتروں کی دنیا میں جلد ہی اس کا نام پھیل گیا۔ لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ ایک دن پولیس کے ہتھے چڑھ گیا اور اب جیب کاٹنے کے جرم میں چھ مہینے کی سزا بھگت رہا تھا۔''

سوبھو صاحب نے لکھا ہے:

''انھوں نے عبدالکریم بجلی کو نصیحت اور ہدایت کرنے کی بجائے آہستہ آہستہ اس کے دل میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی کہ دیکھو تم بہت ہنر مند آدمی ہو، سمجھ دار ہو، تیز اور پھرتیلے، محنتی اور جفاکش ہو، تم نے زندگی محنت، مشکل اور کٹھن حالات

میں گزاری ہے۔ اب جب بھی یہاں سے باہر نکلنے کا موقع ملے تو محنت مزدوری کا کوئی کام تلاش کر لینا کہیں نہ کہیں کوئی چھوٹا کام، بیرا گیری وغیرہ مل ہی جائے گی۔ حلال کی روٹی کا اپنا مزہ ہوتا ہے۔ پہلے جو کچھ کیا ہے، اسے اپنے ذہن سے نکال دو، بس آگے کی طرف دیکھو اور زندگی کو نئے سرے سے بنانے کی کوشش کرو۔ یہ سن کر اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ کہنے لگا جیل میں جو راحت حاصل ہے، وہ بھلا باہر کہاں سردی کا موسم شروع ہونے والا ہے۔ باہر تو سر چھپانے کی جگہ ملنی بھی مشکل ہے نہ تو کھلی فٹ پاتھ پر سونے کی اجازت ہے اور نہ میدان اور باغ میں گزارا ممکن ہے۔ کسی کھنڈر یا زیر تعمیر عمارت میں چوکیدار اور پولیس والے ٹکنے نہیں دیں گے۔ اور کبھی پولیس سے بچ بھی نکلے تو جرائم پیشہ لوگ خود آپ کی تاک میں لگے ہوں گے۔ خیر جو بھی کٹھنائی پیش آئے گی، میں بھگت لوں گا اور آپ کی نصیحت کے مطابق محنت مزدوری کرنے کی کوشش کروں گا۔

آخر بجلی چھ سات ماہ کے بعد جیل سے آزاد ہو گیا۔ لیکن دو تین ماہ بعد وہ پھر جیل میں موجود تھا۔ سو بھو صاحب نے کوشش کر کے دوبارہ اس کی ڈیوٹی اپنے وارڈ میں لگوالی کیوں کہ عبدالکریم بجلی ایک ایمان دار چور تھا۔ اور اس نے کبھی شکر، چائے کی پتی اور ضرورت کی دوسری چیزوں پہ ہاتھ صاف کرنے کی کوشش نہ کی تھی، جب کہ عام برداشتی ان چیزوں کی چوری کو جائز سمجھتے تھے۔ کیوں کہ ضرورت کی یہ اشیا جیل میں کرنسی نوٹوں کی طرح چلتی ہیں۔ اور سی کلاس کے قیدیوں میں آسانی سے بک جایا کرتی تھیں۔ ان کے بدلے میں نشے باز برداشتی 'چرس' وغیرہ حاصل کر لیتے تھے لیکن عبدالکریم بجلی اس لت سے آزاد تھا۔ اور ضرورت کی ہر چیز یہاں فراغت کے ساتھ حاصل ہونے کے باوجود اس نے کبھی چوری چکاری نہ کی تھی۔

اس دفعہ عبدالکریم بجلی نے جو کہانی سنائی وہ پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ تھی۔ کہنے لگا، "جیل سے چھوٹنے کے بعد میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب چوری چکاری اور جیب تراشی کی بجائے محنت مزدوری اور حق حلال کی روزی کمانے کی کوشش کروں گا۔

شروع شروع میں کامیابی بھی ہوئی لیکن کہیں کوئی کام ایسا نہ ملا جہاں آدمی کو پاؤں جمانے کی مہلت مل پاتی۔ آخر خدا خدا کر کے ایک ہوٹل میں بیرا گیری مل

گئی تھی لیکن ابھی دو چار دن ہی گزرے تھے کہ ہوٹل کے مالک نے تقاضا شروع کر دیا کہ پہلے تم جہاں کام کرتے تھے، وہاں سے نیک چلنی کا سرٹیفکیٹ لے کر آؤ ورنہ نوکری سے باہر۔ بھلا میں نیک چلنی کا سرٹیفکیٹ کہاں سے لا کر دیتا۔ چنانچہ ایک ہوٹل سے دوسرے ہوٹل اور تیسرے سے چوتھے ہوٹل میں مختلف کام کرتا پھرا لیکن کہیں پاؤں جمانے اور سر چھپانے کا آسرا نہ ہو سکا۔ نہ پیٹ بھر کھانا نصیب ہوا۔ لہٰذا اس نے جیل واپسی کا فیصلہ کر لیا اور ایک دن ہوٹل سے شکر، چائے کی پتی کے بنڈل اور اسی قسم کی کچھ چیزیں تھیلی میں بھریں اور لے کر باہر نکل رہا تھا کہ دوسرے بیرے نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اور میں نے اقبال جرم کر کے جیل واپسی کا راستہ نکال لیا ہے۔ سوبھو صاحب نے لکھا ہے کہ 'میں جب ۱۹۵۲ء میں جیل سے نکل رہا تھا تو عبدالکریم بجلی تیسری چوتھی بار جیل کی سزا کاٹ رہا تھا۔ وہ بس کسی چھوٹے موٹے جرم ہی میں ماخوذ ہوتا تھا۔ لیکن رہائی کے مہینے دو مہینے کے بعد ہی کسی نہ کسی جرم کی پاداش میں پھر جیل لوٹ آتا تھا۔ وہ کہتا تھا بھلا جیل میں جو سکون، فراغت، راحت اور آرام ہے، وہ باہر کی آزاد دنیا میں کہاں ہے۔ جس آدمی کے سر پر کوئی سایہ نہ ہو، جس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ اور آسرا نہ ہو، اس کی واحد پُر سکون منزل جیل ہی ہے کہ اس کی اونچی چھت اور موٹی دیواریں، جو تحفظ فراہم کرتی ہیں، باہر کی دنیا میں غریب آدمی ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا! ٹھٹھرتی ہوئی سردیوں میں جیل کے کمبلوں کی عیاشی بھلا کسی غریب اور بے سہارا آدمی کو جیل کے باہر کب نصیب ہو سکتی ہے؟!''

''برداشتی'' اور ''عبدالکریم بجلی'' دو ایسے خاکے ہیں جن میں ہمارے معاشرے کے غریب طبقے کے دو جداگانہ کردار جھلک دکھاتے ہیں۔ ان کرداروں کے شخصی خدوخال بالکل جداگانہ اور مختلف ہیں لیکن دونوں خاکوں میں بے آسرا لوگوں کے لیے جیل کی عمارت ایک سایۂ عاطفت بن کر ابھرتی ہے۔ چھوٹے طبقوں کے دھتکارے ہوئے لوگوں کی زندگی میں حرماں نصیبی کا زہر اس قدر گھل جاتا ہے کہ زندگی سے فرار کے لیے انھیں آخری پناہ گاہ جیل ہی دکھائی دیتی ہے۔

خالقو

''خالقو'' عبدالکریم بجلی سے بالکل مختلف مگر دلچسپ اور منفرد کردار ہے۔ یہ بھی جیل کا ملاقاتی تھا۔ اس کا قصہ اتنا عجیب و غریب تھا کہ سوبھو صاحب کے ذہن میں منقش ہو کر رہ گیا تھا اور اکثر ان کی یاد کے

پردے پر اس کی شبیہ ابھر آیا کرتی تھی۔

''یہ ایک عام سا نقب زن، اٹھائی گیرہ اور چور تھا۔ وہ بہت چغل خور تھا جس سے جیل میں لوگ یوں بھی چوکنے رہا کرتے تھے۔ وہ ضلع لاڑکانہ کا رہنے والا تھا۔ ایک دن خالقو سوبھو صاحب کے پاس آیا اور خواہش ظاہر کی کہ چونکہ وہ اس کے طرف ہی کے آدمی ہیں، اس لیے اگر وہ اجازت دیں تو کبھی کبھار ان سے گپ شپ کرنے آجایا کرے۔ سوبھو صاحب تو انسان دوست آدمی ہیں۔ وہ تو خود ایسے دھتکارے ہوئے لوگوں کو اپنے قریب رکھنا پسند کرتے۔ چنانچہ خالقو نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اور وقفے وقفے سے اپنی زندگی کے حالات سوبھو صاحب کے گوش گزار کرنے شروع کیے۔ خالقو بچپن ہی سے کھیتوں کھلیانوں میں چوری کیا کرتا تھا۔ پہلے پہل گھر والوں کی غربت اسے اس کام پر مجبور کرتی تھی۔ بعد میں وہ اناج کی بوریوں میں 'کیل' اگا کر چاول، گندم اور جوار وغیرہ چرانے لگا۔ ذرا بڑا ہوا تو چوروں کی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ ایک مرتبہ تو ڈاکے میں بھی شامل ہوا جس میں فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوا لیکن کسی طرح نکل بھاگا۔ وہ اس کی نو عمری کا زمانہ تھا، جب اس کی عمر کے لونڈے جھوٹے سچے عشق کی کہانیاں سنا سنا کر ڈینگیں مارا کرتے ہیں۔ لیکن اس معاملے میں خالقو کا خانہ خالی تھا۔ نہ تو اس نے کبھی کسی عورت یا لڑکی سے عشق کیا تھا اور نہ اس کے سامنے کوئی ایسی لڑکی تھی جس سے وہ بھی جھوٹا سچا عشق جتلا سکتا اور دوسرے لڑکوں کی طرح شیخی بگھارتا۔ آخر اس کی نظر اپنی چھوٹی چاچی پر پڑی کہ اس کے آس پاس وہی ایک پُرکشش منیار نظر آتی تھی۔ ایک دن جب چاچی بغل میں دودھ اور لسی اور سر پر چاچا کے لیے روٹی کی چنگیر رکھے کھیتوں میں جاری تھی کہ وہ بھی اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا اور ایک جگہ موقع پا کر چاچی پر بری نیت سے حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ پہلے تو چاچی اس کی نیت نہ بھانپ سکی اور سمجھی کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہے لیکن جب اس کی بدنیتی کا احساس ہوا تو اس نے بہت سکون سے پہلے دودھ اور لسی کی گاگریں اتار کر ایک طرف رکھی، پھر سر سے روٹی کی ٹوکری اتاری اور پھر دونوں بازو کھول کر اسے دعوت دی کہ ''چل آجا، بتا کیا چاہتا ہے۔'' وہ سمجھا چاچی اس کو بغل گیر ہونے کی دعوت دے رہی ہے لیکن جیسے ہی وہ قریب آیا، چاچی نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر، ایسا داؤں مارا کہ وہ زمین پر چت گر

پڑا اور چاچی اس کے سینے پہ سوار ہو کر مکوں اور لاتوں سے ایسی مرمت کی کہ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں وہیں پڑا رہ گیا اور چاچی دوبارہ اپنا سامان اٹھا کر اپنے میاں کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس واقع سے اس کے دل میں شرمندگی اور غیرت کا ایسا طوفان اٹھا کہ وہ ہوش میں آتے ہی گاؤں واپس جانے کی بجائے شہر کی طرف بھاگ نکلا آخر چند ماہ بعد بابا پوچھتے پوچھتے اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے شہر پہنچ گیا۔ کہنے لگا بے غیرت عشق کرنے کو تجھے چاچی ہی نصیب ہوئی تھی۔ گویا چاچی نے اس واقع کو چھپانے کی بجائے گاؤں میں بات پھیلا دی تھی۔ خالقو کچھ دنوں کے بعد گاؤں تو لوٹ آیا لیکن شرمندہ شرمندہ رہنے لگا تھا، کہیں دور سے چاچی کی جھلک بھی نظر آجاتی تو وہ راستہ چھوڑ کر الگ چھپ جاتا۔ اگر کبھی چاچی کی نظر اس پر پڑ جاتی تو وہ اسے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا دکھا کر چھیڑا کرتی۔ آخر وہ شرمندہ ہو کر پھر شہر لوٹ آیا اور کسی جرم میں پکڑا گیا۔ وہ چور بھی تھا اور چغل خور بھی لیکن چاچی کی مار نے اس کا دماغ ٹھیک کر دیا تھا۔ وہ چاچی کا ذکر عزت کے ساتھ کرنے لگا تھا اور عورت کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھتا تھا کہ چاچی کے بہادرانہ ردِعمل نے اس کے دل پر عورت کا ایک ایسا نقش بنا دیا تھا جو ہمیشہ روشن رہے گا۔''

مذکورہ بالا خاکوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ سوبھو صاحب نے مختصر تحریروں میں ایسے لوگوں کی قلمی تصویریں کھینچی ہیں جنھیں معاشرے میں کوئی قابلِ ذکر مقام حاصل نہیں ہے لیکن ان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی نقش ایسا ضرور ہوتا ہے۔ جس کی روشنی بہت دور سے نہ دیکھی جا سکتی ہو تو کم از کم قرب و جوار میں موجود اندھیروں کو کسی نہ کسی حد تک کم ضرور کر دیتی ہے۔

سلطان ڈرائیور

''سلطان ڈرائیور'' بھی اگرچہ غریب طبقے ہی کا فرد ہے لیکن اس کے شخصی کردار کے خدوخال بالکل مختلف اور جداگانہ ہیں۔ سلطان جو کبھی سوبھو صاحب کی پرانی کھٹارا لینڈ روور گاڑی چلاتا تھا، اسے سوبھو صاحب نے اپنے ایک کالم میں یاد کیا ہے اور اس میں اپنے کام سے جو خاص لگن، ڈیوشن (devotion) تھا، اپنے مالکوں سے محبت، خلوص، دوستی، وفاداری اور لگاؤ تھا کہ نوکری ختم ہونے کے بعد بھی اس نے واپس اپنے گاؤں جانے کی بجائے لاڑکانہ ہی میں کوئی دوسرا کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس

کی شخصیت میں دوسرے لوگوں سے ہمدردی کا جو عنصر تھا، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس نے اپنے ملنے جلنے والے کم وبیش سب بے روزگار نوجوانوں کو نہ صرف گاڑی چلانا سکھا دی تھی بلکہ چھوٹی موٹی مشینوں، پمپوں اور انجنوں کی مرمت کرنے کے فن کی ٹریننگ بھی دے دی تھی۔ اس میں عام لوگوں سے محبت کرنے کا غیر معمولی جذبہ موجود تھا جس کی وجہ سے وہ سندھی طرزِ معاشرت کا حصہ بن گیا تھا۔ وہ کبھی کام سے تھکا اور نہ کبھی غیر معمولی حالات میں ہمت ہاری بلکہ مشکل وقت میں وہ اپنے شریک ساتھیوں کی بھی ہمت افزائی کیا کرتا تھا۔

سلطان بہت اچھا کاری گر اور مستری تھا اور اس نے کئی نوجوان بے روزگاروں کو ہنرمند بنا ڈالا تھا۔ وہ کبھی خالی بیٹھنے والا شخص نہ تھا، ہر وقت کچھ نہ کچھ کام کرتے رہتا جس سے دوسروں کو راحت اور آرام مل سکے۔ اس کی ضرورتیں بھی محدود ہوتی تھیں۔ وہ اپنے خاندان کو چھوڑ چھاڑ کر سوبھو صاحب کے گھر والوں میں ہی رُل مل گیا تھا اور ان سے جدا ہونا اسے قبول نہ تھا۔ آخری عمر میں اسے وہم ہو گیا تھا کہ کوئی غیبی طاقت یا آواز اسے بلاتی ہے اور وہ بیٹھے بیٹھے نادیدہ غیبی آواز کی صدا پر نکل پڑتا تھا اور گھنٹوں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد آخرکار ہلکان ہو کر تھکا ماندہ واپس آجاتا تھا۔ سلطان ڈرائیور کے خاکے میں یوں تو کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن جس والہانہ انداز میں سوبھو صاحب نے اپنے ایک محنتی، جفاکش اور وفادار ملازم کو یاد کیا ہے، وہ بجائے خود عام لوگوں کے ساتھ ان کے انسانی رویے کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔

کوڑومل

''کوڑومل'' کا خاکہ دراصل سوبھو جی کے ایک لنگوٹیا یار کی قلمی تصویر ہے جس کے ساتھ انھوں نے اپنا لڑکپن گزارا تھا۔

> ''کوڑومل یتیم لڑکا تھا جس کے ماں باپ انفلوئنزا کی وبا میں موت کے شکار ہو گئے تھے لیکن اس کی پرورش ماموں خوب چند اور ان کی بیوی ''بھائی'' نے کی تھی کیوں کہ وہ خود بے اولاد تھیں۔ اس طرح سوبھو صاحب اور کوڑومل نے اپنا لڑکپن ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی خاک بھرے فرش پر لڑھکنیاں کھاتے ہوئے گزارا تھا۔ یہ دونوں ہم عمر تھے، اور اسکول بھی ساتھ ہی جاتے تھے۔ برسات کے دنوں میں کھمبیوں اور سیپیوں کی تلاش بھی مشترکہ طور پر ہوتی تھی۔ کھیتوں میں چھپ چھپا کر بھٹے توڑنے ہوں کہ گنے، امبیاں جھاڑنی ہوں کہ بیریاں، ان سب کاموں میں کوڑومل برابر شریک رہا کرتا تھا۔ لیکن جب

سوبھوجی بگھی کے اسکول سے پرائمری کے پانچ درجے پاس کر کے قمبر کے این
جے وی اسکول میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ داخل کر دیے گئے تو کوڑو مل کا
اور ان کا ساتھ چھوٹ گیا۔ اور اُسے آگے بڑھنے کی بجائے ماما خوب چند کے
ساتھ دکان داری کے کام میں ہاتھ بٹانا پڑا۔ اور دیکھتے دیکھتے اسے دکان داری
کے گُر بھی آ گئے۔ لیکن اب وہ زیادہ تر اپنے ننھیال میں رہنے لگا تھا۔ اور جب
کبھی سوبھو صاحب چھٹیوں میں گاؤں آتے تھے تو وہ بھی ان دنوں بندی آ جاتا
تھا اور پھر وہی ان کے مشترکہ مشاغل، کھیل کود اور شرارتیں شروع ہو جاتی تھیں۔
اسے ملھ (کشتی) لڑنے کا ہنر اور داؤ خوب آتے تھے، اس لیے وہ اس کشتی
میں سوبھوجی جیسے مضبوط اور توانا شخص پر آسانی سے غالب آ جاتا تھا۔ کیوں کہ
توانائی اور طاقت ہنر مندی اور داؤ پیچ کو کم ہی شکست دے سکتی ہے۔
بارہ تیرہ برس کی عمر میں کوڑو مل اچانک کہیں غائب ہو گیا اور پھر چند برسوں بعد
یعنی اٹھارہ انیس برس کی عمر میں گاؤں واپس آ گیا۔ اب وہ ایک اونچا پورا کڑیل
جوان تھا۔ اس زمانے میں سوبھو صاحب ڈی جے سائنس کالج کراچی میں
زیرِ تعلیم تھے۔ ملاقات ہوئی تو کوڑو مل نے بتایا کہ وہ ٹھٹھہ، بدین اور حیدرآباد کے
زمیں داروں کے ہاں نوکری کرتا رہا ہے اور آج کل میرپور خاص کے ایک سکھ
زمیں دار کے معتمدین میں شامل ہے۔ اس کے ذمے ہاریوں اور دوسرے
نوکروں چاکروں پر نظر رکھنا بھی شامل ہے۔ ان سے بٹائی وصول کرتا اور اسی
طرح کے دوسرے کام کرتا۔ وہ کڑیل جوان تھا اور اسے ہر وقت کسی نہ کسی محبوبہ
کی تلاش رہتی تھی۔ ہمیشہ اپنے کسی نہ کسی عشق کا قصہ سناتا رہتا۔ یہ ساری باتیں
سوبھوجی کے لیے تو بالکل ان جانی اور حیران کن تھی کہ ان کے ہاں جنس اور عشق
کا خانہ ہنوز خالی چلا آتا تھا۔ اس زمانے میں گاؤں میں سولہ سترہ برس کے
ہونے تک لڑکوں کی شادیاں ہو جاتی تھیں اور وہ بال بچے والے ہو کر اپنی اپنی
زندگی بسر کرنے لگتے تھے لیکن کوڑو مل کو ماما، مامی بھی کہہ کہہ کر تھک گئے تھے لیکن
اس کی نیت شادی کرنے کی تھی ہی نہیں۔ ابھی ہندو مسلمان کی عصبیت عام نہ
ہوئی تھی اور سیاسی جھگڑے بھی شروع نہیں ہوئے تھے۔ وہ دور تھا بھی امن و
امان کا۔ دھرم دوستی کے بیچ کم ہی آتا تھا اور نہ اس زمانے میں کاروکاری کا زیادہ
زور تھا۔ عشق معشوقی کے لیے گھر محلے بند نہ تھا، بس کوڑو مل کو ذرا احتیاط ضرور

برتنی ہوتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ کوڑومل ایک مرتبہ پھر سین سے غائب ہوگیا۔ اُدھر سوبھو صاحب شانتی نکیتن چلے گئے اور جب وہاں سے لوٹے تو پتا چلا کوڑومل کو رتوڈیرے کے خوش حال گھرانے میں ایک خوب صورت نوجوان ''پھلاونتی'' بیوی مل گئی ہے جس سے اس نے شادی کر لی ہے اور اب اس سے ایک بچہ بھی ہے اور وہ بہت خوش و خرم زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس نے ادھر اُدھر تانک جھانک کا کام بھی چھوڑ دیا ہے اور بیوی کے کھونٹے سے بندھا بیٹھا ہے۔ انھیں بھی اس کی بیوی اچھی لگی اور کوڑومل کو گلے لگا کر مبارک باد دی لیکن ان کے دل میں ایک کھٹک تھی کہ آخر یہ ''پھلاونتی'' لڑکی کیا ہوتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے کوڑومل سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ ''پھلاونتی'' اس لڑکی کو کہتے ہیں جس کی شادی تو ہو جاتی ہے لیکن اس کا مرد نامرد ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ سدا کنواری رہ جاتی ہے۔ اگر کوئی لڑکی پنچائیت میں ثابت کر دے کہ اس کا مرد نامرد ہے تو پنچائیت اس کی شادی کو کالعدم قرار دے کر کسی دوسرے مرد سے شادی کرا دیتی ہے۔ چنانچہ ان ہی حالات میں کوڑومل کی شادی ہوئی ہے۔ اور وہ اب بیوی بچے کے ساتھ بہت خوش ہے۔

کوڑومل انگریزی تو نہیں جانتا تھا لیکن سمجھ بوجھ والا آدمی تھا۔ اس کے وسیع تجربے نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اسے اپنے لڑکپن کی غربت و عسرت اور نوجوانی کی محنت، مشقت کبھی نہ بھولی تھی اور اچھے دنوں میں بھی اپنے خراب زمانے کو یاد کر لیا کرتا تھا۔ وہ لوگوں میں اچھی طرح گھل مل جانے کا ہنر جانتا تھا۔ شادی کے بعد کسی نے اس کے چال چلن کی بابت کوئی افواہ نہ سنی تھی۔ وہ ایک ذمے دار گھریلو شخص بن گیا تھا۔ اس کی شخصیت کی تعمیر محنت، مشقت، ایمان داری اور مسلسل تنگ و دو کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ عام طور پر خوش حالی کے زمانے میں لوگ غربت اور عسرت کے دور کو بھول جاتے ہیں لیکن وہ نہ صرف ان زمانوں کو یاد رکھتا تھا بلکہ اس نے بچوں کو بھی اپنے وہ زخم دکھائے تھے جو اس نے غریبی اور یتیمی کے زمانے میں اٹھائے تھے۔ اس نے اپنی اولاد کو اپنی محنت، مشقت کے قصے بھی سنائے تھے اور اس طرح
ان کی ذہنی تربیت کی تھی اور یہ اس کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ اس کی اولاد نے بھی کوڑومل کے نقشِ قدم پر چلنے کا فیصلہ کیا۔''

کوڑومل کا خاکہ دراصل لڑکپن کے دوست کی ایسی قلمی تصویر ہے جس میں خود سوبھو صاحب کے بچپن کے عکس دکھائی دیتے ہیں۔ اس خاکے میں بھی انھوں نے اپنے عزیز دوست کی شخصیت کے سب رنگ نہایت احتیاط کے ساتھ ابھارے ہیں۔ اس کے کردار کی خوبیاں بھی سامنے آتی ہیں اور منفی پہلو بھی اجاگر ہوئے ہیں۔ مثبت اور منفی رنگوں کے امتزاج سے جو خوب صورت تصویر ابھر کر آئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ای کے ہانگل (E.K. Hangal) اوتار کشن ہانگل

ای کے ہانگل (E.K. Hangal) کا اصل نام اوتار کشن ہانگل ہے۔ وہ ہندوستان کی فلمی دنیا کے نہایت اہم، نامور کیریکٹر، ایکٹر، ڈائریکٹر اور آرٹسٹ ہیں لیکن سوبھو صاحب نے ہانگل کا جو خاکہ تحریر کیا ہے، اس میں ہانگل کا وہ دور سامنے رہا ہے جب وہ کراچی میں (۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۷ء) بائیں بازو کی سیاست میں عملی طور پر مصروف تھے۔ اگر کوڑومل کا خاکہ لڑکپن کے لنگوٹیے یار کا خاکہ ہے تو ای کے ہانگل کا خاکہ نوجوانی کے ہم خیال، سیاسی رفیق، جدوجہد کے ساتھی، جیل کے ہم زاد اور کامریڈ کی یادوں کی بازیافت ہے۔ اس خاکے کا ابتدائیہ ملاحظہ فرمائیے:

> ''چند سال قبل بمبئی میں جو فساد ہوا تھا، وہ فساد کیا تھا، مسلمانوں کا قتلِ عام تھا۔ اس فساد میں کراچی کے ایک قدیم کشمیری پٹھان، سندھی ادیب، سیاست دان، ڈراما آرٹسٹ اور بہت ہی عمدہ سندھی اردو گائیک اوتار کشن ہانگل کو جو عام طور پر ہندوستان و پاکستان کی فلمی دنیا میں ای کے ہانگل کے نام سے جانا جاتا ہے، بال ٹھاکرے کی شیوسینا کے نوجوانوں نے چارپائی پر بٹھا کر سرِعام معافی مانگنے پر مجبور کر دیا گیا تھا اور معافی بھی کس بات کی کہ آخر وہ مسلمانوں کو اپنی فلموں میں شریف اور نیک چلن کیوں دکھاتا ہے!

اوتار کشن ہانگل ۱۹۴۷ء تک کمیونسٹ پارٹی کی کراچی شاخ کا سیکریٹری تھا۔ وہ ایک بہترین ٹیلر ماسٹر اور کٹر تھا اور کراچی کے درزیوں کی یونین کا صدر بھی تھا۔ وہ صدر کے معروف ٹیلرنگ شاپ ''بیومنٹ ٹیلرز'' کے پاس بحیثیت 'کٹر' ملازم تھا اور اس کے ہاتھ کی صفائی اور چابک دستی کی وجہ سے کراچی کے شوقین اور فیشن ایبل، ملبوسات کے رسیا اسی دکان کا رخ کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی اسے دن میں تین سوٹ کاٹنے اور ڈیزائن کرنے کے سات سو روپے تنخواہ ملتی تھی جو اس وقت بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ ویسے تو ہانگل کی پیدائش کشمیر میں ہوئی تھی اور لڑکپن پشاور میں گزرا تھا لیکن جوانی کا بیشتر حصہ کراچی میں بسر ہوا۔ اس نے کراچی میں اسٹیج اور تھیٹر کے شائقین اور ایکٹنگ کے فن میں دلچسپی رکھنے

والوں کو اپنے گرد جمع کر رکھا تھا بلکہ کراچی میں عوامی طرز پر تھیٹریکل گروپ بھی بنایا تھا جس میں نوجوان طالب علم، مزدور اور عام لوگ سب ہی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ وہ خود ایک بہت اچھا سنگر بھی تھا اور موسیقی کے بعض آلات بجانے کا ہنر بھی جانتا تھا۔ وہ ایک وجیہہ، گورا چٹا، درمیانے قد کا نوجوان تھا اور اس کی شخصیت میں غیر معمولی جاذبیت تھی۔ آج بھی جب کہ اس کی عمر اسی برس سے متجاوز ہو چکی ہے، وہ ہندوستانی فلم انڈسٹری کا نہایت مقبول اور اسمارٹ ایکٹر اور ڈائریکٹر ہے۔ اس کی ساری زندگی بائیں بازو کی سیاست میں گزری ہے۔ وہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کا بھی نہایت اہم اور پُر جوش سپاہی رہا ہے اور اس راہ میں قید و بند کی سختیاں بھی جھیلی ہیں۔

۱۹۴۸ء میں جب ای کے ہانگل اور سوبھو جی حیدر آباد جیل میں ایک ساتھ قید کاٹ رہے تھے تو سوبھو صاحب نے ازراہِ تأسف اپنی رائے کا اظہار کیا تھا کہ تقسیم کے بعد سندھ کے سب اچھے گائیک اور موسیقار ایک ایک کر کے سندھ سے ہجرت کرتے جاتے ہیں اور سندھ میں موسیقی کا مستقبل ان کو تاریک ہوتا نظر آتا ہے۔ اس کے جواب میں ہانگل نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ کسی کے آنے جانے سے زندگی اور فن کا ارتقائی سفر کبھی نہیں رکتا ہے۔ اور اب بھی سندھ میں کئی اچھے گائیک موجود ہیں جن کا فن وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرے گا۔

ای کے ہانگل کی یہ پیشین گوئی بہت درست ثابت ہوئی اور اسی بظاہر خاموش ہوتی ہوئی محفلِ موسیقی سے بھی بعد میں ایسی ایسی گداز آوازیں اور جادو بھری راگ راگنیاں سنائی دیں جن میں سندھی تہذیب اور فنِ موسیقی کی روح سمائی ہوئی ہے۔ سوبھو صاحب نے لکھا ہے کہ سندھی فنِ موسیقی کے مستقبل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ای کے ہانگل نے جن ابھرتے ہوئے موسیقاروں کے نام لیے تھے، ان میں ماسٹر محمد ابراہیم، استاد منظور علی خاں اور محمد جمن سمیت کئی ایسے گانے والوں کے نام شامل تھے جو ابھی اپنے کیریئر کے ابتدائی سفر ہی میں تھے اور جن کے مستقبل کی بابت کسی قسم کی پیشین گوئی کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ لیکن ہانگل سیاسی اور سماجی ورکرز، محنت کشوں کی تنظیموں کا سرگرم مجاہد ہونے کے ساتھ ساتھ اس وقت بھی ساز و آواز اور راگ راگنیوں کا ماہرانہ علم رکھتا تھا۔ ہانگل کی شخصیت کے اس جمالیاتی پہلو کو سوبھو صاحب نے بہت خوش اسلوبی سے اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''یہ بات ان کو بھی عجیب لگتی ہے کہ عملی طور پر ہانگل سیاست کے میدان کا ایک نہایت سرگرم کارکن تھا اور اس کی تمام زندگی محنت کشوں کے حقوق کی لڑائی لڑنے اور ظلم پیشہ طبقوں کے ہاتھوں عام آدمی کے سیاسی، معاشی اور سماجی جبر کے خلاف جدوجہد کرنے میں گزری تھی تو دوسری طرف وہ نہایت بلند پایہ جمالیاتی ذوق بھی رکھتا تھا جو زندگی اور فطرت کے گہرے مطالعے کے بغیر ممکن

نہیں ہوتا اور بہت کم لوگ بیک وقت اس صلاحیت کا مظاہرہ کر پاتے ہیں۔ عام طور پر آرٹسٹ لوگ زندگی کے عملی جدو جہد میں نہ تو اس قدر سر گرم ہوا کرتے ہیں اور نہ اپنے آدرش کی کامیابی کے لیے بہت زیادہ سختیوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ عملی زندگی میں فن کاروں کا رویہ بالعموم بوہیمیانہ ہوتا ہے اور وہ ایک سیاسی ورکر خاص طور پر کمیونسٹ پارٹی جیسی تنظیم کے سخت ڈسپلن کی پابندی نہیں کر پاتے لیکن ای کے ہانگل جیسے لوگوں نے اس عام تاثر کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔

ای کے ہانگل راگ رنگ، موسیقی، ایکٹنگ، اسٹیج ڈراما اور فیشن ڈیزائنگ جیسے شعبوں میں غیر معمولی دلچسپی اور مہارت رکھنے کے باوجود سیاست اور سماجیات کا بھی نہایت گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور کمیونسٹ پارٹی کے حلقوں میں ان کے پیش کردہ تجزیوں اور نظریاتی خیالات کو خاص اہمیت دی جاتی تھی اور سندھ میں بائیں بازو کی سیاست اور سوشلزم کے فروغ کے سلسلے میں کیے گئے بیشتر فیصلوں میں ای کے ہانگل کی رائے شامل رہا کرتی تھی۔''

سوبھو صاحب نے ای کے ہانگل کی شخصیت کے ایک دلچسپ پہلو کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جیل میں ہم سب گوشت خور جانور بنے ہوئے تھے، سبزی بھاجی بس مجبوری کی حالت ہی میں حلق کے نیچے اترتی تھی لیکن ایک ہمارا یار تھا کہ سخت سبزی خور واقع ہوا تھا اور انتہائی کوشش کے باوجود بھی ہم لوگوں کی طرح گوشت خوری پر کبھی راضی نہ ہوا۔ یہ نہیں کہ اس کا جی کبھی نہ چاہتا کہ کھانے پینے کے معاملے میں وہ خالص برہمن طور طریقوں کو ترک کر کے ہم لوگوں کا ساتھ نہ دے لیکن سبزی خوری اس حد تک اس کی فطرتِ ثانیہ ہو چکی تھی کہ اب اس سے نجات کی کوئی صورت نہ تھی۔ ایک مرتبہ اپنی گھر والی سے فرمائش کر کے بہترین گوشت اور سبزیاں پکوا کر منگوایا لیکن ٹفن کیریئر کھول کر جیسے ہی اس کی نظر گوشت کے برتن پر پڑی، اس نے قے کرنا شروع کر دی اور ہم لوگوں سے الگ جا کے بیٹھ گیا۔ جب کچھ دیر کے بعد اس کی طبیعت ٹھکانے پر آئی تو اس نے اپنی سبزی بھاجی کھا کر گزارا کیا۔ گوشت خوری کے خلاف اس کی نفرت دراصل اس کی نفسیاتی سرشت کا حصہ بن چکی تھی جو اسے ورثے میں ملی تھی۔ چنانچہ جو چیزیں ہماری اجتماعی نفسیات کا حصہ بن جاتی ہیں، وہ بعد میں عقل دلائل سے بہت کم دور ہو پاتی ہیں۔''

سوبھو صاحب نے اپنے نوجوانی کے سرگرم ساتھی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ای کے ہانگل ایسا شعلہ صفت کارکن تھا جو اپنے اردگرد روشنی پھیلاتا ہے۔ وہ جیل میں ہم لوگوں کے ضمیر کی نگرانی اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیا کرتا تھا۔ اکثر ہم لوگوں سے پارٹی لائن اور پارٹی پالیسی کے بارے میں خاصی گرما گرم بحث بھی ہو جاتی تھی لیکن ہانگل بہت سنجیدگی اور بردباری سے ہم لوگوں کی باتوں کو سنتا تھا اور ہمارے اعتراضات کے ممکنہ حد تک جواب دیتا تھا۔ وہ سختی کے ساتھ پارٹی ڈسپلن کی پابندی خود بھی کرتا تھا اور ہم لوگوں کو بھی اس ڈسپلن کے اندر رکھتا تھا اور جب کبھی ہم اس پالیسی سے سرِ مو تجاوز کرتے تھے تو پھر رات میں ہونے والی پارٹی میٹنگوں میں ہم لوگوں کو اس کی سخت تنقید کا نشانہ بھی بننا پڑتا تھا۔ نیوی کی بغاوت کے وقت کراچی میں بیداری کی لہر پیدا کرنے میں ای کے ہانگل کا نہایت اہم کردار رہا ہے۔ جیل میں اسے ٹیلرنگ شاپ کا انچارج بنا دیا گیا تھا جو اس وقت بالکل اجاڑ پڑا ہوا تھا، یہاں اس نے جیل کے افسروں اور کارندوں کو عمدہ تراش خراش کے کپڑے سی سی کر کیا دیے کہ جیل میں اس کا اچھا خاصا حلقۂ اثر پیدا ہو گیا اور بعد میں ہمارے پیغامات جیل کے ٹیلر ماسٹر اور بیگم ای کے ہانگل کے ذریعے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے جانے لگے۔ اور ہم سب جیل میں رہتے ہوئے بھی ہانگل کی وجہ سے پارٹی سے رابطے میں رہنے لگے تھے۔

ابھی ای کے ہانگل ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت ہم لوگوں کے ساتھ جیل ہی میں تھا کہ اسے پیغام ملا کہ اگر وہ فی الفور اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ فوراً پاکستان چھوڑ جانے پر رضامند ہو جائے تو اس کو دو دن کے لیے پیرول پر رہا کر کے حکومتی انتظام اور نگرانی کے اندر سرحد پار کرایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہانگل دوستوں کے مشورے سے سندھ چھوڑ کر بمبئی چلا گیا۔ بعد میں اطلاعات ملتی رہیں کہ وہاں وہ پارٹی کے زیرِ اثر قائم کردہ انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن میں بلراج ساہنی، پرتھوی راج اور دیگر کمیونسٹ اور ترقی پسند آرٹسٹوں کے شانہ بہ شانہ سرگرم حصہ لے رہا ہے اور خود بھی ہندوستان کی فلمی دنیا میں ایک نامور اور مقبول ایکٹر اور ڈائریکٹر کی حیثیت سے نام کما رہا ہے۔ ہندوستان کی آرٹ فلم میں ای کے ہانگل کا نام کامیابی کی ضمانت بن گیا ہے کہ اس نے ہمیشہ ایک

باضمیر آدمی کا کردار ادا کیا ہے۔

ای کے ہانگل جانتا ہے کہ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۳۹ء کے دوران ہٹلر کی فوج نے جرمنی میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں اور کمیونسٹ آرٹسٹوں پر کیا کیا مظالم ڈھائے تھے، آج وہی مظالم ہندوستان کی ہندو 'فاشسٹ' سیاسی جماعت 'شیو سینا' اپنے تنگ نظر رہنما بال ٹھاکرے کی ہدایت پر جمہوریت پسند اور پُرامن ہندو مسلمان آرٹسٹوں کے خلاف ڈھارہی ہے۔ اور اس نے اپنی سرگرمیوں سے بمبئی کی فلمی دنیا میں دہشت کی فضا قائم کر رکھی ہے لیکن ای کے ہانگل جیسے آرٹسٹ جانتے ہیں کہ شیو سینا جیسی فاشسٹ تنظیموں کے عروج کا زمانہ مختصر ہوتا ہے اور ان کے مظالم کا جرأت مندانہ مقابلہ انسان دوست آرٹسٹوں کے لیے بھی زندگی اور موت کا سوال بن گیا ہے۔ اسی لیے ای کے ہانگل نے شیو سینا کے رہنما بال ٹھاکرے کے سامنے گھٹنے خم کر دینے کی بجائے مردانہ وار مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر کے دنیا بھر کے جمہوریت پسند اور پُرامن سیکولر حلقوں کا سر اونچا کر دیا ہے۔''

عبدالخالق آزاد

'عبدالخالق آزاد' — 'عزیز سلام بخاری'، 'پیکر نقوی' اور 'فقیر محمد لاشاری' کے خاکے بھی دراصل جدوجہد کے ساتھیوں اور سیاسی رفیقوں کے خاکے ہیں جن میں ممدوحین کے سوانحی حالات تو زیادہ بیان نہیں ہوئے لیکن ان کی شخصیتوں کے بعض روشن پہلو ضرور سامنے آگئے ہیں۔ ان تمام خاکوں میں ان لوگوں کی سیاسی نظریات اور آدرش سے بے مثال کمٹ منٹ اور غیر معمولی وابستگی کا پتا چلتا ہے کہ ان لوگوں نے کس خلوص اور سچائی کے ساتھ شعوری طور پر ایک کٹھن راستے کو منتخب کیا تھا اور کیسے کیسے مشکل حالات میں بھی نہایت ایمان داری، لگن اور خلوص کے ساتھ زندگی بھر اپنے مقاصد، نظریات اور آدرش کی کامیابی کے لیے زندگیاں وقف کر دی تھیں۔

عبدالخالق آزاد کے خاکے کو جس انداز سے انھوں نے شروع کیا ہے وہی پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''۱۹۳۷ء۔ ۱۹۳۸ء کا زمانہ تھا جب مرکزی ہاری کمیٹی کے دفتر ٹنڈو جام میں ایک سولہ سترہ برس کا نوجوان داخل ہوا اور ہاری کمیٹی کے صدر کامریڈ عبدالقادر جو اُس وقت وہاں موجود تھے، سے کہنے لگا، ''سائیں میں ہاری کمیٹی میں کام کرنا

چاہتا ہوں۔ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام ہو تو مجھے بھی خدمت کا موقع دیجیے۔''

کامریڈ عبدالقادر نے نہایت گرم جوشی سے اس نوجوان کا خیر مقدم کیا اور اس کے حالات معلوم کیے تو پتا چلا کہ اس کا نام عبدالخالق آزاد ہے اور وہ میرو خان تعلقے کے کسی گوٹھ کے چھوٹے سے کھاتے دار کا بیٹا ہے اور میٹرک پاس ہے۔ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر مکمل طور پر انقلاب کی تحریک میں پورے انہماک کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہے۔ نوجوان کی آنکھوں کی چمک، لہجے کی استقامت اور ارادے کی پختگی سے متاثر ہو کر کامریڈ عبدالقادر نے اسے فوراً ہاری کمیٹی کے کاموں میں لگا لیا اور اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ ہاری کمیٹی کی جملہ سرگرمیوں میں شامل ہوتا چلا گیا اور کیٹی بندر سے لے کر اباوڑو تک ہونے والے سب چھوٹے بڑے جلسوں اور جلوسوں کا لازمی کردار بن گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابھی سندھ میں مسلم لیگ پیدا بھی نہ ہوئی تھی اور اسمبلی میں شیخ عبدالمجید سندھی واحد رکن تھے جو خود کو مسلم لیگی کہتے تھے۔ ہاری کمیٹی کے بیشتر رہنما اور کارکن زیادہ تر انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے جیسے عبدالقادر کھوکھر، ارباب نور محمد پلیجو، قادر بخش نظامانی سندھ اسمبلی کے رکن محمد امین کھوسو، مولوی نذیر حسین جتوئی، مولوی عزیز اللہ جروار، مولانا الٰہی بخش قریشی وغیرہ ہاری کمیٹی کے سرگرم کارکن بھی تھے اور انڈین نیشنل کانگریس کے ممبر بھی تھے۔ کانگریس میں شامل یہی وہ ترقی پسند عناصر تھے جنھوں نے بعد ازیں سندھ میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی قائم کی تھی اور پورے ہندوستان کے سوشلسٹ جو آزادیِ ہند کی تحریک میں کانگریس کی ہم نوائی کرتے تھے، کانگریس سوشلسٹ پارٹی میں شامل تھے، یہ کانگریس کے اندر بائیں بازو والوں کا ایک مضبوط گروپ تھا جو کانگریس کی سیاست کو فرقہ وارانہ عصبیت سے محفوظ اور محنت کش طبقات اور عوامی مفادات کے دائرے میں سرگرمِ عمل رکھنے کے لیے اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد تھی لیکن جرمنی اور ان کی حلیف قوتوں (Axis-power) نے سوشلسٹ روسی بلاک پر حملہ کر کے دنیا بھر کی سوشلسٹ طاقتوں کو بھی میدانِ جنگ میں کھینچ لیا تو حالات میں تبدیلی ہوئی اور بہت سے سوشلسٹوں نے انگریز کی فوج میں بھی شامل ہونا شروع کیا۔ چنانچہ عبدالخالق آزاد بھی رائل انڈین نیوی میں ایک خلاصی کی حیثیت سے بھرتی

ہو گئے اور فروری ۱۹۴۶ء میں بمبئی کی نیوی کی بغاوت کی رہنمائی کرنے والی سینٹرل اسٹرائیک کمیٹی کا ممبر بن گئے تھے۔''

عبدالخالق آزاد کے خاکے میں سوبھو گیان چندانی نے انیس سو چالیس بیالیس کے آس پاس ہندوستان کی سیاسی فضا اور سماجی صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس ماحول کو واضح کیا ہے جس میں ان کے ممدوح کی سیاسی شخصیت کے نقوش اچھی طرح ابھر سکے ہیں۔ انڈین نیوی سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ سندھ واپس آ کر دوبارہ ہاری کمیٹی کی تحریک میں سرگرم عمل ہو گئے تھے۔ چونکہ شروع شروع میں وہ بہت مشہور نہ تھے اور اپنے آپ کو ذرا پچھلی صف ہی میں رکھنا پسند کرتے تھے، اس لیے خفیہ پولیس والوں سے آسانی کے ساتھ بچ نکلتے تھے۔

سوبھو صاحب نے ایک واقعہ سناتے ہوئے لکھا ہے:

''ایوب خاں کے مارشل لا کے زمانے میں ایک دن جیل میں صبح کی ورزش اور سیر سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے تو کھچڑی داڑھی اور سفید بالوں والا ایک آدمی ان کے پاس آ کر بیٹھا۔ پہلے تو انھوں نے اسے پہچانا ہی نہیں لیکن جب اس نے ہاتھ ملا کر بات کرنی شروع کی تو آواز سے پتا چلا کہ یہ عبدالخالق آزاد ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ رات ہی گرفتار ہوا اور سب سے پہلے اسے داڑھی صاف کرنے کا سامان دیا جائے تا کہ وہ اس سے فوری نجات حاصل کرے کیوں کہ تھوڑی دیر میں پولیس کا فوٹوگرافر اس کی تصویر لینے آ جائے گا۔ داڑھی صاف کرنے کے بعد نلکے سے منھ ہاتھ دھویا تو ایک خوب صورت دل کش چیز نکل آئی۔ پولیس والے آئے تو وہ بھی اس نوجوان کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ کہنے لگے ہمیں تو تمھاری داڑھی سمیت فوٹو لینی تھی۔ خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ عبدالخالق نے اپنی گرفتاری کا واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ کل رات ہم لوگ میر رسول بخش تالپور کے بنگلے پر میٹنگ کر رہے تھے جہاں بہت دیر ہو گئی تھی۔ واپسی پر خفیہ پولیس والے پیچھے لگ گئے۔ ایک سنسان جگہ روک کر پوچھا تم کون ہو اور اس وقت میر رسول بخش تالپور کے بنگلے پر کیا کر رہے تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں میر صاحب کا ایک ہاری ہوں اور بیج لینے آیا تھا اور چونکہ دیر ہو گئی تھی اس لیے میر صاحب نے صبح پھر بلایا ہے۔ پولیس والوں کی تسلی نہ ہوئی اور مجھے رات بھر انھوں نے حوالات میں بند رکھا اور صبح میر صاحب کو فون پر بتایا کہ رات ایک شخص آپ کے بنگلے کے باہر گھومتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔ وہ خود کو آپ کا ہاری بتاتا ہے، میر صاحب

ہوشیار آدمی تھے، کہنے لگے ذرا اس آدمی سے میری فون پر بات کراؤ اور میری آواز سن کر انھیں بتایا کہ ہاں یہ میرا ہاری ہے اور مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ تم اسے میرے پاس بھیج دو۔ مگر پولیس والے بھی کچھ ایسی کچی گولی کھیلے ہوئے نہ تھے۔ ویسے بھی انھیں میرے تھیلے سے ایک کتاب سیاسی نوعیت کی دستیاب ہوگئی تھی۔ لہٰذا انھوں نے افسرانِ بالا سے مشورہ کیا اور مجھے باقاعدہ گرفتار کر کے یہاں بھیج دیا ہے۔''

عبدالخالق آزاد سے اپنی آخری ملاقات کو یاد کرتے ہوئے سوبھو صاحب نے لکھا ہے:

''ادھر میں برسوں گوٹھ میں نظر بند رہا اور عبدالخالق آزاد بھی قید سے رہائی پانے کے بعد گویا کہیں گم ہوگیا تھا کہ ۶۸۔۱۹۶۷ء میں لاڑکانہ میں ایک دن کسی لیبارٹری کی دوائیوں کا بڑا سا تھیلا اٹھائے مل گیا۔ ہم دونوں نے تڑپ کے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ معلوم ہوا عبدالخالق نے شادی کر لی ہے اور اب ایک ننھی سی بچی کا باپ بن چکا ہے۔ کن کے ڈاکٹر تحلول کی لیبارٹریز کے نمائندے کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ زندگی ٹھیک گزر رہی ہے لیکن وہ پاکستان کی سیاست سے کم و بیش بیزار ہو چکا تھا۔ آخر تیں پینتیس برس کی سیاسی جدوجہد کے بعد عبدالخالق آزاد کے اس ردِعمل کو سوبھو ایک سوال کے طور پر ابھارتے ہیں۔''

کامریڈ عزیز سلام بخاری

سوبھو گیان چندانی کی اکیس سوانحی خاکوں اور مضامین پر مشتمل کتاب ''**وڏي وٿ ھنام**'' (وڈی وٹھ ھنام) (بلند و بالا لوگ) میں بعض تحریریں ایسی ہیں جو شاید خاکہ نگاری کے متعین اصولوں پر پورا نہ اتر سکیں اور ان کا مقصد بھی خاکہ نگاری معلوم نہیں ہوتا کہ ان میں سوبھو صاحب اپنے ممدوح کی بابت یادداشت میں محفوظ چند گوشوں کی رونمائی کرتے ہیں۔ مثلاً کامریڈ عزیز سلام بخاری اور پیکر نقوی کی بابت ان کی تحریریں خاکوں سے زیادہ تاثراتی مضامین کی ذیل میں آتے ہیں جن میں انھوں نے دراصل اپنے قدیم نظریاتی آدرش وادی رفیقوں کی اپنے آدرش، نظریوں، اصولوں اور مقاصد سے اٹوٹ، اَن تھک اور غیر مشروط خلوص اور لگن کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور ان کی قربانی کے اس جذبے کی نشان دہی کی ہے جس کے تحت ان لوگوں نے نہ صرف اپنی بلکہ اپنے اہلِ خاندان تک کو انقلاب کی راہ میں

بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ ان مضامین میں سوانحی کوائف بہت کم ہیں لیکن پھر بھی وہ کردار کے جن پہلوؤں کو ابھارنا چاہتے ہیں، اس کے لیے ضروری پس منظر بیان کردیتے ہیں۔ عزیز سلام بخاری کے بارے میں وہ بتاتے ہیں:

''بخاری صاحب الٰہ آباد کے رہنے والے تھے اور ان کے خاندان کے لوگ پاکستان میں خوش حال تھے لیکن اس کے باوجود پاکستان آتے ہی خود کو ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے لیے وقف کردیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد کی جیل یاترا کے دوران بخاری صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بخاری عجیب آدمی تھا۔ جیل میں ملتے ہی کہنے لگا کہ پہلے مجھے سندھی زبان سکھاؤ کیوں کہ میں اپنے سندھی دوستوں سے سندھی ہی میں بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ ان کے اس شوق کو دیکھ کر سوبھو صاحب نے ان کے لیے ایک نوٹ بک تیار کی جو اب تک ان پاس محفوظ ہے۔ عزیز سلام نے نہ صرف سندھی سیکھی بلکہ بحث مباحثے کے دوران بھی سندھی ہی میں بات کرنا پسند کرتا تھا۔ متعدد نظریاتی مسائل پر پندرہ پندرہ، بیس بیس صفحات پر مشتمل مناظراتی ٹائپ مضمون لکھتا اور پھر دوستوں میں بحث مباحثے کے لیے سرکولیٹ کرتا تھا کیوں کہ اس کو انڈر گراؤنڈ رہتے ہوئے ان کاموں کے لیے کافی وقت مل جایا کرتا تھا۔ وہ جب ملتا، پوچھتا، آپ نے فلاں موضوع پر میرا نوٹ پڑھا ہے۔ اس بابت آپ کی کیا رائے ہے۔ میں جواب دیتا، بھائی پڑھنے کا وقت ہی کہاں ملا ہے۔ وقت تو بس جیل میں ملتا ہے تو وہاں پڑھنے کی اور بہت سی چیزیں منتظر ہوتی ہیں۔ مارکس اور انجلز وغیرہ کی کتابیں بھی پڑھنی ہوتی ہیں۔ اس پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہوتا تھا۔ عزیز سلام بخاری لاڑکانہ آئے تو دیکھتے دیکھتے نہ صرف لاڑکانہ کے سیاسی و سماجی ماحول میں اپنے لیے قابلِ احترام جگہ پیدا کرلی بلکہ پورے سندھ کا اڑن کھٹولے پر چکر لگا آئے اور ایک ایسی تفصیلی رپورٹ پیش کی جس میں سارے سندھ کی لیفٹ ورکرز کی کارکردگی کا نام بنام جائزہ لیا گیا تھا اور آئندہ کے لیے اُن کے کردار کا تعین کیا گیا تھا۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول اور چیزوں کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کرتا تھا اور جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا تھا، اسے محنت اور جفاکشی کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش میں لگ جاتا تھا۔ لیکن اس کے مزاج میں عجلت پسندی بہت تھی۔ آخر آخر میں سنا ہے عزیز سلام بخاری کا سیاسی رجحان چین اور ماؤ کی طرف ہوگیا تھا۔ ٹنڈو محمد خان میں کسی اہم میٹنگ میں شرکت کے

لیے گئے تھے، راستے میں دیر ہوگئی تھی لیکن منزل پر جلد از جلد پہنچنے میں ایسی سخت
تگ و دو کی کہ راستے ہی میں ہارٹ اٹیک ہوا اور اپنے مقصد کی راہ میں جان
دے دی۔ عزیز سلام بخاری ان چند لوگوں میں سے تھے، جنھوں نے سندھ کو
دل و جان کے ساتھ اپنا وطن بنایا۔ سندھی سیکھی اور سندھ میں بہتر معاشرے کے
قیام کے لیے جد و جہد کرتے ہوئے جان دے دی۔''

پیکر نقوی

اسی طرح پیکر نقوی پر لکھے گئے مضمون میں بھی ایک سچے آدرشی انسان کا روپ پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ پیکر نقوی جیسے لوگ وہ ہیں جو انقلاب کی تاریک راہوں کو روشن بنانے کے لیے اپنے وجود کو خاکستر کر جاتے ہیں۔ یہ لوگ مجسم قربانی اور مکمل ایثار کی تصویر ہوتے ہیں۔

گلی سدا رنگانی، فقیر محمد لاشاری اور کرشن کھٹوانی پر لکھے گئے مضامین بھی دراصل ان شخصیتوں کے مکمل پیکروں کو ابھارنے کی بجائے ان کے کسی ایک آدھ پہلو ہی کو اجالتے ہیں اور دراصل ان صاحبان کی بابت سوبھو صاحب نے اپنی یادداشتوں کو رقم کیا ہے۔

اسی طرح جسٹس علی نواز بڈھانی اور ڈاکٹر انور علی شیخ پر لکھے گئے مضامین میں دو ایسے انسانوں سے تعارف کرایا گیا ہے جو ہر چند ان کے ہم مشرب اور سیاسی ساتھی تو نہ تھے بلکہ ان کا شمار اعلیٰ سرکاری عہدے داروں میں ہوتا تھا اور جو اپنے منصب سے وابستہ ذمے داریوں کا شدید احساس رکھتے تھے اور انصاف پسندیت، انسان دوستی اور مظلوم کی دادرسی میں کسی مصلحت کو حائل نہیں ہونے دیتے تھے۔

> ''ڈاکٹر انور علی شیخ کے کردار میں ہم ایک ایسے تمثیلی انسان سے ملتے ہیں جو اپنے اسپتال کے باہر میدان میں درختوں کے سائے میں پڑے ہوئے غریب و مفلس ہاریوں، کسانوں اور بے کس لوگوں کو مفت انجکشن لگاتا پھرتا ہے۔ ان کے مفت علاج معالجے کے ساتھ ان کی دیکھ ریکھ بھی کرتا ہے اور مجبور و مقہور انسانوں کی دل جوئی کر کے ان کے دکھ درد میں جس حد تک ممکن ہو سکے، کمی کرنے کی سعی کرتا رہتا ہے۔''

محمد ابراہیم جویو

محمد ابراہیم جویو پر اظہار خیال کرتے ہوئے سوبھو صاحب نے جدید سندھی ادب کی تعمیر و توسیع میں ابراہیم جویو کی خدمات کو فراخ دلانہ خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اور لکھا ہے:

''قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی سے ابراہیم جویو نے ہر دور میں کسی نہ کسی انداز میں سندھی زبان وادب کی ترقی کے لیے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔''

انھوں نے لکھا ہے:

''ابراہیم جویو ایک ایسا ادیب، محقق، عالم، دانشور اور سیاسی گروہ ہے جس نے سندھ کے نہ صرف کئی بڑے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو سندھی ادب میں متعارف کرایا ہے بلکہ لکھنے اور پڑھنے والوں کی کئی نسلوں کی ذہنی تربیت بھی کی ہے۔ اور دیکھا جائے تو ہم سب جو جدید سندھی ادب کی موجودہ ترقی اور وسعت پر خوش ہوتے ہیں دراصل ابراہیم جویو کے قرض دار ہیں جس نے گزشتہ نصف صدی میں سندھی زبان وادب کی تاریخ کو نئے معنی اور نئے مستقبل سے ہم کنار کیا ہے۔''

سوبھو صاحب نے لکھا ہے:

''ابراہیم جویو سے ان کا پہلا تعارف قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اس وقت ہوا تھا جب اس کی کتاب ''سندھ کو بچاؤ— کہ برعظیم کو بچاؤ'' (Save Sind, save the continent) نے ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ اور جسے حکمرانِ وقت نے باغیانہ کتاب قرار دے کر اس پر پابندی عائد کر دی تھی اور ابراہیم جویو کو ملازمت سے برطرف کر دیا تھا جس کے خلاف سندھ مدرسہ کراچی کے اساتذہ اور طالب علموں نے صدائے احتجاج بلند کی تھی۔

ابراہیم جویو کا سب سے عظیم کام سندھی ادبی بورڈ کی تنظیم نو ہے۔ اس نے ۱۹۵۹ء میں سندھی ادبی بورڈ کو ایک ایسا فعال ادارہ بنانے کی مہم کا آغاز کیا جو دیکھتے دیکھتے جدید سندھی ادب ہی کا نہیں بلکہ جدید سندھ کا سب سے نمائندہ اور متحرک ادارہ ثابت ہوا۔ اس وقت اس ادارے کے اراکین میں محمد ایوب کھوڑو، علامہ آئی آئی قاضی، جی ایم سیّد، میراں محمد شاہ وغیرہ تھے۔ ابراہیم جویو نے سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے ابتدائی طور پر عالمی زبانوں اور ادب کے ڈھائی سو سے زائد شاہ پاروں کو سندھی زبان میں منتقل کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور اس کام کے لیے سندھی ادیبوں اور دانشوروں کی ایک ایسی تازہ دم جماعت تیار کی جس نے آگے چل کر سندھی زبان وادب کو بہت جلد ترقی پذیر زبان وادب میں شامل کر دکھایا۔ اسی طرح سندھ پر لکھی گئی قدیم حوالہ جاتی کتابیں جو فارسی، عربی اور انگریزی وغیرہ میں تھیں، انھیں بھی سندھی زبان میں ترجمہ کرنے کا کام وسیع

پیمانے پر کیا گیا۔ یہ سب خدمات ابراہیم جویو نے غیر معمولی جاں فشانی، محنت، لگن اور ایثار کے ساتھ انجام دی ہیں کہ ان جیسی لگن، انہماک اور علمی بصیرت کوئی دوسری مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ ابراہیم جویو برسوں چوکیداروں اور چپراسیوں کے لیے مخصوص کمروں میں رہتا رہا ہے تاکہ سندھی ادبی بورڈ کے کام کی نگرانی کرتا رہے اور اپنی زندگی کا ایک ایک پل زبان و ادب اور ثقافت کے فروغ کے لیے نذر کرتا رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا (۱۹۲ء۔۱۹۵۴ء) جب سندھی ادبی بورڈ کا دفتر سابقہ پرائمری ٹریننگ کالج کراچی یعنی موجود این جے وی ہائی اسکول کی عمارت میں واقع تھا۔ اس زمانے میں سندھی ادبی سنگت کے ہفتہ وار اجلاس بھی یہیں ہوتے تھے جن میں نامور ادیب حفیظ شیخ، سراج میمن، رشید اخوند، خواجہ سلیم، ایاز قادری اور کئی دوسرے اہم اور نوجوان لکھنے والے شریک ہوتے تھے۔ ابراہیم جویو ان نشستوں میں اپنی تنقیدی بصیرت اور عالمانہ نکتۂ نظر کو ایسی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ پیش کرتا تھا جس سے نئے لکھنے والے بہت کچھ حاصل کر کے اٹھتے تھے۔

سندھی ادب کے نمائندہ رسالے ''**مہران**'' کی اجرائی بھی ابراہیم جویو کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ یہ وہ کام ہے جس نے سندھ میں صحت مند ادبی صحافت کی بنیاد ڈالی ہے اور ابراہیم جویو نے کتنے ہی نئے لکھنے والوں کی نیم پختہ تحریروں کو بنا سنوار کر ''مہران'' میں شائع کی ہیں اور نئے لکھنے والوں کو اظہار اور ابلاغ کے نئے راستے دکھائے ہیں۔ یہاں تک کہ شیخ ایاز کی ادبی شخصیت کے بنانے سنوارنے میں بھی ابراہیم جویو کا خاص کردار رہا ہے۔ سندھی کے کتنے ہی جدید شاعر، افسانہ نگار، مضمون نگار اور محقق ایسے ہیں جن کی ذہنی تربیت ابراہیم جویو کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ سندھی زبان اور ادب کی ترقی، ترویج، فروغ اور اصلاح کے لیے جتنی تجاویز اور اسکیمیں گزشتہ نصف صدی میں سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر پیش ہوتی رہی ہیں، ان سب میں کسی نہ کسی طرح ابراہیم جویو کی عملی شرکت رہی ہے۔ ابراہیم جویو نے بے شک اپنے نام سے بہت کم لکھا ہے اور بیشتر اس کے کام کا کریڈٹ کسی اور کو دیا جاتا رہا ہے لیکن اس کے باوجود ابراہیم جویو کی مختلف تحریروں کو بھی اگر یکجا کر دیا جائے تو اس سے کئی کتابیں مرتب کی جاسکتی ہیں۔

اپنے مذکورہ بالا مضمون میں سوبھو صاحب نے ابراہیم جویو کو سندھی زبان، ادب

اور ثقافت کا ایک ایسے گم نام سپاہی کا نام دیا ہے۔جس کی چھاپ اور شناخت جدید سندھی ادب اور ذہن پر نمایاں ہے۔انھوں نے ابراہیم جویو کو ایسا ادبی ڈائنمو اور پاور ہاؤس قرار دیا ہے۔جس سے ہزاروں بیٹریاں چارج کی جاسکتی ہیں۔قومی ثقافت کی تاریخ میں ابراہیم جویو جیسی شخصیات ہی ہوتی ہیں جو قوم تہذیب، زبان، ادب اور ثقافت کا اصل اعزاز اور وقار قائم رکھتے ہیں۔''

آخر میں ہم ''رئیس غلام مصطفیٰ بھرگڑی'' اور ''لالہ بشیر'' پر لکھے گئے خاکے پر توجہ دلانا چاہتے ہیں کیوں کہ ان دو خاکوں میں خاکہ نگاری کے تقاضوں کی مکمل پاس داری کا احساس ہوتا ہے۔ ہر چند یہ دونوں خاکے بھی مختصر ہیں اور ان میں بھی سوانحی کوائف و حالات کم کم ہی دیے گئے ہیں۔لیکن ان کے مطالعے سے ان شخصیتوں کے بنیادی خدوخال ضرور ابھر آتے ہیں۔

''رئیس غلام مصطفیٰ بھرگڑی، رئیس غلام محمد بھرگڑی مرحوم کے بیٹے اور غلام رسول بھرگڑی کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ سندھ کے اہم ترین سیاسی خاندانوں میں شامل ہے۔ اور ان کا خاندان ہر دور میں سندھ کی سیاست میں سرگرمِ عمل رہا ہے۔رئیس غلام مصطفیٰ بھرگڑی پاکستان بننے سے قبل بھی (۱۹۴۶ء) میں سندھ کی صوبائی اسمبلی کے منتخب رکن رہے تھے اور ایک وقت تھا جب وہ بیک وقت کانگریس اور مسلم لیگ کی مشترکہ تحریکوں مثلاً تحریکِ خلافت اور برطانوی حکومت کے خلاف چلائی جانے والی ''ہندوستان چھوڑ دو تحریک'' میں سرگرمِ عمل رہے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد وہ جی ایم سیّد کے ساتھ زیادہ تر مسلم لیگ مخالف تحریکوں میں شامل ہوئے۔''

اس خاکے میں سوبھو صاحب غلام مصطفیٰ بھرگڑی کی صاف گوئی اور حسِ مزاح کو خاص طور پر ابھارا ہے۔ اور بہت زیادہ فلسفیانہ اور منطقی باتیں کرنے کی بجائے سیدھی سادی زبان میں مزاحیہ اور طنزیہ فقرے ہی میں اپنا مافی الضمیر بیان کر دیتے تھے۔جس کی کئی مثالیں سوبھو صاحب نے اس خاکے میں بیان کی ہیں۔

''لالہ بشیر — کون تھا؟ وہ ایک فوجی کرنل کا بیٹا تھا۔تعلیم و تربیت اچھے ماحول اور نسبتاً معیاری اسکولوں میں ہوئی تھی۔ بہترین انگریزی بولتا اور لکھتا تھا۔ دنیا کی بہترین کتابیں اس کے مطالعے میں رہی تھیں۔ باپ پٹھان تھا، ماں پنجابی، دادا رند بلوچ۔لیکن وہ خود کیا تھا اس کا اندازہ کسی کو نہیں تھا۔ وہ مسلمان تھا کہ قادیانی، ہندو، مارفانی، چولیانی تھا۔ دنیا بھر کے چور اُچکوں، صوفی اور ملک کے سب لچے لفنگوں کو وہ خوب جانتا تھا۔ وہ خود ایک آزاد رو آدمی تھا جسے کسی ایک

جگہ بیٹھ رہنے کی نہ تو توفیق تھی اور نہ ہمت۔ اسے نہ تو شراب کی عادت تھی اور نہ بیڑی سگریٹ کی لت۔ اس کے شوق بس عجیب وغریب تھے۔ اسے بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں برتنے کا شوق تھا۔ دل کا سخی بھی بہت تھا۔ اپنی قیمتی سے قیمتی چیز آپ کو دے دینے میں ہچکچاہٹ نہ دکھاتا۔ اگر جیب میں پیسے ہیں تو دوستوں پر لٹا دے گا اور جیب خالی ہے تو اسے مانگ لینے میں بھی کوئی عذر نہ تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا۔ شروع شروع میں تعلیم وتدریس کا پیشہ اختیار کیا تھا اور ضلع لاڑکانہ میں اس کے اچھے خاصے شاگرد موجود تھے۔ لاڑکانہ کے معروف وکیل ممتاز جعفری کی شاگردی میں وکالت بھی سیکھی تھی اور اگر وہ دل لگا کر وکالت کرتا تو بہت کامیاب وکیل ہوتا لیکن اس کے لیے کسی ایک جگہ ہفتے دو ہفتے اور مہینے دو مہینے سے زیادہ ٹک کر رہنا اور کام کرنا مشکل ہوتا تھا۔ اسے مستقل مزاجی سے ایک قسم کا بیر تھا۔ اس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ بس مہران ہوٹل لاڑکانہ کے ایک کمرے میں بسیرا کر لیا تھا اور اب یہی اس کا مستقل پتا ہے۔ پچیس چھبیس برسوں کے بعد ماں اور بہنیں ڈھونڈتی ہوئی آئیں تو اسی ہوٹل کی معرفت آخر باڈرہ نامی گاؤں سے اسے برآمد کر کے اپنے ساتھ پشاور لے گئیں۔ لیکن وہ پھر دو چار مہینوں میں لوٹ آیا تھا۔ سنا ہے پشاور میں کسی وکیل کے پاس کام بھی کیا تھا۔ پھر فرنٹیئر پوسٹ پشاور بیورو میں چیف بھی ہو گیا تھا لیکن وہاں سے بھاگ کر کراچی چلا آیا۔ کبھی جہاز کا کرایہ کسی دوست سے لیتا اور ٹرین اور بس کا کسی اور دوست سے، بس اس طرح اس کی گزر بسر ہوتی تھی۔ پھر خبر آئی کہ وہ سعودی عرب چلا گیا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ نہیں وہ ملک کے اندر ہی ہے اور اسے پولیس میں نوکری مل گئی ہے۔ اور وہاں دیکھتے دیکھتے پولیس محکمے میں بغاوت کرا دی۔ اور اسے دو تین ہفتے جیل بھگتنے کے بعد استعفیٰ دے کر اپنی جان چھڑانی پڑی۔ کسی روڈ بلڈنگ کمپنی میں نوکری کی اور کچھ عرصے خضدار کے علاقے میں کمپنی کا کام کیا جہاں مزدوروں میں کمپنی کے خلاف تحریک چلا دی اور مزدوروں کی طرف سے سپریم کورٹ میں ہیومن رائٹس (Human rights) کے خلاف ورزی کے جرم میں مقدمہ چلوا دیا۔ جب بھی اسے کہیں نوکری مل بھی جاتی تھی تو وہ چند دن سے زیادہ نہ چلتی تھی۔ پھر وہ بہت دنوں کے لیے سوبھو صاحب کے پاس آن ٹکا تھا۔

لوگوں نے انھیں خبردار کیا کہ حکومت نے جاسوسی کرنے کے لیے اسے تم پر لگا رکھا ہے لیکن انھوں نے کہا:
''بھئی میرے پاس آخر چھپانے کی چیز کیا ہے جسے معلوم کرنے کے لیے کسی
جاسوس کی ضرورت پیش آئے گی۔''

سوبھو صاحب نے لالہ بشیر کی شخصیت میں ایک ایسے دلچسپ کردار کی عکاسی کی ہے جو اپنے لااُبالی پن کے باوجود سوسائٹی پر وبالِ جان نہیں بنتا جس کے نزدیک روپے پیسے اور مال و دولت کی کوئی اہمیت ہی نہیں لیکن اس کی زندگی ہر قسم کی مقصدیت سے عاری ہونے کی وجہ سے یک گونہ انتشار کی شکار رہتی ہے۔ سوبھو صاحب کی یہ تحریر دراصل معاشرے میں ایسے کرداروں کی نشان دہی کرتی ہے جن کی کوئی شناخت نہیں ہوتی لیکن جن کا وجود اپنے اردگرد کی فضا کو متاثر ضرور کرتا ہے۔

معاصرین کا خراجِ تحسین

ذیل میں سوبھو گیان چندانی کی شخصیت اور کارناموں کی بابت چند اہم معاصرین کی آرا پیشِ خدمت ہے۔

شیخ ایاز

''سوبھو گیان چندانی جیسی آزاد طبیعت اور گہری صداقت کی حامل شخصیت میں نے کسی دوسرے میں نہیں دیکھی ہے۔ وہ ایک پہاڑ کی طرح اٹل شخص ہے جسے کوئی آندھی، کوئی طوفان ڈانوا ڈول نہیں کر سکتا۔ نہ جانے ایسے کتنے لوگ ہوں گے جو اپنے چھاتی کے زخموں کی بہار سجا کر سر کو بلند رکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور گونا گوں مظالم سے دلیرانہ طور پر نبرد آزما چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس جنگ میں دشمنوں سے لڑتے لڑتے لہولہان ہو کر اسی مٹی کا رزق بن جاتے ہیں، جس کے وقار کے تحفظ کے لیے انھیں اپنی جان کی بھی پروا نہیں ہوتی اور جب ظلم اپنی انتہا پر پہنچ جاتا ہے اور کامران زندگی، خوش حالی کی ڈولی میں سوار ہو جاتی ہے تو یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس کی سواری کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر چلتے ہیں اور اپنی شخصی محرومیوں پر اُف تک نہیں کرتے۔

> ''کچھ مدت ہوئی پاکستان کے ایک معروف سیاست دان سے جنھیں برٹینڈ رسل اور سارتر جیسے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا، میری ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ لاڑکانہ جا رہے ہیں۔ سکھر میں کسی نے ان سے پوچھا، کیا وہ موئنجو دڑو دیکھنے لاڑکانہ جا رہے ہیں؟ انھوں نے جواب میں کہا کہ میں موئنجو دڑو سے بھی زیادہ عظیم زندہ حقیقت سے ملنے لاڑکانہ جا رہا ہوں جس کا نام سوبھو گیان چندانی ہے۔''

شیخ ایاز نے ابراہیم جویو کے نام اپنے خطوط کے مجموعے ''جي ڪاڪ ڪکوريا ڪاپڙي'' (کاک ککوریا کاپڑی) (یہ شاہ لطیف کی ابیات کا ایک مصرع ہے جس کے معنی ہیں ''کاک کی مٹی میں

رنگا ہوا سنیاسی'') کو سوبھو گیان چندانی کے نام معنون کیا ہے اور انتساب کرتے ہوئے شاہ عبداللطیف بھٹائی کا ایک مصرع استعمال کیا ہے:

''عاشق زهر پياڪ وهہ ڏسي وهسن گهڙون''

''عاشق زہر پیاک وھہ ڈسی وھسن گھڑون''

(یعنی عاشق زہر پینے کے عادی ہیں اور زہر پی پی کے مسرور ہیں)

اس انتساب میں شیخ ایاز نے مزید لکھا ہے کہ:

''سوبھو ہمارا لال قلندر ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی سمادھی پر میلہ لگے گا۔ سوبھو کو بندی گوٹھ میں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔''

شیخ ایاز نے سوبھو گیان چندانی کے سوانحی خاکوں اور مضامین کے مجموعے ''وڏي وٽ هنام'' (وڈی وٹ ھنام) کے دیباچے میں لکھا ہے:

''جب مجھے کہا گیا کہ مجھے سوبھو کی خاکوں اور مضامین کی کتاب پر پیش لفظ لکھنا ہے تو میں یہ سمجھا تھا کہ یہ کتاب بھی کوئی شیر اور مگرمچھ کی داستان کی طرح خوف ناک کتاب ہوگی جیسے اسحاق تبل (Issac Bible) کی کہانیوں کی کتاب ''سرخ فوج'' یا شولوخوف کے ناول ''اور ڈان بہتا رہا''۔ لیکن جب میں نے اسے پڑھا تو اس میں مجھے گورکی اور چیخوف والا حقیقت پسندانہ انداز اور ٹالسٹائی جیسا دھیما پن، انکسار اور انسانی فطرت کی تصویر کشی نظر آئی۔ دراصل یہ طرز نگارش منشی پریم چند اور گرودیو ٹیگور کے اسلوب کے قریب تر ہے۔ یہ بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انقلاب سے قبل کا روسی ادب اور منشی پریم چند کی کردار نگاری کے سوا سوبھو کی کردار نگاری نہایت اعلیٰ اور بے مثال ہے کہ ان میں غریب اور درمیانہ طبقوں کے ایسے لوگوں کو اپنا مرکز نگاہ بنایا گیا ہے جو عام طور پر کسی شمار قطار ہی میں نہیں آتے۔

سوبھو نے نظر انداز کر دینے جانے والے لوگوں کے منفرد کردار پیش کیے ہیں۔ میں نے یک دفعہ سوبھو کو کہا تھا کہ میری تمھاری دوستی نظریاتی نہیں بلکہ ذاتی اور شخصی ہے۔ اگر میں نے یہ کتاب پہلے پڑھی ہوتی تو کہتا کہ نہیں میری تمھاری دوستی نظریاتی بھی ہے۔ سوبھو فیوڈل طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور اس نے اپنے گاؤں بندی کے آس پاس کی بہت اچھی منظر کشی کی ہے۔ اس نے ان ہی لوگوں

کے کرداروں کو پیش کیا ہے جن سے اسے زندگی میں واسطہ پڑا ہے۔

ایک حقیقت نگار ادیب کی طرح اس نے بھی کردار نگاری اور منظر نگاری پر زیادہ توجہ دی ہے اور تشبیہ و استعارے اور آرٹ کی دوسری خوبیوں پر کم توجہ صرف کی ہے لیکن اس کی تحریر کے تاثر میں کوئی کمی پیش نہیں آتی کہ حقیقت کی سچی عکاسی نے ان تحریروں میں فکری گہرائی پیدا کردی ہے۔''

محمد ابراہیم جویو

''ہر دور اپنے بطن سے بعض ایسے نادر افراد پیدا کرتا ہے جو اپنے شعور اور عملی کردار کے ذریعے نہ صرف اپنے عہد اور ماحول کو متاثر کرتے ہیں بلکہ وسیع تر سماج اور تاریخ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اکثر پورا عہد ہی ان غیر معمولی افراد سے منسوب کیا جانے لگتا ہے۔''

''میرے عزیز ساتھی اور دوست سوبھو گیان چندانی نے سن چالیس کی دہائی میں اپنا شعوری سفر شروع کیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کی آزادی اور سوراج کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ دوسری عالمی جنگ نے دنیا کو ایک فکری انتشار اور تناؤ میں مبتلا کر رکھا تھا اور ہر نوجوان اپنے اردگرد گرم ہوتی ہوئی فضا کی تپش محسوس کر رہا تھا۔ سوبھو گیان چندانی شانتی نکیتن سے تعلیم حاصل کر کے کراچی واپس آچکے تھے اور آتے ہی اسٹوڈنٹ مومنٹ کی قیادت سنبھال لی تھی اور اس کے بعد سندھ سے وابستہ ہر تحریک میں وہ سرگرم عمل ہوتے چلے گئے تھے۔ سوبھو نے اپنے وسیع مطالعے کی روشنی میں اس بات کا شعور حاصل کرلیا تھا کہ دنیا شروع ہی سے دو طبقات میں بٹی چلی آتی ہے۔ ایک طبقہ ان محنت کشوں اور تخلیق کاروں پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنی محنت، مشقت اور تخلیقی صلاحیت سے دنیا کے پیداواری وسائل میں اضافہ کرتے ہیں اور دوسرا طبقہ ان مخصوص لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنی طاقت اور چالاکی سے کام لے کر زیادہ سے زیادہ پیداواری وسائل کو اپنے قبضے اور تصرف میں کرتے رہتے ہیں اور عام آدمی کو پیداواری وسائل سے محروم رکھتے ہیں۔ وہ محنت کشوں کو ان کی محنت کا بہت کم معاوضہ ادا کر کے زائد پیداواری وسائل کو اپنی دولت کا حصہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ نتیجے میں مظلوم محنت کشوں اور ظالم سرمایہ داروں کے درمیان مسلسل کش مکش اور

جدو جہد پیدا ہوتی ہے اور اس طرح تاریخ کا جدلیاتی نظام وجود میں آتا ہے، ہر دور کے باضمیر افراد اور دانشور اس جدو جہد میں ظلم کے خلاف لڑنے والی قوتوں کی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔

ہم اور سوبھو گیان چندانی ایک ہی منزل کے راہرو رہے ہیں۔ میں فکری اعتبار سے ایم این رائے کے خیالات سے متاثر تھا جب کہ وہ شروع ہی سے انڈین کمیونسٹ پارٹی کے زیرِاثر تھے لیکن جہاں کہیں سندھ کے وقار اور مفاد کا معاملہ درپیش ہوتا، ہم سب ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے تھے بلکہ سوبھو گیان چندانی ہم سے آگے ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے ان کا شمار سندھ کی قومی تحریکوں کے ہراول رہنماؤں میں کیا جانا چاہیے۔ سوبھو گیان چندانی کا نام جب بھی زبان پر آتا ہے تو ذہن کی کینوس پر ایک ایسے جری اور دانش مند شخصیت کا خاکہ ابھرتا ہے جو اپنے مقصد اور آدرش سے نہ صرف کمیٹڈ ہے بلکہ اس کی کامیابی کے لیے ہر ایثار اور قربانی کے لیے بھی ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ اس کا آدرش غریب، مظلوم اور دھتکارے ہوئے طبقات کو ظلم واستحصال سے نجات دلا کر پُر وقار زندگی کی محفل میں شامل کرنا ہے۔ وہ ہمیشہ جمہوری، معاشی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی مساوات کی دائمی اقدار میں یقین رکھتا رہا ہے اور اپنے معاشرے میں ان کی بحالی اور فروغ کے خواب دیکھتا رہا ہے۔ سوبھو گیان چندانی سندھو دھرتی کے بڑے مہان فرزند ہیں اور اس دھرتی کو جب بھی کسی چیلنج اور مشکل کا سامنا ہوا ہے، وہ اس کی مدافعت میں پیش پیش رہے ہیں۔ ہر چند سوبھو نے اپنی سیاسی وسماجی سرگرمیوں کی وجہ سے ادب کو بہت کم وقت دیا ہے لیکن اس نے اپنے افسانوں، بے شمار مضامین، کالموں اور اداریوں کی صورت میں جو تحریریں دی ہیں، وہ سندھی ادب کا اہم ورثہ ہیں۔ سوبھو کی خودنوشت سوانح عمری جدید سندھ کے گزشتہ ساٹھ ستر برس کی زندہ تاریخ ہے۔''

سراج الحق میمن

''میں سوبھو گیان چندانی کو صدیوں پہلے سے جانتا ہوں، میری ذہنی تعمیر وترقی میں جن لوگوں کا سب سے زیادہ حصہ رہا ہے، ان میں ایک نام تو محمد ابراہیم جویو کا ہے اور دوسرا سوبھو گیان چندانی کا۔ جب کراچی میں پہلے پہل میں سوبھو سے ملا تھا تو اس وقت سے اس کا ناک نقشہ، رنگ روپ اور چہرے کے خدوخال

میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کی شان دار شخصیت سے متاثر ہونے والے لوگ شاید اس کے چہرے کے نقوش پہ غور ہی نہیں کرتے۔ میں آج چاہوں گا کہ لاڑکانہ میں اس کے گرد جمع ہو جانے والے لوگ اک ذرا غور سے اس کے چہرے کے نقش و نگار پہ نگاہ ڈالیں، اس کے تیکھے اور پُرکشش نقش و نگار، کشادہ و پُرنور پیشانی، سیاہ گھونگھریالے بالوں کے گچھے، آنکھوں میں طلسماتی چمک اور پھر موہن جو دڑو کے آثارِ قدیمہ سے برآمد ہونے والے اس اجرک پہنے ہوئے پروہت کو دیکھیں جس کی ناک ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی ستم ظریفی کی وجہ سے ٹوٹ چکی ہے، تو انھیں دونوں چہروں میں بڑی مماثلت محسوس ہوگی۔

سوبھو اب عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں بالعموم چہرے کے خدوخال اور نقش و نگار پر تھکن اور پژمردگی طاری ہونے لگتی ہے لیکن سوبھو نے زندگی سے تھکن مول لینے کی بجائے خود زندگی کو تھکا چھوڑا ہے۔ اسی لیے اس کے چہرے پر تھکن کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ وہ اب بھی جب ہنستا ہے تو لگتا ہے جیسے زندگی خود مسکرا پڑی ہو۔

یہی وہ شخص ہے جس نے ہمیں خواب دیکھنا اور پھر ان خوابوں کی تعبیر تلاش کرنا سکھایا تھا۔ اس نے اس کام کی پاداش میں جو سختیاں اور اذیتیں اٹھائی ہیں، انھیں دیکھ کر پہاڑ بھی خون کے آنسو رونے لگتے ہیں۔ اس شخص نے گورے اور کالے انگریز سے لے کر ہندو اور مسلمان انگریز تک سے وطن کی آزادی کے لیے جنگ کی ہے اور عام لوگوں کو باعزت زندگی کا حق دلانے کے لیے خود قید و بند کے عذاب سہے ہیں۔ اس نے محض خوش نما خواب دیکھے اور دکھائے ہی نہیں بلکہ ان خوابوں کی تعبیر کی طرف جانے والی رہ گزر کی نشان دہی بھی کی ہے۔ سوبھو ایک کمیٹڈ محب وطن شخص ہے اور سندھ کی دھرتی اس کی روح میں بستی ہے۔"

گوبند مالھی

جب ۴۱۔۱۹۴۰ء میں سوبھو شانتی نکیتن سے گریجویشن کر کے سندھ لوٹا اور کراچی کے لا کالج میں ایل ایل بی کے سال اوّل میں داخلہ لیا ہے تو سندھ میں طلبا تحریک حشو کیول رامانی کی رہنمائی میں اپنے عروج پر تھی۔ حشو اس وقت جیل میں تھا اور اب یوں لگتا ہے جیسے طلبا تحریک سوبھو گیان چندانی ہی کی منتظر تھی۔

سندھ کے سیاسی منظرنامے پر سوبھو کی انٹری ایک دھماکے کے ساتھ ہوئی تھی جس کی بازگشت نصف صدی گزر جانے کے بعد آج بھی سنائی دیتی ہے۔ سندھی معاشرے کو بوسیدگی اور جاگیردارانہ استحصال سے نجات دلا کر ترقی پسند، خوش حال اور منصفانہ معاشرے میں تبدیل کرنے کی جدوجہد سوبھو کا خواب اور آدرش رہا ہے۔ جس کے حصول اور کامیابی کی راہ میں اس نے بے مثال قربانیاں دی ہیں۔

چالیس کی دہائی میں بالائی سندھ کے شہر شکارپور سے برکت علی آزاد اور گوبند پنجابی نے ''نئین دنیا'' (نئیں دنیا) کتاب گھر کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس وقت نوجوانوں میں بائیں بازو کی تحریک اور روسی انقلاب کے لیے زبردست کشش موجود تھی۔ چنانچہ نئی دنیا کتاب گھر سے شائع ہونے والی کتابوں پر بھی شروع ہی سے ترقی پسند خیالات اور تصورات کا گہرا اثر رہا ہے اور جب سوبھو جیل سے نکل کر باہر آیا تو اس وقت میں ''نئین دنیا'' (نئیں دنیا) کتاب گھر کا سیکریٹری تھا اور اس نے میری ادبی سرگرمیوں کو بہت زیادہ سراہا تھا۔ ہر چند وہ اس وقت کئی ایک محاذوں پر سرگرم عمل تھا لیکن اس نے سندھی ادب میں روشن خیالی اور ترقی پسندیت کو پھیلانے اور مقبول بنانے میں بھی نہایت مؤثر کردار ادا کیا ہے جب انڈین کمیونسٹ پارٹی نے فیصلہ کیا کہ کانگریس میں شامل ہندو کمیونسٹ کانگریس چھوڑ کر واپس پارٹی میں آجائیں اور مسلمان کمیونسٹ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں تاکہ مسلم لیگ کی سیاست کو فرقہ پرستانہ کٹرپن سے محفوظ رکھا جائے اور اس کی پالیسیوں میں ترقی پسندانہ نکتہ نظر کو شامل کیا جا سکے تو ہر چند سوبھو کو اس فیصلے سے مکمل اتفاق نہ تھا لیکن اس نے پارٹی ڈسپلن کے مطابق مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کے درمیان اتحادِ عمل پیدا کرنے کے لیے بہت سرگرمی دکھائی تھی۔

شیخ ایاز کی ابتدائی شاعری میں انقلابی لب و لہجے کی گونج اور عوام دوست عناصر بہت حد تک سوبھو گیان چندانی کی صحبت کا نتیجہ ہیں۔ شیخ ایاز کی انقلابی شاعری پہلی مرتبہ ''نئین دنیا'' (نئیں دنیا) کتاب گھر'' سے شائع ہوئی تھی۔ کرشن کھٹوانی اور کیرت بابانی پر بھی سوبھو کی شخصیت اور خیالات کے نہایت گہرے اثرات رہے ہیں۔ ڈاکٹر چوئت رام گدوانی نے بھی سوبھو ہی کے زیرِ اثر عوامی طرز کے دوہے لکھنے شروع کیے تھے۔ سندھ میں وہ ہندو مسلم اتحاد کی سب سے بڑی اور زندہ علامت ہے۔ وہ مشکل حالات میں بھی امن و آشتی اور بھائی چارے کے راستے پر گامزن رہا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد مجھ جیسے کمیونسٹ سندھ سے ہندوستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کر چکے تو سوبھو واحد آدمی تھا جس نے کہا:

> ''نہیں، سندھ میرا آبائی وطن ہے اور میں اپنی جنم بھومی کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

اس زمانے میں پاکستان کے ہوم منسٹر خواجہ شہاب الدین تھے جو سوبھو کے نام اور کام سے واقف تھے۔ انھوں نے سوبھو کو جیل میں پیغام بھیجا کہ اگر وہ ہندوستان جانا چاہتا ہو تو حکومت نہ صرف اسے چھوڑنے کے لیے تیار ہے بلکہ اسے اور اس کے خاندان کے محفوظ سفر کا بندوبست بھی کرنے کو تیار ہے۔

لیکن سوبھو کا جواب نفی ہی میں تھا۔ ہندوستان ہجرت کرنے سے پہلے میں جب سوبھو کے پاس اجازت لینے گیا ہوں تو سوبھو ایک ضخیم کتاب پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا:

"اچھا تو بھی جا رہا ہے تو چلا جا، لیکن "شاہ جو رسالو" یہیں چھوڑ جانا۔"

مجھے یقین ہے اگر وہ تقسیمِ ہند کے وقت ہم لوگوں کی طرح ہندوستان چلا آتا تو اسے یہاں نہ صرف بائیں بازو کی سرگرمیوں میں اہم مقام حاصل ہوتا بلکہ ہندوستان میں سندھیوں کا وہ سب سے بڑا اور اہم رہنما بھی ہوتا۔ اور بھارت کی سیاست میں بھی اسے غیر معمولی مقام حاصل ہونا لازمی تھا۔ لیکن سوبھو نے اپنے ذاتی مفاد کے نکتہ نظر سے کسی تجویز پر کبھی غور کرنا سیکھا ہی نہ تھا اور وہ ہمیشہ ذاتی مفادات سے بہت بلند ہو کر سوچتا اور زندگی بسر کرتا تھا۔ کئی برس پہلے شیخ ایاز نے کہا تھا:

"سوبھو' جیتا جاگتا موہنجوڈرو ہے۔" سندھ کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی زندہ علامت۔"

کیرت بابانی

جب کبھی میں سوبھو گیان چندانی کا تصور کرتا ہوں تو ذہن کے پردے پہ کسی دیومالائی کتھا کی پربت نما شخصیت کی تصویر ابھر آتی ہے۔ جب میں کبھی تنہائی میں اب سے پچاس برس قبل "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" (Quit India movement) کے دوران سکھر جیل کی یادداشتوں کو تازہ کرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ ایک لمبا قدآور نوجوان جس کی ٹانگیں جیل کی کھاٹ سے دو دو فٹ باہر نکلی ہوئی تھیں اور وہ تکیہ سر پر رکھے ایک کتاب ہاتھ میں لیے پڑا ہے۔ میں بھی جیل کے اسی وارڈ میں تھا۔ میں پہلی ہی نظر میں اس نوجوان کے ڈیل ڈول اور قد کاٹھ سے بہت متاثر ہوا تھا۔ دراصل ہم دونوں ہی ایک دوسرے میں کسی قسم کی کشش محسوس کر رہے تھے اور شاید یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ہمارے درمیان ایک ایسی مستقل دوستی کی بنیاد پڑ گئی جس کا کچھ احوال میں نے اپنی جنم کتھا، "کچھ بتاتا ہوں، کچھ چھپاتا ہوں"، میں دلی صداقت کے ساتھ لکھا ہے:

"سوبھو اس وقت بھی اور آج بھی میرے لیے ایک آدرشی رہنما رہا ہے۔ آزادی کی جنگ میں اس نے میری طرح ہزاروں نوجوانوں میں وطن پرستی کا جذبہ بیدار کیا ہے اور انھیں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے ساتھ ہر قسم کی بے انصافی کے خلاف لڑنے کا سبق سکھایا ہے۔ وہ ایک مکمل آدرش وادی انسان ہے جس کے اصولِ حیات میں وطن پرستی کا جذبہ سب سے بلند رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھی اس نے اپنے آباواجداد کی زمین چھوڑنے کی شدت سے مخالفت کی تھی۔ اس نے شانتی نکیتن کے قیام کے دوران سیکولر

روحانیت کا سبق حاصل کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کی شخصیت میں سائنسی نکتۂ نظر کے ساتھ ساتھ صوفیانہ خیالات اور ویدانتی تصورات کی جھلک بھی ملتی ہے جو ہر قسم کی منافرت سے آزاد معاشرے کے قیام پر زور دیتے ہیں۔ سوبھو گیان چندانی نے اپنی شخصیت اور عمل سے سندھ کی نوجوان نسل کو جس طرح متاثر کیا ہے، اس کی ایک مثال تو میں خود ہوں۔ وہ میرا سیاسی گرو ہے اور شیخ ایاز جیسا عظیم سندھی شاعر اور مفکر بھی اس کی عظمت کا قائل رہا ہے۔''

پروفیسر ڈاکٹر ایاز قادری

''ایک مہارشی مہاراج ہمالیہ کی کسی گھاٹی میں گھنے درخت تلے برسوں سے ریاضت اور تپسیا میں مگن تھے۔ انھیں تو صرف یہ خبر تھی کہ ہمالیہ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہے اور جس پہاڑ کی گھاٹی میں وہ تپسیا کر رہے ہیں، وہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی ہے۔ ایک دن ریاضت کرتے کرتے انھوں نے ہمالیہ کی چوٹی کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ ہمالیہ سے پرے بھی پہاڑ کی ایک چوٹی ہے جو ہمالیہ سے بھی بلند تر ہے۔ انھیں بہت تعجب ہوا۔ انھوں نے گرو سے پوچھا، ''مہاراج کیا ہمالیہ سے بلند بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟'' گرو نے جواب دیا،'' ہاں، انسان۔''

سرزمینِ سندھ میں جب ہم اس بلندتر آدمی کی تلاش کرتے ہیں تو ہماری نگاہ سوبھو گیان چندانی پر آ کر ٹک جاتی ہے۔ سوبھو گیان چندانی کی شخصیت ہمارے لیے متنوع رنگوں والے ہیرے کی طرح ہے کہ وہ بیک وقت ایک صاف ستھرا سیاست دان، کل وقتی سماجی کارکن، عالم فاضل دانشور اور مذہبی فرقہ پرستی اور تعصب کے جنون سے آزاد بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کی تگ و دو میں لگا رہنے والا فرد ہے۔ کوئی بھی شخص اس سے مل کر اور اس کی باتیں سن کر لطف و مسرت کی دولتِ بے پایاں حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گویا وہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری کا ایسا کردار ہے، جس کی بابت شاہ صاحب نے لوگوں کو کہا ہے کہ'' تم صرف اس انسان کے پاس جا کر بیٹھو جس سے ملنے کے بعد تمھارے سب دکھ، درد اور تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔

سوبھو گیان چندانی نہ صرف سندھ بلکہ پاکستان بھر کے ان چند گنے چنے نظریہ سازوں اور ترقی پسند دانشوروں میں سے ایک ہے جنھوں نے اپنے مطالعے کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں ایک عمر صرف کی ہے۔ وہ نوعمری ہی سے عالمی ادب، تاریخ، فلسفے اور جدید ترین سائنسی، سماجی اور معاشی علوم کی منتخب کتابوں کے مطالعے سے فیض حاصل کرتا رہا ہے۔ اس نے نہ صرف سیاست اور سماجیات کا گہرا مطالعہ

کیا ہے بلکہ ادب و شاعری، تاریخ و فلسفہ، سائنس و فنونِ لطیفہ، نفسیات و اخلاقیات کے ساتھ دنیا کے مختلف مذاہب کا بھی تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اس جیسے وسیع المطالعہ لوگ کم کم ہی پائے جاتے ہیں۔

سوبھو گیان چندانی کا تعلق شروع ہی سے ترقی پسند ادبی تحریکوں اور سماجی تنظیموں سے رہا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ ڈی جے سائنس کالج کے ادبی سرکل کا ایک سرگرم رکن تھا جب کہ اس وقت ادبی سرکل کے صدر پروفیسر رام پنجوانی اور سیکریٹری عبدالرزاق راز تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل جب ترقی پسند ادبی انجمن سرگرمِ عمل تھی تو وہ اپنے دوسرے ترقی پسند ساتھیوں کے ساتھ، جن میں گوبند مالھی، کیرت بابانی اور گوبند پنجابی وغیرہ شامل تھے، سندھی زبان و ادب میں ترقی پسندانہ خیالات اور تصورات کو مقبول بنانے میں مصروف تھا۔ اس انجمن نے ۱۹۴۴ء میں ''ریگستانی پھول'' کے نام سے ترقی پسند افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا تھا جس میں سوبھو کی دو مشہور کہانیاں ''اجڑ گیا آستانہ'' اور ''رحیماں'' بھی شامل کی گئی تھیں، جنھیں سندھی ادب میں آج بھی ترقی پسند کہانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

سوبھو ان روایتی قسم کے افسانہ نگاروں میں سے نہیں جو اپنی ساری توجہ صرف افسانہ برائے افسانہ لکھنے میں صرف کر دیتے ہیں اور وہ خود نہیں جانتے کہ ان کی تحریروں کا مقصد اور مدعا کیا ہے۔ چونکہ اس نے دنیا بھر کے بہترین ادب کا مطالعہ کر رکھا ہے، اس لیے وہ بخوبی جانتا ہے کہ اچھا ادب، اچھے مقاصد اور اچھے تصورات کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے وہ اردگرد کے حالات بالخصوص سندھی معاشرے کی صورتِ حال سے چشم پوشی نہیں کر سکتا اور جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے، اپنی کہانیوں میں سندھی معاشرے اور معاشرت کی عکاسی کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اس کی کہانیاں گزشتہ پچاس برس میں بدلتی ہوئی معاشرتی صورتِ حال کی عہد بہ عہد تصویر کشی کرتی ہیں۔ اس کی تین کہانیاں ''بھگوڑا — آوارہ گرد''، ''انوکھا پیار'' اور ''خودکشی'' شانتی نکیتن کے دورانِ تعلیم انگریزی زبان میں لکھی گئی تھیں اور شانتی نکیتن کے کالج میگزین میں شائع ہو کر وسیع پیمانے پر داد حاصل کر چکی تھیں۔ ان ہی کہانیوں کو بعد میں سوبھو نے سندھی میں بھی لکھا ہے اور وہ آج بھی اتنی ہی تازہ اور حقیقی معلوم ہوتی ہیں جتنی اس وقت تھیں۔

سوبھو کی کہانیوں کے اکثر کردار ہمارے آج کے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں جن کے ذریعے اس نے اپنے ترقی پسند نظریوں اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سوبھو گیان چندانی کی کہانیوں کے یہ سب کردار ہمیں بہت کچھ جاننے اور سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں اور ان میں سے ہر کہانی دھڑکتی ہوئی زندگی کے کسی نہ کسی نکڑ کی جھلک دکھا جاتی ہے اور کسی نہ کسی گوشے کو منور کر جاتی ہے۔ اور پڑھنے والوں میں زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک نیا جوش، نیا جذبہ اور نیا شعور پیدا کر جاتی ہے۔ سوبھو اپنی کہانیوں میں زندگی کے مسلسل جاری جہدِ عمل کی عکاسی کرتی ہیں اور وہ اپنے پڑھنے والوں کو زندگی کی راہ پر پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے کی بجائے مسلسل اور لگاتار چلتے رہنے پر اُکساتی ہے اور سفرِ مسلسل کے بغیر منزلِ حقیقت کی رسائی ممکن نہیں ہوا کرتی۔

لیکھو تلسانی

۱۹۳۵ء میں جب میں کراچی کے این جے وی ہائی اسکول میں انگریزی کی چھٹی جماعت کا طالب علم تھا، اس وقت سوبھو بھی لاڑکانہ سے آکر اسی کلاس میں داخل ہوا تھا۔ وہ اگلی بنچ پر بیٹھتا تھا اور میں تیسری چوتھی بنچ پر۔ ایک دن صبح کی اسمبلی میں دیکھا تو وہ گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کی کتاب 'گیتا نجلی' سے ایک دعائیہ نظم انگریزی میں پڑھ کر سنا رہا ہے۔

اس کا انگریزی تلفظ بہت عمدہ اور آواز میں خود اعتمادی تھی۔ سفید کھادی پتلون قمیص اور سر پر کھادی کی ٹوپی، گورا چٹا، دراز قد، کالے گھونگریالے بال اور ورزشی جسم۔ چنانچہ ہم سب پر اس کی شخصیت کا بہت رعب پڑا۔ اسے شروع ہی سے کتابیں پڑھنے کی لت تھی اور ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب اس کے چہرے سے لگی ہوتی تھی۔ کلاس میں بھی اس کی دلچسپی کورس کی کتابوں کی بجائے عام ادبی اور تاریخی کتابوں سے تھی۔ ہاف چھٹی میں بھی جب سب بچے کھیل کود میں لگے ہوتے تھے، سوبھو کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں لے کر اسکول کے کھلے میدان کے کنارے لگے کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھ جاتا تھا۔ اس میں دوسروں کے ساتھ گھلنے ملنے کا شوق نہ تھا۔ اس کا حلقۂ احباب بھی ہمیشہ محدود رہا لیکن اس کے جاننے اور چاہنے والوں کا دائرہ ہمیشہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا ہے۔ اس زمانے میں دو ادبی پرچے بہت پسند کیے جاتے تھے۔ ایک ''سندر ساہت'' اور دوسرا ''رتن''۔ ''سندر ساہت'' میں منشی پریم چند، سدرشن، اوپندر ناتھ اشک جیسے ادیبوں کی شاہکار کہانیوں کے تراجم شائع ہوتے تھے۔ ''رتن'' میں زیادہ تر رابندر ناتھ ٹیگور، بنکم چندر چٹرجی، سرت چندر چٹرجی اور دوسرے بنگالی ادیبوں کی تخلیقات کے سندھی تراجم شائع ہوتے تھے۔ سوبھو دونوں رسالے بہت باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔

وہ بچپن ہی سے بہت وسیع المطالعہ اور خوش ذوق پڑھنے والا تھا۔ اس کی انگریزی بہت اچھی تھی اور ہمارے انگریزی کے استاد کبھی کبھی سوبھو کے لکھے ہوئے مضامین کی کاپی سب کلاس کو دکھاتے تھے کہ اس نے کیا خوب صورت مضمون لکھا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس میں تصنیف و تخلیق کا جوہر بچپن ہی سے تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ نکھرتا چلا گیا تھا۔ اس نے طالب علمی ہی کے زمانے میں گرودیو ٹیگور کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں ایک دلچسپ مضمون لکھا تھا جو ٹیگور پر سندھی زبان میں پہلا مضمون تھا۔ مذہبی معلومات بھی اس میں ٹھیک ٹھاک تھیں اور بظاہر کوئی ایسی عادات اس میں دکھائی نہ دیتی تھی جسے اخلاقی اعتبار سے غلط قرار دیا جا سکتا ہو۔ اس زمانے میں وہ ایک ''ننھے سنت'' کی طرح لگتا تھا۔ شانتی نکیتن میں بھی اس کے لکھنے پڑھنے کا شوق پروان چڑھتا رہا اور اس کی کئی کہانیاں جو انگریزی میں لکھی گئی تھیں، کالج میگزین میں شائع ہوئی تھیں۔ یہ کہانیاں بعد میں سندھی میں بھی لکھی گئی تھی۔

شانتی نکیتن سے بی اے کر کے واپس آنے کے فوراً بعد اس نے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا تھا لیکن اس وقت سندھ میں طلبا کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ چنانچہ سوبھو گیان چندانی اس تحریک میں دن بہ دن سرگرم عمل ہوتا چلا گیا۔ آزادیِ ہند کی تحریک میں بھی وہ رہنمایانہ کردار ادا کر رہا تھا اور اس کا سیاسی اور سماجی قد کاٹھ تیزی سے بڑھتے جا تا تھا۔ قید و بند کا زمانہ بھی اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا جو قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا۔ ان تمام سرگرمیوں کے باوجود اس کا ذوقِ مطالعہ بھی ترقی پاتا رہا اور اس کے زیرِ مطالعہ کتب کی تعداد اور تنوع میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس نے دنیا کی تمام بڑی زبانوں کی شاہکار تخلیقات پڑھ لی تھیں۔ روسی ادب کے مطالعے نے اس میں حقیقت نگاری کے رجحان کو تقویت پہنچائی۔ ویسے بھی اس کے سیاسی ساتھیوں اور ادبی دوستوں کا حلقہ کم و بیش ایک تھا۔ حشو کیول رامانی، گوبند پنجابی، برکت علی آزاد، گوبند مالھی، شیخ ایاز وغیرہ اس کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ اس نے اپنے دوستوں کو انگریزی، فرانسیسی، امریکن اور روسی ادب کی شاہکار تخلیقات پڑھنے پر اُکسایا اور ان میں عالمی ادب کو سمجھنے اور اس سے محظوظ ہونے کا جوہر پیدا کیا تھا۔ اس نے سندھی زبان میں ترقی پسند ادب کی تحریک کو مضبوط بنانے کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے اور ادبی سرکل کی ابتدائی نشستوں سے لے سندھی ادبی سنگت کے قیام تک وہ ہر اس تحریک میں شامل رہا ہے جس سے سندھی زبان میں ترقی پسند خیالات و تصورات رواج پاسکیں۔ ان نشستوں میں وہ بہت سہج اور دھیمے پن سے ایسی گفتگو کرتا تھا جسے سن کر نوجوان ادیبوں کا حوصلہ بڑھتا اور دوسری زبانوں کے ادب کی بابت ان کے علم میں گراں قدر اضافہ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے سندھی زبان میں جو کہانیاں لکھی ہیں، وہ سندھی فکشن میں سماجی حقیقت نگاری کی روایت کو مضبوط بنانے کا سبب بنی ہیں۔ اس کی کئی کہانیاں اس زمانے میں شائع ہونے والے انتخابات میں شامل کی گئی تھیں۔ لیکن سوبھو کا اصل کارنامہ یہ ہے جس کی کوئی اور نظیر نہیں ہے کہ اس نے سندھی ادب کی نئی نسل کی ذہنی اور فکری تربیت کی تھی اور اس وقت کے بیشتر اہم لکھنے والے سوبھو گیان چندانی کی وجہ سے ترقی پسند خیالات و تصورات کی طرف مائل ہوئے تھے۔ جن میں گوبند مالھی، کیرت بابانی، شیخ ایاز، کرشن کھٹوانی وغیرہ شامل ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد بھی نئی نسل کے لکھنے والوں میں اس کے اثر و نفوذ میں کوئی کمی نہیں آئی، بلکہ سنا ہے کہ وہ نئی نسل کے لکھنے والوں میں زیادہ مقبول ہوا ہے۔

حمید سندھی

فتح اور کامرانی سروں کی بھینٹ مانگتی ہے لیکن ہمارا 'سوبھ' (فتح کامرانی) کل بھی فاتح تھا اور آج بھی فتح مند ہے۔ سندھ کی سرزمین کے تحفظ کا معاملہ ہو کہ عوام کی بقا کی جنگ یا تمام انسانیت کے لیے امن و آشتی کا مورچہ یا اپنی اور اپنے رفیقوں، عزیزوں اور اہل و عیال کی خیر و عافیت کا معاملہ، ہر ایک محاذ پر

سوبھو سرگرمِ عمل دکھائی دے گا۔ میں نے اوائلِ عمری میں سوبھو کی معرکتہ الآرا کہانی ''بہار کب آئے گی؟'' ۱۹۵۲ء کے ''مہران'' کے پرچے میں پڑھی تھی۔ اس وقت (میں میٹرک میں پڑھتا تھا) کہانی کی کوئی خوبی تو ذہن پر روشن نہ ہو سکی تھی لیکن جب ''مہران'' میں شایع شدہ کہانیوں کا انتخاب کر رہا تھا تو اس کہانی کی خوبیاں اجاگر ہوئیں اور دل کش کہانی کا تاثر اتنا گہرا ہوا کہ میں نے اپنی تازہ کہانی ''چھت پہ لگی ایک گولی'' لکھی کہ عورت ذات کے بارے میں سوبھو سائیں نے اپنی کہانی میں جو سوال اٹھایا تھا، وہی آگے چل کر میری کہانی میں بھی ایک نئے رخ سے ابھر آیا ہے۔ سوبھو سائیں نے اپنی کہانی ''بہار کب آئے گی؟'' میں ایک مکالمہ لکھا ہے:

> ''محبوب کہتا ہے، ''بھلا یہ تو بتاؤ کہ عورت ایک دفعہ کسی سے محبت کرے تو اسے جھوٹا اور باسی کیوں قرار دیا جاتا ہے جب کہ مرد ساری عمر عیش کرتا پھرے تو بھی ہر دفعہ کنوارا اور نیا نکور ہی سمجھا جاتا ہے؟!''

میں نے سوبھو سائیں کے نہ تو دکھ دیکھے ہیں اور نہ ان کے سکھوں کا حساب رکھا ہے کیوں کہ میں نے تو ان کے چہرے پر سدا امن و آشتی کے پیغام ہی پڑھے ہیں۔ سوبھو سائیں کے میں نے کئی روپ دیکھے ہیں۔ وہ ایک عملی جدوجہد کرنے والے آدرش وادی انسان بھی ہیں اور نئی نسل کے لوگوں کو تعلیم و تربیت دینے والے رہنما بھی ہیں۔ میں نے ان کے چہرے پر جیسی روشنی اور تازگی اور چمک گزرے دنوں میں دیکھی تھی، ویسی ہی روشنی اور تازگی آج بھی ان کے چہرے پر دکھائی دیتی ہے۔ یہ روشنی اور تازگی امید اور یقین کے شعلے سے پیدا ہو رہی ہے۔ مجھے تو سائیں سوبھو ہومر کی ''اوڈیسی'' کی طرح نظر آتے ہیں جو خوفناک اژدہے سے خونی مقابلے کے بعد بھی زندہ سلامت رہتا ہے۔ یا پھر وہ ہیمنگوے کے ''اولڈ مین اینڈ سی'' (Old man & Sea) والے بوڑھے کی طرح ہیں جو سمندر کی وحشیانہ قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر کے بالآخر سمندر کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا کر ساحلِ سمندر پر بیٹھا لہروں کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ سائیں سوبھو نے ساری زندگی سمندر کی سرکش موجوں کا مقابلہ کیا ہے اور ہمیشہ سمندر کی سرکشی کو شکست دی ہے۔

پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی

سوبھو گیان چندانی سے میری پہلی ملاقات ان کے آبائی گاؤں بندی میں ہوئی تھی جہاں میں ان سے ملاقات کے لیے گیا تھا۔ وہ اس زمانے میں اپنے گاؤں میں نظر بند تھے۔ اس طویل ملاقات میں انھوں نے متعدد علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور تاریخی موضوعات پر اظہارِ خیال کیا تھا جس سے میری معلومات

میں گراں قدر اضافہ ہوا تھا۔ بعد میں وہ ہماری دعوت پر بلوچستان بھی آئے تھے اور ان سے ہم نے بلوچی زبان اور ادب میں ترقی پسند خیالات وتصورات کے فروغ کے لیے رہنمائی حاصل کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا، اصل ترقی پسندیت عوامی دکھ درد اور ان کے طرزِ احساس کو اظہار کی زبان دینا ہے۔ انھوں نے بلوچستان میں ترقی پسند تحریک کے تنظیمی امور میں بھی بعض مؤثر مشورے دیئے تھے اور میرے ذاتی مطالعے کے سلسلے میں بھی رہنمائی کی تھی۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ مطالعہ ہی آدمی کے لیے نظریاتی بنیاد فراہم کرتا ہے ورنہ کسی بھی نظریے کو بغیر جانے بوجھے ماننا اندھی عقیدت پسندیت کے ذیل میں آتا ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ سندھی ادیبوں کے تجربوں کی روشنی میں بلوچی زبان اور ادب میں بھی ترقی پسند خیالات اور تصورات کا دائرۂ اثر بڑھایا جاسکتا ہے، میں نے انھیں گل خان نصیر کی بلوچی شاعری کے بارے میں بتایا تو معلوم ہوا وہ گل خان نصیر کی شخصیت اور شاعری سے نہ صرف پہلے ہی متعارف ہیں بلکہ گل خان نصیر کی شاعری کے بہت زیادہ قائل بھی ہیں۔ سوبھو صاحب کو تاریخ اور آرکیالوجی (آثارِ قدیمہ) کے علم سے بہت دلچسپی ہے۔ انھوں نے مجھے بھی آرکیالوجی کے مطالعے کا مشورہ دیا اور کہا کہ بلوچستان میں آثارِ قدیمہ بہت ہیں۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اس موضوع پر مشہور عالم کتاب "Pre-history Ideas" (قبل از تاریخ خیالات) ضرور پڑھوں کیوں کہ اس کتاب میں بلوچستان کے آثارِ قدیمہ کی بابت تفصیلی معلومات موجود ہیں۔ اسی طرح انھوں نے انگریزی، امریکی، فرانسیسی اور روسی ادیبوں کی لکھی ہوئی کئی اہم کتابوں پر بھی تفصیلی گفتگو کی اور ان میں سے بعض کتابوں کے مطالعے کو ترقی پسند ادیبوں کے لیے لازمی قرار دیا۔

سوبھو صاحب میرے نزدیک نہایت ہی بھلے انسان ہیں جو اپنے بارے میں کم اور عام لوگوں کے بارے میں زیادہ سوچتے ہیں۔

مسلم شمیم

سائیں سوبھو گیان چندانی سے قریبی تعلقِ خاطر کو کم وبیش نصف صدی ہوا چاہتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب میں نے لاڑکانہ کو اپنا وطن بنایا تو جن نہایت اہم اور مشفق بزرگوں سے نیاز حاصل ہوئے اُن میں جمال الدین بخاری اور سائیں سوبھو گیان چندانی سرِفہرست تھے۔ دونوں اشتراکی عالم، دانشور اور رہنما تھے، جنھوں نے زندگیاں اپنے مقاصد اور آدرش کی تکمیل کی نذر کردی تھیں۔ یوں سوبھو گیان چندانی صاحب کی شخصیت کے کتنے ہی پہلو ایسے ہیں جن پر تفصیل کے ساتھ لکھا جاسکتا ہے لیکن میں یہاں صرف ان کے ایک زاویۂ نگاہ پر روشنی ڈالنا چاہوں گا۔ یہ بات تو کئی جگہ ریکارڈ ہو چکی ہے کہ قیامِ پاکستان کے وقت برپا ہونے والے انسانیت سوز فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں ہندوستان اور

پاکستان کے درمیان تاریخ کی سب سے بڑی اور ہولناک نقلِ مکانی عمل میں آئی تھی۔ سرحد کی دونوں جانب انسانی المیوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ یہاں سے وہاں جانے والوں اور وہاں سے یہاں آنے والوں کو آگ اور خون کے جہنم زاروں سے گزرنا پڑا تھا جن میں بڑے بڑوں کے حوصلے اور ہمتیں جل کر خاک ہوئی جا رہی تھیں۔ اس صورتِ حال میں سندھ سے بھی ہندو خاندان بھارت جانے پر مجبور ہو گئے تھے لیکن ان نامساعد حالات میں بھی صرف سوبھو سائیں تھے جنھوں نے سندھ سے ترکِ سکونت کر کے ہندوستان ہجرت کرنے کی ہر دعوت، سفارش اور دباؤ کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ ''سندھ ان کا آبائی وطن اور جنم بھومی ہے جسے کسی بھی قیمت پر چھوڑ جانے کے عمل کو وہ مادرِ وطن سے غداری کے مترادف سمجھتے ہیں۔'' اور یہی ہوا، پاکستان بننے کے بعد وہ اس ملک میں ایک ایسے معاشرے کے قیام کے لیے سرگرمِ عمل رہے ہیں جس میں سیاسی، معاشی اور سماجی آزادیوں اور جمہوری قدروں کو پروان چڑھایا جا سکے اور ملک کے عوام کو جاگیردارانہ جبر، مذہبی عصبیت اور جاہلانہ فرسودگی سے نجات دلا کر ایک روشن خیال، منصفانہ، ترقی پسند، خوش حال اور جدید فلاحی سوسائٹی کے قیام کے لیے راغب کیا جا سکے۔ وہ بنیادی طور پر ایک محبِ وطن سندھی دانشور ہیں لیکن وہ ایسی تنگ نظر قوم پرستی کو جس کی بنیاد عوام دوستی اور جمہوری اقدار پر استوار نہ ہو، فسطائی رویے کا اظہار سمجھتے ہیں۔ انھوں نے متعدد مضامین اور تقاریر میں سندھی قومیت کی بابت تمام خدشات کا علمی استدلال کے ساتھ جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ سندھ کو نام نہاد دیہی اور شہری معاشروں میں تقسیم کرنا مفاد پرست سیاست دانوں کی بازی گری کے سوا کچھ نہیں اور اس کا اصل مقصد سندھ کے عوام کی طاقت کو پارہ پارہ کرنا ہے جس کی مذمت ہونی چاہیے۔ اسی طرح وہ نئے سندھی اور پرانے سندھی کی اصطلاح کو بھی انتہائی بے معنی قرار دیتے ہیں کہ ان کے نزدیک ہر وہ شخص جو سندھ میں مستقل طور پر آباد ہو کر اس کی خدمت کرنے کا عزم رکھتا ہے اور سندھ کے مفادات کو کسی قسم کی زک نہیں پہنچاتا، اسے غیر سندھی قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ انھوں نے مہاجروں کے ایسے گروہوں سے جن کے نزدیک شخصی اور گروہی مفادات معاشرتی اور ملکی مفادات سے زیادہ عزیز ہیں، خبردار رہنے کی ضرورت پر زور دیا ہے لیکن تمام اردو بولنے والوں کو ایک ہی خانے میں رکھ کر سندھی معاشرے سے خارج قرار دینے کو غیر سنجیدہ اور وطن دشمن رویہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح سندھ میں ذولسانی معاشرے کو بھی وہ ایک حقیقت قرار دیتے ہیں کہ اردو زبان کو پاکستان میں عملاً رابطے کی زبان ہونے کا مرتبہ حاصل ہے کیوں کہ وہ کیماڑی سے کیلاش تک کی گلی کوچوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن اردو کے اس عملی کردار کو جواز بنا کر سندھی، بلوچی، پشتو، پنجابی، سرائیکی اور دوسری پاکستانی زبانوں کو ان کے فطری اور قانونی حقوق سے محروم کرنے کی ہر کوشش کو غیر جمہوری اور عوام دشمن کارروائی قرار دیتے ہیں جس کا مقابلہ سندھیوں اور مہاجروں کو مل کر کرنا چاہیے۔ زبانیں محبت کی پیغامبر ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کے تجربوں اور خزانوں سے باہم فیض یاب ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ زبانوں کے ذریعے منافرت کا

زہر پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ محض اپنے محدود سیاسی مفادات کے حصول کی خاطر عوام دشمنی پر کمربستہ ہوتے ہیں۔

سوبھو صاحب نے قیامِ پاکستان کے بعد سندھ کے طول وعرض میں اردو اور سندھی کی مشترکہ تنظیموں اور اجتماعات کی جس طرح سرپرستی اور رہنمائی کی ہے، اس کی وجہ سے سندھ میں ایک مخلوط لسانی معاشرہ قائم ہوسکا ہے۔ اور ان کا یہی وہ رویہ ہے جس نے انھیں اردو بولنے والوں میں بھی یکساں طور پر مقبول اور محترم بنادیا ہے۔

فتاح ملک

سائیں سوبھو گیان چندانی سے میرے تعلقات کی عمر کم وبیش نصف صدی پر مشتمل ہے۔ میں نے اپنی اوائل عمری ہی سے انھیں دیکھا، ان کی باتیں سنیں اور ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ خاص طور پر شیخ ایاز کی محفلوں اور سائیں شمس الدین شاہ کی اوطاق (بیٹھک) پر منعقد ہونے والے بحث مباحثوں میں علم و دانش کے جو موتی وہ بکھیرتے رہے ہیں، ان سے میری ہم عمر نسل یقیناً فیض یاب ہوئی ہے۔ وہ بے مثال دانشور اور عالم ہونے کے باوجود ہر تحریک اور جدوجہد میں عوامی کارکن کی حیثیت سے شریک رہے ہیں اور اپنے آدرش کی کامیابی کے لیے بے مثال ایثار اور قربانی پیش کی ہے۔ ''سندھی ادبی سنگت'' کے قیام اور فروغ کے لیے انھوں نے جو رہنمایانہ کردار ادا کیا ہے، وہ آج بھی مشعلِ راہ ہے۔ ان کے لکھے ہوئے مضامین کے سلسلے جو متعدد ادبی وسماجی رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں، آج بھی ہماری فکری نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو ہم آج بھی سندھی ادب میں حقیقت نگاری کی بنیاد سمجھتے ہیں۔

محمد بچل تنیو

سوبھو صاحب سے میری پہلی ملاقات راؤ صغیر احمد کی دکان پہ ۱۹۶۷ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک نہایت پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ لب ولہجہ شائستہ، گفتگو دوٹوک اور وزن دار، جس میں زندگی بھر کے گہرے اور وسیع مطالعے کی سنجیدگی اور سچائی جھلکتی تھی۔ ان کے مطالعے کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ لاڑکانہ میں ان کی جمع کی ہوئی کتابوں پر مشتمل لائبریری کو محکمہ ثقافت سندھ نے اب سے دس بارہ سال قبل آٹھ لاکھ روپے میں خریدا تھا۔ یہی وہ کتب خانہ ہے جو بعد میں شاہنواز بھٹو لائبریری کی زینت بنا اور جس سے آج بھی لاڑکانہ کے لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ سوبھو صاحب سے نظریاتی اختلاف کے باوجود آپ ان کی حب الوطنی، انصاف دوستی اور اپنے آدرش سے کمٹ منٹ کے قائل

ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کا آدرش آخر یہی تو ہے نا کہ اس معاشرے میں تمام لوگ خوش حالی، امن چین اور ہر قسم کی منافرت سے آزاد، آپس میں مل جل کر رہیں اور ہر شخص کو زندگی کے وسائل سے منصفانہ طور پر فیض یاب ہونے کے مواقع نصیب ہوں۔ میری نظر میں اسلام بھی ایسے ہی عوامی انقلاب کا داعی بن کر طلوع ہوا تھا۔ سوبھو صاحب ایک مرتبہ پھر ویسے ہی انقلاب کی تلاش میں ہیں!

ڈاکٹر ادل سومرو

سوبھو گیان چندانی ایک آدرشی مفکر کی حیثیت سے اپنی ایک منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ جدید سندھ کی فکری رہنمائی کرنے والوں میں ان کا نام نمایاں ہے۔ ادبی حوالے سے بھی اُن کی بڑی خدمات ہیں۔ ان کے افسانے اور مضامین نہایت فکر انگیز اور ایک واضح مقصد رکھتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے منشوران کے افکار کا پرتو نظر آتا ہے، ان کے افسانے زیادہ تر دیہی معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں اور ان میں جاگیرداری سماج کے مسائل اور دیگر فرسودہ روایات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ سماجی حقیقت نگاری کے زیرِ اثر سوبھو گیان چندانی کے افسانوں میں زندگی بھرپور انداز سے موجود ہے۔

ان کے افسانے ممکن ہیں عہدِ حاضر میں کچھ اجنبی اجنبی سے لگتے ہوں اور جدید نقاد ان پر خاطر خواہ توجہ دینے سے گریزاں ہوں لیکن ان افسانوں کی تاریخی حیثیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سائیں سوبھو اور ان کے ہم عصروں نے اپنی تحریروں سے بعد میں آنے والوں کی راہوں کے کانٹے کافی حد تک صاف کر دیئے تھے اور سندھی افسانے میں ترقی پسندی اور حقیقت نگاری کو تقویت فراہم کی تھی۔ ان کی خودنوشت سوانح عمری بھی ایک اہم ادبی دستاویز ہے جس میں گزشتہ ستر برس کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی مناظر محفوظ ہو کر ہماری تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔

ایاز گل

بعض شخصیتیں اپنے کنبے، اڑوس پڑوس، گاؤں گوٹھ اور شہر و قریہ کے لیے سایۂ عاطفت بن جاتی ہیں اور بعض شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنے علم و آگہی، طور طریقے اور قوتِ ارادی سے پوری قوم اور معاشرے کے لیے شجرِ سایہ دار ثابت ہوتی ہیں جن کی ٹھنڈی چھاؤں زندگی کے پُر آشوب اور تپتے ہوئے سفر کو بھی آسان اور راحت افزا بنا دیتی ہے۔

بے شک سائیں سوبھو گیان چندانی کا شمار برِاعظم پاک و ہند کی ایسی ہی چھتنار شخصیتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے بیسویں صدی کے سندھ کی تعمیر و تہذیب میں دیرپا نقوش مرتب کیے ہیں اور عمر کی اس ڈھلتی

ہوئی شام سے بھی جن کے جذبے کی صداقت اور استقامت کی روشنی کو مدھم نہیں پڑنے پائی ہے۔ سوبھو گیان چندانی کی شخصیت علم و آگہی اور ایثار و قربانی کی علامت ہے اور ان جیسا بننے کی خواہش تو خیر بہت بڑی بات ہے، ان کے نقوشِ قدم کے ساتھ ساتھ سفر کرنا بھی باعثِ افتخار عمل ہے۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری

سوبھو گیان چندانی ایک ایسے آدرشی مفکر ہیں جنھوں نے ہوش سنبھالتے ہی عوامی دکھ درد اور کٹھنائیوں کے کسیلے پن کو اپنی سانسوں میں محسوس کرنا شروع کر دیا تھا اور اوائل عمر ہی سے طے کر لیا تھا کہ وہ سندھی معاشرے کو جہالت کی گھٹن اور فرسودگی کی تاریکی سے نکال کر رہے گا۔ اس کی تمام زندگی اسی مقصد کے حصول کی جدو جہد میں گزری ہے۔ وہ سندھ ہی نہیں بلکہ پورے پاکستانی معاشرے کو فیوڈل نظام کے جابرانہ استبداد سے نجات دلا کر ایک جمہوری ترقی پسند، روشن خیال اور ترقی پذیر معاشرے میں تبدیل کرنے کا خواب دیکھتے رہے ہیں اور اس خواب کی تعبیر تلاش کرنے میں اپنی زندگی کا بہترین حصہ قید و بند میں گزار دیا ہے۔ وہ ایک ایسے دانشور ہیں جو اشتراکی تصورات کو عقیدہ بنانے کی بجائے ان کی عملی تفسیر ڈھونڈنے کو اپنا آدرش بناتے ہیں۔ سوبھو گیان چندانی متنوع شخصیت کے مالک ہیں اور جہاں انھوں نے سیاست اور صحافت کو اپنے جہدِ عمل سے باریاب کیا ہے، وہیں سندھی ادب کو بھی اپنی تحریروں سے مالا مال دی ہے۔ ان کا شمار سندھی زبان میں ترقی پسند ادب کے معتبر قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ وہ سندھی اور بلوچی زبان اور ادب کے درمیان بھی ایک پل کا کردار ادا کرتے رہے ہیں اور سندھی ادیبوں کی طرح بلوچی ادیب اور دانشور بھی سوبھو صاحب کے ترقی پسند خیالات و تصورات سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔

علی احمد بروہی

یونان کے فلسفی سقراط کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی باغیانہ باتوں سے ایتھنز کے نوجوانوں کو ورغلاتا تھا اور نوجوان لوگ اس کی باتوں کے سحر میں گرفتار گھنٹوں گلیوں اور چوراہوں میں جمع رہتے تھے کہ انھیں سقراط کی باتیں سننے کا موقع مل سکے۔ سندھ میں بھی ایک ونائی فقیر موتی بکھیرا کرتا تھا جس کی باتیں سننے کے لیے لوگ گلی کوچوں میں جمع ہو جایا کرتے تھے۔ ہر چند آج ہمارے اردگرد تاریکی زیادہ گہری ہے لیکن اگر ہم غور کریں تو ہمیں سوبھو گیان چندانی جیسا شخص بھی نظر آ جاتا ہے جو گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں سے سندھ کے نوجوانوں کی ذہنی تربیت میں مصروف ہے اور کوشش کرتا رہا ہے کہ انھیں

زندگی کے حقیقی مسائل اور حالات سے مکمل آگاہی بخشے۔

سوبھو خوش قسمت ہے کہ اس کو گرودیو ٹیگور کے عالمی شہرت یافتہ تعلیمی ادارے شانتی نکیتن میں جاکر تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس بیرونی سفر نے یقیناً اس میں شعور و آگہی کے نئے آفاق پیدا کیے ہیں۔ اور وہ زندگی کی باریکیوں کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کا اہل ہو سکا تھا۔ لیکن سوبھو صرف کتابی علم کا شائق نہیں بلکہ اس کا اصل منصب اور کردار ایک عملی مجاہد کا ہے، ایک ایسا مجاہد جس نے سندھ میں سماجی، معاشرتی، معاشی اور اخلاقی انقلاب لانے کی ٹھان لی ہو، خواہ اس کے راستے میں کیسی ہی کٹھنائیاں کیوں نہ آئیں۔ اس نے طلبا تحریک سے ''کوئٹ انڈیا مومنٹ'' اور انڈین نیوی کی بغاوت کے حق میں چلنے والی تحریکوں تک کو کامیاب بنانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگادی تھی۔ قیامِ پاکستان کی تحریک میں بھی اس کا اہم کردار رہا ہے اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی نئے ملک میں نئے جمہوری اور انصاف پسند معاشرے کے قیام کے سلسلے میں سوبھو کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے فیصلے کے تحت اس نے قیامِ پاکستان کے حق میں ۱۹۴۶ء میں ''پاکستان ڈے'' کی ایک زبردست ریلی منظم کی تھی۔ اس نے اپنی تحریر، تقریر اور عملی سرگرمی سے سندھی ادیبوں کی نئی نسل کی رہنمائی کی ہے۔ اس کی لکھی ہوئی کہانیاں ہوں کہ مضامین، جدید سندھی ادب کا اہم سرمایہ ہے۔

انور پیرزادہ

کامریڈ سوبھو گیان چندانی کے ساتھ چالیس پینتالیس برس کی تربیت کے باوجود ان کی فکر کی وسعت کے بارے میں کم از کم میں کوئی حتمی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ وہ علم و دانش کا ایک بحرِ زخار ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سوبھو صاحب کی زندگی اور کام کو باقاعدہ طور پر ڈاکومنٹ کیا جائے، ان پر آڈیو ویڈیو بنانے کی ضرورت ہے، لیکن افسوس ان کی منتشر تحریروں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کرانے کی طرف بھی ابھی تک توجہ نہیں دی جاسکی ہے۔

سوبھو صاحب نے اب تک جو کچھ لکھا ہے، اس میں سے کثیر تحریریں شائع نہیں ہوسکی ہیں جو ایک افسوس ناک امر ہے، وہ ایک ایسے دانشور ہیں جن کی شخصیت میں قدیم صوفیانہ اور ویدانتی تصورات کے ساتھ سندھی ثقافت، ہندو تہذیب، سوشلسٹ نظریات اور جدید عالمی کلچر کے عناصر کارفرما ہیں۔ وہ حب الوطنی، عوام دوستی، روشن خیالی اور جمہوری اقدار کی زندہ علامت ہے۔ سوبھو اپنے معاصرین سے اس لیے بھی مختلف ہیں کہ وہ گلیلیو کی طرح اپنے نظریات میں اٹل ہونے کے باوجود نظریاتی ملائیت کے قائل نہیں ہے کہ وہ مسلسل غور و فکر اور تجربے کو نظریے کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ ان کے اسی کردار میں سندھ کی قدیم

صوفیانہ روایت اور ویدانتی گیان کی لہریں مل جاتی ہیں۔

محمد علی پٹھان

کامریڈ سوبھوگیان چندانی کی شخصیت اور فکر ونظر کے تنوع کی شناخت مجھے اپنی عمر کے اس دور میں ہوئی جب ادب سے نیا نیا شغف پیدا ہوا تھا اور میری عمر اس وقت ابھی صرف دس بارہ برس کی تھی۔ ان دنوں مجھے سندھی ادبی سنگت کی میٹنگوں میں باقاعدگی سے شریک ہونے کا چسکہ پڑ چکا تھا۔ اور سنگت کی ان میٹنگز میں شامل ہونے والے بہت سے دوستوں اور ساتھیوں سے میں اکثر بڑے ادب اور احترام سے سوبھو صاحب کا ذکر سنا کرتا تھا۔ وہ سوبھو جس نے سندھ کے ایک گوشے میں بیٹھ کر ملک کے آمروں اور ظالموں سے ٹکر لے کر اپنی بہادری اور اولوالعزمی کی ایک نئی مثال قائم کی تھی، جس نے جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے بند رہ کر خون کے گھونٹ پیتے ہوئے بھی کبھی حوصلہ نہ ہارا تھا۔ مگر وہ سوبھو آج کل خاموش تھا—!

اور اس کی خاموشی نے میرے سامنے ایک سوال پیدا کر دیا تھا کہ کس طرح سائیں سوبھو کو دوبارہ لکھنے کی طرف مائل کیا جائے؟

پھر کافی عرصہ اسی لیت ولعل میں گزر گیا کہ ایک دن اچانک میرا دوست انور پیرزادہ کراچی سے لاڑکانہ میں وارد ہوا تو ملاقات پر اس نے بتایا کہ وہ روزنامہ ''عوامی آواز'' کراچی کی ایڈیٹری کے فرائض سنبھالنے پر رضامند ہو گیا ہے اور آئندہ چند روز کے اندر کراچی واپس جا کر اپنا کام شروع کر دے گا۔ انور سے یہ خوش خبری سن کر مجھے اپنے دیرینہ خواب کی تعبیر کا ایک نیا موقع مل گیا اور میں نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر تمھارے اخبار ''عوامی آواز'' میں سوبھو صاحب ہر ہفتے پابندی کے ساتھ کالم یا مضمون لکھنے پر آمادہ ہو جائیں تو کیسا رہے گا؟ انور یہ بات سن کر اچھل پڑا لیکن فوراً ہی جھاگ کی طرح بیٹھتے ہوئے کہنے لگا، ''یہ بات تقریباً ناممکن ہے۔'' میں نے جواب دیا، ''یہ ممکن ہو سکتا ہے اگر کوشش کی جائے۔'' ''وہ کس طرح؟'' انور نے پوچھا۔

> ''میں خود ہر ہفتے بڑی پابندی کے ساتھ ان کے دروازے پر فقیرانہ صدا لگاؤں گا اور التجا آمیز دستک دے کر ان سے کالم لکھواؤں گا اور تمھیں بھیجتا رہوں گا۔''
>
> اس پر انور نے جواب دیا کہ ''اگر واقعی ایسا ہو سکے تو میں اسے اپنے اور اپنے اخبار کے لیے بڑا اعزاز سمجھوں گا۔ مگر میرا خیال ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے اور تمھارے اس خواب کا پورا ہونا مجھے ذرا مشکل ہی نظر آتا ہے۔''

اس کے بعد میں ہر ہفتے باقاعدگی سے سوبھو صاحب کے دروازے پر دستک دیتا رہا اور وہ ہمیشہ ٹال

منتوں سے کام لیتے رہے اور بالآخر انھیں میری مسلسل ضد، خوشامد اور عاجزی کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہی بن پڑی تھی۔ اور پھر پہلا کالم چھپنے کے بعد دوسرا کالم لکھوانے کے لیے میں ان کی بیٹھک میں پہنچا تو انھوں نے یہ کہہ کر پلّہ ہی نہ پکڑنے دیا

''آج تو میرے سر میں بہت درد ہے اور تم کل آجانا۔'' دوسرے دن پہنچا تو کہنے لگے، ''آج سارے دن موکلوں نے دماغ چاٹ لیا ہے مجھے کچھ بھی اس وقت یاد نہیں آرہا، میں تمھیں کیا لکھواؤں — کل سہی۔'' لیکن تیسرے دن تو اخبار کے لیے کالم بھیجنا بہت ضروری تھا، ورنہ وعدے کی خلاف ورزی ہوجاتی — اس لیے میں انکار کے باوجود دھرنا مار کر بیٹھ گیا اور کاغذ سامنے رکھتے ہوئے قلم نکال کر پوچھا، ''ہاں جناب، کیا لکھنا ہے؟'' وہ چند منٹ آنکھیں موندے کچھ سوچتے رہے اور میں ان کی طرف پُر امید نگاہوں سے دیکھتا رہا — اور چند منٹ کے بعد آنکھ کھول کر کہا، ''ہاں تو لکھو'' — اس طرح ایک کے بعد ایک کالم لکھوا کر میں انور کو بھیجتا رہا اور یہ سلسلہ چل پڑا۔ کبھی میری منت سماجت، کبھی ضد اور خوشامد کے سامنے سوبھو صاحب مجبور ہوتے رہے۔ اس طرح یہ ۲۷ کالم جو ''تاریخ بولتی ہے'' کے عنوان سے ''عوامی آواز'' میں شائع ہوئے اور اب کتابی صورت میں چھپ رہے ہیں۔ ان کالموں میں سوبھو صاحب جو کچھ بولتے گئے، میں لکھتا رہا اور اب یہ کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہیں۔ اور انھیں پڑھنے کے بعد آپ بھی یقیناً میری اس رائے سے متفق ہوں گے کہ یہ کالم ایک ایسے ذہن کے خیالات اور عقل و شعور کا نچوڑ ہیں جو نہ صرف آج کے سندھ کے حالات پر بلکہ عالمی تغیر و تبدل پر بھی گہری نظر رکھتا ہے اور پاکستان کے عوام کو ایک روشن مستقبل کی راہ دکھاتا ہے اور سوئے ہوئے انسانوں کو جھنجھوڑ کر یہ کہتے ہوئے جگاتا ہے کہ ''بندوق کی گولی سے انقلاب تو آسکتا ہے مگر ایک خوش حال اور آسودہ معاشرہ نہیں تعمیر ہوسکتا کہ اس کے لیے مسلسل تعمیری اور تخلیقی سرگرمی کی ضرورت ہوتی ہے۔''

اسلم راحیل مرزا

سندھ کے نامور دانشور، انقلابی رہنما سوبھو گیان چندانی کا نام پاکستان کے ترقی پسند نظریاتی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ نہ صرف سندھ کی تاریخ کا ایک اہم کردار ہے بلکہ دورِ جدید میں سندھ کی ایک تاریخ ساز شخصیت بھی ہے اور سندھ کے علمی و ادبی اور عوامی و سیاسی حلقوں میں ان کا ایک خاص

مقام ہے۔ وہ ایک مستقل مزاج اشتراکی رہنما ہیں اور طالب علمی کے دور سے انھوں نے عوامی سیاست اور پروگرام کو آگے بڑھانے کے جس مشن کا آغاز کیا تھا، ماضی قریب تک وہ بڑی ثابت قدمی سے اس پر قائم رہے ہیں۔ انھوں نے ایک طویل عرصے تک برصغیر کی سیاسی آزادی کی تحریک اور پھر پاکستان کے عوام کی معاشی و سیاسی آزادی کے لیے اپنی پارٹی کے دوسرے ساتھیوں کے دوش بدوش اَن تھک جدوجہد کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ میں سوبھو صاحب سے سیاسی ونظریاتی اختلاف رکھنے والے لوگ بھی ان کا احترام کرتے ہیں اور ان کی دوستی و تعلق داری کو اپنے اختلافات کے مقابلے میں کہیں زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور سندھ کے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے وہ آج ستیاسی انھیاسی برس کی عمر میں بھی نوجوان نسل کی عملی ونظریاتی رہنمائی بڑی خاموشی سے کیے جارہے ہیں اور اپنے سیاسی مؤقف کے بارے میں بقول فیض بڑے اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ:

ہم نے جو طرزِ فغاں کی تھی قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے!

معروف سندھی نقاد اور افسانہ نگار ڈاکٹر ایاز قادری کے مطابق سوبھو گیان چندانی ان روایتی افسانہ نگاروں میں نہیں ہے جو اپنی ساری توجہ محض افسانہ برائے افسانہ لکھنے پر صرف کردیتے ہیں چونکہ اس کا دنیا بھر کے مقصدی اور نظریاتی ادب پر بڑا گہرا مطالعہ ہے، اس لیے اس کی وہ تمام کہانیاں جو اردو تراجم پر مشتمل مجموعے ''انقلابی کی موت'' میں شامل ہیں، پچاس سال کے طویل دور میں عہد بہ عہد ابھرنے والے رجحانات اور نظریات کی عکاسی ہیں۔ ان کہانیوں کے اکثر کردار ہمارے آج کے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں جن کے ذریعے سوبھو صاحب نے اپنے ترقی پسند نظریات ان کے اخباری کالموں اور نظریاتی مضامین کا ایک منتخب مجموعہ ''تاریخ کے بھولے بسرے اوراق'' راقم الحروف نے اردو میں مرتب کرکے چھپوادیا ہے جو ملک کے ترقی پسند قارئین میں بڑا مقبول ہوا ہے اور اب سوبھو صاحب کی نو کہانیوں کے تراجم پر مشتمل یہ مجموعہ ''انقلابی کی موت'' ان کے سندھی مجموعہ ''بہار کب آئے گی'' کی طرح قارئین میں ضرور مقبول ہوگا۔

عبدالستار بھٹی

دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی اپنی شخصیت میں تاریخ کے آثار نظر آتے ہوں۔ یہ بات خاموش کتابوں کے اوراق، جھوٹے سچے لفظوں سے سجی ہوئی تاریخ کی بابت نہیں ہے بلکہ اصل دھڑکتی ہوئی لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی زندگی کی تاریخ کے بارے میں ہے۔ یہ زندگی کی سچی سلگتی ہوئی حقیقتوں سے

نبرد آزما لمحات کی تاریخ کی سچائی ہے۔ مصافِ زندگی میں اکثر لوگ اپنے قد، اپنی فتوحات، حاصلات اور ہار جیت کے پیمانوں سے ناپتے ہیں جب کہ بعض لوگ اپنی جگمگاتی ہوئی زریں سوچ، روشن دماغی اور درونِ خانہ احساس کی ان کرنوں سے پہچانے جاتے ہیں جن کی روشنی میں انسانیت کی اعلیٰ اقدار پر یقین کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ایسے لوگ سماج کے رِستے ہوئے ناسور سے اٹھنے والی بدبو کے خلاف اعلانِ بغاوت کرتے ہیں کہ آنے والی نسلیں صحت مند فضا میں سانس لے سکیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے کہے ہوئے شبد اور باتیں لوحِ وقت کی تاریخ میں رقم ہو جاتے ہیں۔ سوبھو نام ہے ایسے ہی زندۂ جاوید شخص کا جس نے اس معاشرے کو دمکتی ہوئی صبحوں اور مہکتی ہوئی شاموں کی سوغات دینے کے لیے جن میں اس کے وطن کے لوگ آزاد انسانوں کی طرح زندگی بسر کریں، اپنی عمرِ عزیز کے کتنے ہی برس قید و بند کی نذر کر دیے ہیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ انسانیت اور سندھ سے بے پناہ محبت کرنے والے اس شخص کو ہم نے آخر کیا دیا ہے؟ ہمیں اپنے گریبان میں جھانک کر اس سوال کا جواب ضرور تلاش کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر گل بلیدی

ہاں، ہماری بینائی کمزور ہو چکی ہے، آنکھوں میں موتیابند اتر آیا ہے۔ ہمارے دلوں کو دولت کی ہوس نے زنگ آلود کر رکھا ہے۔ ہم نے سیاست کو دکان داری بنا دیا ہے اور سیاست دان کو بیوپاری دار سمجھنے لگے ہیں۔ ہم نے جھوٹے مجرموں کو اپنا قومی ہیرو بنا رکھا ہے اور سوبھو صاحب جیسے مہان، سچے، مخلص اور عالم رہنما کو پہچاننے میں ناکام رہے ہیں۔ اب سے لگ بھگ ساٹھ برس قبل ہم سب، پورا ہندوستان مذہبی جنون اور عصبیتوں کے جنون میں مبتلا تھا تو نوجوان سوبھو اس وقت بھی ہوش و حواس میں تھا۔ اس نے نصف صدی قبل جو سہانے خواب دیکھے تھے، وہ آج بھی ان خوابوں کی تعبیر سے مایوس نہیں۔ اس کا جگری دوست کیرت بابانی آدرش نگر میں بیٹھا، اب بھی اسے یاد کرتا ہے اور اسے سیکولر روحانیت اور سندھ کے صوفیوں کی علامت قرار دیتا ہے۔ میرے لیے تو سوبھو سائیں باپ سمان ہیں اور وہ بھی سورگ باشی بیٹے کنھیا لال کا سامان دیتے ہیں۔ ان کی صحت اور مسرت کے لیے ہم ہی نہیں بلکہ ان کے ارادت مندوں کا ایک وسیع حلقہ ہمیشہ دعا گو رہتا ہے۔

تصانیف

اب تک سوبھو صاحب کی چند مندرجہ ذیل کتابیں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔

(۱) ''کڏهن بهار ايندي ''—(کڈھن بھار ایندی) افسانوں کا مجموعہ

(۲) ''انقلابی کی موت''(اردو تراجم)— کہانیوں کا مجموعہ، ترجمہ و ترتیب: اسلم راحیل مرزا

(۳)''تاريخ جا وساريل ورق ''(تاریخ جاوساریل ورق)(مضامین)

(۴)''تاريخ ڳالهائي ٿي ''(تاریخ گالھائی تھی)(کالم)

(۵)''تاریخ بولتی ہے''(اردو ترجمہ)— کالموں کا مجموعہ، ترجمہ اسلم راحیل

(۶)''وڏي وٽ هنام ''(وڈی وتھ ھنام) سوانحی خاکوں کا مجموعہ

(۷)''سندھ کے انقلابی رہنما''(اردو ترجمہ)— سوانحی خاکے، اسلم راحیل

(۸)''روشني جي ڀنڊ ۾ ''(روشنی جی پندھ میں)(خودنوشت سوانح عمری)

ماہنامہ ''سوجھرو'' کراچی، اپریل ۲۰۰۲ء تا اگست ۲۰۰۵ء

ماخذات وکتابیات

۱۔ ''روشني جي ھنڌ ھر'' — خودنوشت سوانح عمری از سوبھو گیان چندانی، ماہنامہ ''سوجھرو'' ،کراچی (پینتالیس قسطیں)، مطابق اپریل ۲۰۰۲ء تا اگست ۲۰۰۵ء

۲۔ ماہنامہ ''سوجھرو'' کراچی — ''سال گرہ نمبر'' مئی ۲۰۰۵ء، ایڈیٹر/ پبلشر تاج بلوچ

۳۔ ڳڙھن بھار ايندو — (سندھی) کہانیوں کا مجموعہ

۴۔ تاريخ جا وساريل ورق — سوبھوگیان چندانی (کالم/ شذرات/ مختصر مضامین)

۵۔ تاريخ ڳالھائي ٿي — سوبھوگیان چندانی، (کالم)

۶۔ تاریخ بولتی ہے — سوبھوگیان چندانی، اردو ترجمہ اسلم راحیل مرزا، مطبوعہ نگارشات، لاہور

۷۔ انقلابی کی موت — افسانوں کے اردو تراجم از اسلم راحیل مرزا، مطبوعہ نگارشات، لاہور

۸۔ وڏي وٽ ھٿام — سوانحی خاکوں کا مجموعہ

۹۔ سندھ کے انقلابی رہنما — سوانحی خاکے، اردو ترجمہ اسلم راحیل مرزا، نگارشات، لاہور

۱۰۔ سادیہ ساچی: سوبھو — (سندھی)، مرتب کردہ نارائن بھارتی، مطبوعہ الھاس نگر، بھارت

۱۱۔ مُھين جوماھٽون — انور ڈنگرائی

۱۲۔ موہن جودڑو کا جوگی — ڈاکٹر شاہ محمد مری، مطبوعہ پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن، کوئٹہ

۱۳۔ ماہنامہ ''ساچا''

۱۴۔ آزادي کان پوءِ سنڌي افساني جي اوسر — شمس الدین عرسانی، سندھیالوجی ڈپارٹمنٹ، سندھ یونی ورسٹی، حیدرآباد

۱۵۔ ادب جوفکري پس منظر (ادب کا فکری پس منظر)، ڈاکٹر غفور میمن، لطیف چیئر، کراچی یونی ورسٹی

۱۶۔ سنڌي سماج ادب ۽ سياست ۔ انعام شیخ، سندھیکا اکیڈمی، کراچی

۱۷۔ سنڌ جا ڪالم نگار — میر نصرت حسین ابزو، اردو بازار، کراچی
۱۸۔ جي ڪا ڪ ڪکوريا ڪاہڙي۔ شیخ ایاز (مکتوبات)، نیو فیلڈس پبلی کیشن، حیدرآباد
۱۹۔ ساهيوال جيل جي ڊائري شیخ ایاز، نیو فیلڈس پبلی کیشن، حیدرآباد
۲۰۔ کراچی کے دن، کراچی کی راتیں — شیخ ایاز
۲۱۔ شیخ ایاز کے خطوط — مترجم ومرتب گرن سنگھ، فکشن ہاؤس، لاہور
۲۲۔ گفتگو: ادبی مشاہیر کے انٹرویو — (انٹرویوسو بھوگیان چندانی)، مرتبہ سید مظہر جمیل، مکتبہ دانیال، کراچی
۲۳۔ سندھ تاریخ کے آئینے میں — وی ایف آگسٹن، مکتبہ دانیال، کراچی
۲۴۔ Sindh Story (سندھ کہانی)، کیول رام ملکانی، ترجمہ تاج جویو، روشنی پبلی کیشن، حیدرآباد
۲۵۔ A Dictionary of Sindhi literature by Moti Lal Jotwani, India
۲۶۔ جدید سندھی ادب: رجحانات، میلانات، امکانات — سید مظہر جمیل، اکادمی بازیافت، کراچی
۲۷۔ ادب ۽ اديب — خودنوشت سوانح عمری، گوبند مالھی
۲۸۔ کچھ بتاتا ہوں، کچھ چھپاتا ہوں — خودنوشت سوانح عمری، کیرت بابانی، سندھ پرچار پبلی کیشن، کراچی
۲۹۔ لاڙ ڪاڻو ليڊرن جي ڌرتي، عبدالستار بھٹی، لاڑکانہ ریسرچ اکادمی، لاڑکانہ
۳۰۔ PROMOTGRS AND PRESERVERS OF SINDHYAT BY BHAGCHANDRNI MUMBAI -INDIA